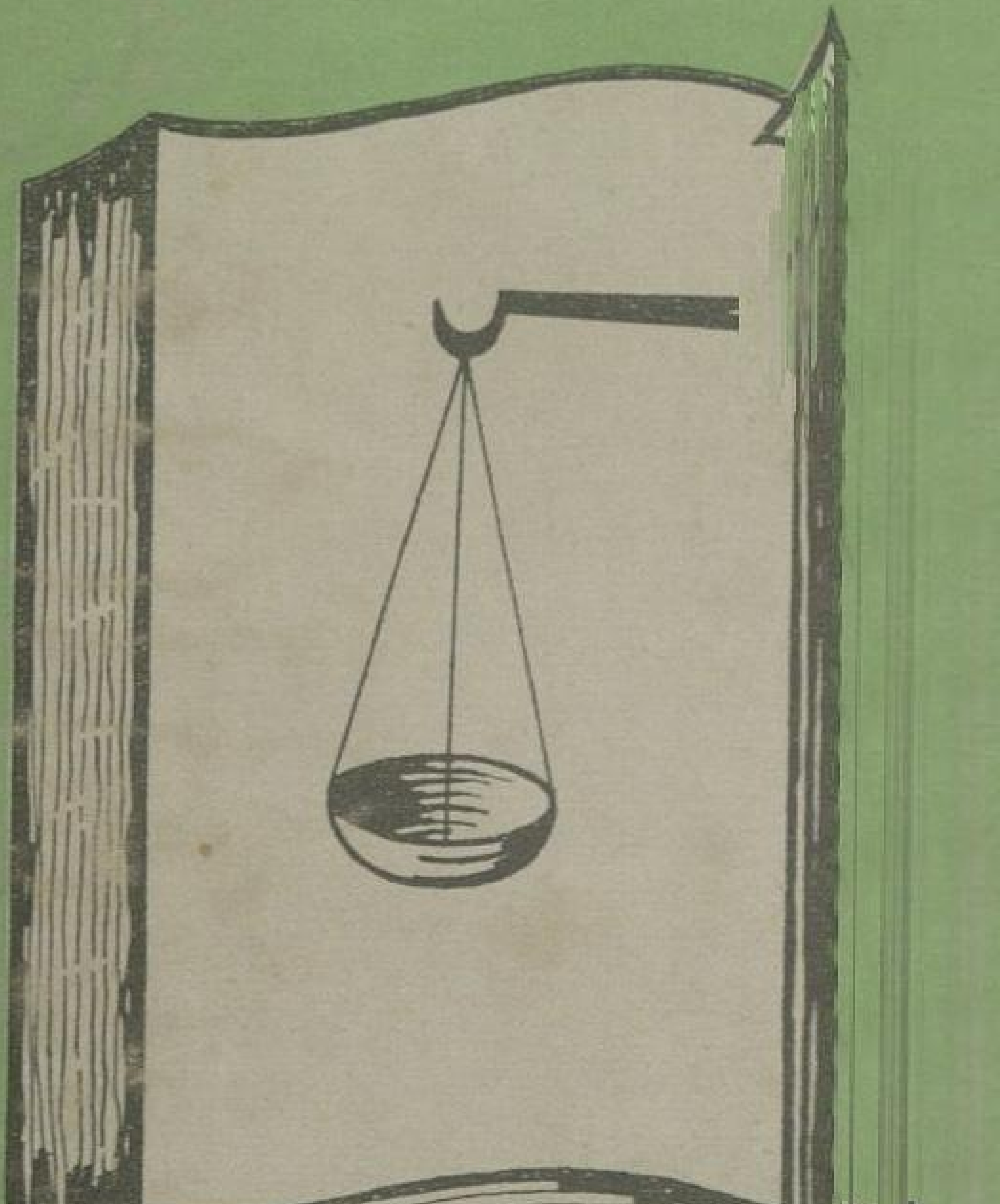
قانون اور اخلاق

مصنف
لون ایل۔ فلر

مترجم
مہدی علی صدیقی



اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

قانون اور اخلاق

از

لون ایل۔ فُلر

ترجمہ

مہدی علی صدیقی

سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج۔ کراچی

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

ییل یونیورسٹی سے باقاعدہ ترجمہ کے حقوق حاصل کیے گئے

پہلی بار ——— ۱۹۷۰ء
تعداد ——— دو ہزار
مطبوعہ ——— ملت پرنٹنگ پریس کراچی

قیمت
مبلغ ... پیسے

انتساب

جناب نواب قدیرالدین احمد صاحب

چیف جسٹس عدالت عالیہ مغربی پاکستان کی

قانونی اور علمی خدمات کو نذرانۂ عقیدت

کے طور پر یہ ترجمہ اُن کے اسمِ گرامی سے

معنون کیا جاتا ہے۔

پیش لفظ

قانون خود ایک مشکل مضمون ہے، پھر فلسفۂ قانون آسان کیسے ہو سکتا ہے۔ فلسفۂ قانون کی یہ کتاب ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لون ایل فلر کے ان لکچروں کا ترجمہ ہے جو موصوف نے ۱۹۶۰-۶۱ء میں ییل یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں دئے تھے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان ابواب کو سمجھنے کے لئے چند باتیں ذہن میں رکھی جائیں۔ مترجم کے علم کی حد تک اُردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قانون سازی کے طریقۂ کار اور مقاصد کو علیحدہ فن کی حیثیت کبھی نہیں دی گئی اور اُصول قانون کی مستند کتابوں میں بھی اس فن کے متعلق مختصر اور منتشر اشارے ہی ملتے ہیں۔ اس لئے پروفیسر فلر کے خیالات بھی کسی قدر پیچیدہ، نظریاتی اور دقیق معلوم ہوں گے۔ اس پر طُرّہ ان کا طرزِ بیان ہے جو لکچر کے لئے موزوں ہو تو ہو پڑھنے میں جدلی محسوس ہوتا ہے مگر اپنے مطلب کو جس طرح انھوں نے ظاہر کیا ہے ترجمہ میں اس کو قطعاً نظر انداز کرنا ممکن بھی نہ تھا۔ ایسی صورت میں موضوع اور مصنف دونوں کے ساتھ انصاف نہ ہو سکتا۔ پروفیسر فُلر کی تحقیق میں قانون سازی اعمالِ انسانی کے لئے ضابطہ مرتب کرنے کی بامقصد کوشش ہے۔ ان کی رائے میں یہ مقاصد عام اخلاق کے اصولوں کی پابندی ہی پر مشتمل ہیں۔ قانون بنیادی اخلاق سے کہیں زیادہ اعلیٰ اخلاقی معیار کا متقاضی ہوتا ہے اور اخلاق کی

اعلیٰ قدروں کا مظہر بھی۔ پھر ان کا کہنا ہے کہ قانون سازی کے مقاصد ہی اعلیٰ نہیں ہوتے بلکہ قانون سازی کا بھی ایک داخلی ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے۔ اِس ضابطے کے آٹھ نکتے اُنھوں نے باب دوم میں بیان کئے ہیں۔ ان کی رائے میں اگر ان آٹھ اُمور کا قانون سازی میں لحاظ نہ رکھا جائے تو قانون کا بنیادی تصور متاثر ہوتا ہے۔ تیسرے باب میں پروفیسر صاحب نے قانون کا تصور واضح کیا ہے۔ آخری باب قانون اور حصولِ انصاف سے بحث کرتا ہے۔ سب سے آخر میں جو مسئلہ پیش کیا گیا ہے وہ دراصل سب سے پہلے ہی ناظرین کے سامنے آجاتا تو اچھا تھا کیونکہ انھیں کتاب کے موضوع کو سمجھنے میں مدد مل جاتی۔ تاہم یہ مترجم کی رائے ہے جسے مصنف کی ترتیب سے اختلاف کی اجازت ہو سکتی ہے مگر بدلنے کی نہیں۔

آخر میں یہ بتلانا ضروری ہے کہ یہ ترجمہ علاء الدین خالد صاحب کے تقاضوں، اور ایک محبِ خاص کی امداد کے بغیر مکمّل نہ ہو سکتا۔ میں دونوں کا ممنون ہوں۔

مہدی علی صدیقی

ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی (علیگ)

سابق اڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کراچی

(حیدر آباد اور مغربی پاکستان جوڈیشنل سروس)

کراچی

۲۲ دسمبر ۱۹۶۹ء

فہرست مضامین

باب اول

اخلاق کی دو قسمیں

قانون کی اخلاقی بنیاد

قانون اور اخلاق میں جو باہمی تعلق ہے وہ اظہر من الشمس ہے، مگر اس کے متعلق سنجیدہ تصنیفات اسی قدر غیر اطمینان بخش اور تشنہ ہیں۔ یہی تشنگی اس تصنیف کی اصل محرک ہے۔ اِس موضوع پر جو لٹریچر موجود ہے وہ دو پہلو سے بالکل تشنہ ہے۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ اخلاق کی کوئی واضح تعریف نہیں کی جاتی، برخلاف اس کے قانون کی متعدد تعریفیں مل جائیں گی۔ چنانچہ جب قانون اور اخلاق کے تعلق اور موازنے کا سوال اُٹھتا ہے تو یہ بات فرض کر لی جاتی ہے کہ ہر شخص اخلاق کے مفہوم سے پوری طرح واقف ہے۔ طامس ریڈ پاول نے طنزاً کہا تھا کہ اگر آپ کوئی مسئلہ جس کا کسی دوسرے مسئلے سے گہرا تعلق ہو، اس تعلق کو قطعی نظر انداز کر کے "سمجھ سکتے اور پیش کر سکتے ہیں" تو پھر آپ ایک اعلیٰ قانونی دماغ رکھتے ہیں۔ اخلاق اور قانون کے تعلق کی بحث کچھ اسی نوعیت کی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ قانون داں اصحاب اپنی پوری توجہ قانون پر مرکوز کر دیتے ہیں اور اخلاق کے جزو کو جس سے قانون کا موازنہ اور تمیز مقصود ہے قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں نے اِس کتاب کے پہلے باب میں اِس خامی کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس

غرض سے میں نے وہ فرق بہت نمایاں کیا ہے جو انسان کے قانونی اخلاق[1] اور طبعی[2] اخلاق میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ قانون اور اخلاق کے مباحث میں زیادہ اُلجھن اسی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس تصنیف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر ایک اور اہم نکتہ کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ یہ نکتہ میری کتاب کے دوسرے باب کا موضوع ہے۔ اور یہ ایسی اخلاقی قدریں ہیں جن پر نظامِ قانون کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ موجودہ قانونی کتب میں اس مسئلہ کا ذکر سرسری طور پر کیا جاتا ہے اور وہ بھی یوں کہ انصاف، قانونِ نافذہ کی پابندی کا نام ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قانون کی تہہ میں اخلاق کی تلاش تو رہی ایک طرف، انصاف صرف مماثل حالات میں مماثل احکام پر مشتمل سی چیز رہ جاتا ہے، جس کا اخلاق سے گویا تعلق ہی نہیں، بس قانونی انصاف ہی سب کچھ ہے۔ یہ تصور درست نہیں۔ قانونی انصاف تو انسان کی اِس سعیِ پیہم کا، کہ کوئی منظم اور مستقل نظام قانون رائج رہے، ایک جزو ہوا کرتا ہے۔ قانونی انصاف کو اس سے چنداں بحث نہیں رہتی کہ خود نظامِ قانون میں طبعی اخلاق کا کہاں تک لحاظ رکھا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے باب میں انہی موضوعات کی زیادہ وضاحت کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں بطورِ خاص قانونی انصاف کے متعلق فلسفۂ قانون کے مختلف مکاتیب کے تصورات اور نظریات کی وضاحت ہے۔ چوتھے باب کا عنوان خود ہی مسئلے کی وضاحت کرتا ہے۔ عنوان ہے "قانون کے حقیقی مقاصد"۔ Morality of Law

---

[1] Morality of Duty قانونی اخلاق، وہ اخلاق، جسے قانون اور معاشرہ نافذ کراتا ہے۔

[2] Morality of Aspiration طبعی اخلاق: وہ اخلاق جس کا تقاضا شریف انسان کا ضمیر کرتا ہے۔

اِس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح بنیادی اخلاقی قدریں قانون کے مقاصد کو محدود اور مقید رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور آخر میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ دراصل طبعی اخلاق ہی ایسے بنیادی اصول بتلاتا ہے جنھیں قانون سازی کے قدرتی اُصول کی طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اِس مرحلے پر ضروری ہے کہ ہم اخلاقی فرائض اور طبعی اخلاق کے فرق کو خود واضح کرتے چلیں۔ یہ فرق کوئی نئی چیز نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ قانون اور اخلاق کے موازنے اور مباحث میں اس فرق کو بہت کم ملحوظ رکھا گیا ہے۔ طبعی اخلاق کی بہترین مثال ہمیں یونانی فلسفے میں ملتی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا اخلاق ہے جو آسودہ زندگی بسر کرتا ہو، اعلیٰ خیالات رکھتا ہو، اور اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھاتا ہو۔ اور پھر اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو فرض عین سمجھ کر ادا کرتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے فرائض قطعیت کا درجہ نہیں رکھتے۔ ارسطو اور افلاطون کا خیال تھا کہ انسان اپنی خواہش پر ہمیشہ پوری طرح عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ بحیثیت شہری کے یا بحیثیت عہدہ دار کے اس میں کوتاہیاں بھی ہو سکتی ہیں، لیکن یہ اس کی پہلو تہی شمار کی جاتی ہے نہ کہ ذمہ داری اور فرائض سے انکار۔ گویا وہ کام چور سمجھا جاتا نہ کہ غلط کار۔ یونانی فلسفے میں عام تصورِ گناہ اور ثواب، حقوق اور فرائض کا اتنا نمایاں نہیں ملے گا جتنا مناسب اور قابلِ تعریف طرزِ عمل یا اُس کے فقدان کا۔ ان کے ہاں معیاری عمل ایک نہایت شریف انسان کا طبعی طرزِ عمل سمجھا جاتا تھا۔

یوں سمجھ لیجئے کہ اگر طبعی یا مثالی اخلاق، اخلاق کے پیمانے کا نقطۂ عروج ہے، تو اخلاقی فرائض اسی پیمانے کے ابتدائی نقطے کا نام ہیں۔ اخلاقی یا قانونی فرائض ان بنیادی اصولوں اور قاعدوں سے عبارت ہیں جن کے بغیر ایک منظم معاشرہ ہی وجود میں نہیں آسکتا ہے، یا اگر وجود میں آ بھی جائے تو اپنے مقاصد میں کامیاب

نہیں ہو سکتا۔ پورے نظامِ قانون کو نظر میں رکھیے تو اخلاقی فرائض کی اہمیت قانونِ موسوی کے اوامرِ عشرہ[1] سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یہ ابتدائی اصولِ اخلاق جنھیں ہم قانونی اخلاقی فرائض کا نام دے رہے ہیں زیادہ تر نہی عن المنکر پر مشتمل ہوں گے نہ کہ امر بالمعروف پر۔

قانونی اخلاق چند ایسے قواعد کا نام ہو سکتا ہے جو معاشرے کے وجود کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہوں مگر ان کا طبعی اخلاق سے کیا مقابلہ جبکہ ہر رکنِ معاشرہ اپنے اعلیٰ ترین عمل اور صلاحیتوں کو اصولِ زندگی بنا لے۔ آدم اسمتھ نے اخلاقی احساسات کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ہمارے لئے مفید مطلب ہے۔ اس پر غور کرنے سے قانونی اخلاق اور طبعی اخلاق کا فرق اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا۔ آدم اسمتھ کے ہاں اس فرق کی یہ وضاحت یوں کی گئی ہے کہ اس نے " انصاف " کے اقتضا اور حسنِ اخلاق یا نیک اعمال میں بیّن فرق کیا ہے۔ اخلاقی فرائض کا تصور بڑی حد تک اقتضائے انصاف کے قریب رہتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے آدم اسمتھ نے علمِ ادب سے مثال دی ہے۔ قانونی اخلاق کو وہ زبان کے قواعد کا درجہ دیتا ہے، اور طبعی اخلاق کو اعلیٰ ترین ادبی تخلیق کے اصولوں کا۔ گویا ایک روزمرہ ہے تو دوسرا ادبِ عالیہ۔ کسی زبان کو لیجئے اس کے ابتدائی قواعد اس غرض سے وضع ہوتے ہیں کہ زبان بحیثیت ایک زبان کے باقی رہے۔ قانونی اخلاق کا بھی یہی فائدہ ہے کہ وہ معاشرہ کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھے۔ اس کے برخلاف اعلیٰ ادبی تخلیق کے اصول اور پیمانے بیشتر غیر واضح اور بڑی حد تک ذوقِ سلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور صلاحیتِ احساس اور قوتِ بیان کا اعلیٰ نمونہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور ایسے ہی کچھ مقاصد طبعی اخلاق کے پیشِ نظر ہوتے ہیں کہ انسانی عمل اعلیٰ ترین مقاصد سے

---

[1] Ten Commandments

ہم آہنگ رہے ہے۔ اب اس مرحلے پر ہمیں اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کسی معمولی انسانی عمل کو بطور مثال سامنے رکھ کر اُسے قانونی اخلاق اور طبعی اخلاق کے پیمانوں سے جانچنا چاہیے۔ مَیں نے اس غرض سے قمار بازی کا انتخاب کیا ہے۔ میرا مقصد چند پیسوں کی شوقیہ قمار بازی کی مثال سے واضح نہ ہوگا۔ میں اس معاملے میں جریمی بنتھم (Jeremy Bentham) کے شہرۂ آفاق "نظریۂ قانون سازی" سے استفادہ کر کے بڑی رقم کی قمار بازی کی مثال دوں گا۔ آئیے دیکھیں کہ قانونی اور اخلاقی فرائض کے پیمانے سے جانچ کرنے پر اونچی قمار بازی کے متعلق کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ہمیں فرض کرنا ہوگا کہ یہ مسئلہ ایک ایسے قانون ساز کے سامنے حل کے لئے پیش کیا گیا ہے جو ہر امر کو قانونی اخلاق کے پیمانے پر جانچ کر حکم لگا سکتا ہے۔ ایسا قانون ساز تو یہی کرے گا کہ وہ قمار بازی کو انسانی فائدے اور نقصان کے نقطۂ نظر سے دیکھے اور اگر اس کی رائے میں قمار بازی میں نقصانات اتنے واضح ہیں کہ وہ مفید مصروفیت نہیں سمجھی جا سکتی تو اس کی ممانعت کر دے۔ کیونکہ انسانوں کو کھُلے نقصان سے بچانا تو بہر حال قانون ساز کا اخلاقی فرض ہے۔ اس رائے پر پہنچنے کے لئے اُس کو چند بدیہی معاملات پر غور کرنا ہوگا۔ قمار بازی میں وقت اور صلاحیت کا بیجا صرفہ ہوتا ہے، لوگ اس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں جیسے کوئی نشے کا عادی ہو جائے۔ اس کے نتائج بڑے سنگین ہوتے ہیں۔ لوگ بیوی بچوں کو بھلانے لگتے ہیں اور قمار بازی کے خبط میں اپنی انفرادی ذمہ داریوں تک کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور اگر ہمارا یہ فرضی قانون ساز جریمی بنتھم کے نظریۂ افادیت سے واقف ہو تو وہ علاوہ ان قباحتوں کے قمار بازی کو مالی نقطۂ نظر سے بھی قابلِ تدارک پائے گا۔ وہ یہ سوچنے لگے گا کہ جس شخص کے پاس کل ہزار روپیہ ہوں اور وہ پانسو کی

شرط لگا بیٹھے تو یہ ایسا سودا ہوگا جسے کوئی معمولی سمجھدار انسان برابر کا سودا نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ شرط ہار جاتا ہے تو اس کی پونجی آدھی رہ گئی، اور اگر جیت گیا تو ہزار کے پندرہ سو ہی تو ہوئے۔ یہ کیا عقل کی بات ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ شرط کے دونوں فریق آپس میں رضامندی کے ساتھ ایک ایسا معاملہ کرتے ہیں جس میں حقیقی طور پر کسی کا کوئی غیر معمولی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہی کا خدشہ ہے۔ ایسے جوکھم کے ساتھ قماربازی کون سی عقلمندی ہوئی۔ ان اُمور پر غور کرنے کے بعد اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جن میں ذرا بھی فہم کا مادہ ہے وہ ایسی مصروفیات سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے اور قماربازی کی عوام کے فائدے کے پیش نظر قانوناً ممانعت ہونی چاہیے۔ یہی قرینِ عقل اور تقاضائے انصاف ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح کے اخلاقی تقاضوں کو قانون سازی سے کیا تعلق ہے۔ میرے خیال میں تعلق بالکل واضح ہے۔ اوپر کی مثال میں قماربازی کی ممانعت میں قانون نافذ کرتے وقت اس سے زیادہ اور کیا وجوہ ضروری ہیں کہ قماربازی انسان کے لئے مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ ہاں قانون ساز کو اخلاقی معیار کے علاوہ بعض اور واقعات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ مثلاً اُسے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ بعض کھیل ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں خالص قسمت آزمائی کے علاوہ انسانی مہارت اور عقل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ پھر قانون سازی کے وقت الفاظ کے انتخاب میں یہ لحاظ رکھنا ہوگا کہ عام دل چسپی کے لئے چند آنوں کی شرطوں کو عمومیت احکام سے محفوظ رکھا جائے۔ کیونکہ ایسے معمولی داؤں لگانے سے نقصان برائے نام مگر کھیل کا لطف بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگر اس طرح رعایت دینے کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملتے تو پھر قانون ساز اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور چھوٹی بڑی سب شرطوں کی ممانعت پر مشتمل حکم نافذ کرنے کے بعد یہ وکیل سرکار یا پولیس کی

صوابدید پر چھوڑنا ہوگا کہ وہ معمولی داؤں کی قماربازی کو نظر انداز کر دیا کریں۔ لیکن یہ اختیار استغاثے کے حوالے کرتے وقت اِس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ اِس اختیار کا استعمال بہت بے جا طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ ایک قانون ساز کو تو ایسی بہت سی مشکلات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے مگر بنیادی طور پر قانون سازی کی علتیں اخلاقی فرائض کے معیار کی ہی ہوتی ہیں۔

آئیے اب قماربازی کو طبعی اخلاق کے پیمانے سے ناپ کر دیکھیں۔ اِس پیمانے کو استعمال کرتے وقت یہ امر زیادہ قابلِ توجہ نہ ہوگا کہ قماربازی کے مادّی طور پر کیا کیا نقصانات ہیں، بلکہ دیکھا یہ جائے گا کہ قماربازی ایک انسان کی صلاحیتوں کا کوئی مناسب موضوع ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ انسان کی ہر تخلیقی کوشش میں کامیابی اور ناکامی کے مواقع موجود ہوتے ہیں اور ہر فن کار کو یہ جوکھم برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس کا شہکار شاید قبولِ عام حاصل نہ کر سکے لیکن اس اندیشے کو مساعی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا جاتا اور کوشش اور سعی کی لذّت بہر حال مستقل لذت ہے۔ اس کے برعکس قمارباز کے حصّے میں صرف جوکھم ہی جوکھم ہے جس میں لذتِ تخلیق نہیں اور نہ انسانی صلاحیت کا کوئی جائز مصرف۔ قمارباز تو انسان کی صلاحیتوں اور اخلاق کے اعلیٰ معیار سے مُنہ پھیر لیتا ہے اور مادّی فائدے کی خاطر بلا سعی و کاوش اور بلا استعمالِ صلاحیت ہار جیت کی کش مکش سے لذت اندوز ہونا چاہتا ہے۔ اُونچے داؤں کی قماربازی بس ایک لت بن کر رہ جاتی ہے جو انسانی صلاحیتوں کو بیکار کرتی چلی جاتی ہے۔ یہاں جنسی غیر فطری مشاغل کی مثال بے جا نہ ہوگی۔ نفسیات کے ایک محقق ایڈمنڈ برگر نے اپنی کتاب "قماربازی کی نفسیات" میں قماربازی سے متعلق ان تصانیف کی فہرست دے دی ہے جن میں دوسرے حکماء نے غیر فطری جنسی مشاغل اور قماربازی

کی مماثلت اور مشابہت سے بحثیں کی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ طبعی اخلاق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد قمار بازی کو قابلِ الزام کم، موجب حقارت زیادہ سمجھا جائے گا طبعی اخلاق کو پیشِ نظر رکھنے والے قماربازی کو ترکِ فرض نہ کہیں گے بلکہ ایک ہوشمند انسان کے لئے قابلِ شرم ضرور قرار دیں گے۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ اِس قسم کی رائے کا قانون سازی سے کیا تعلق ہے۔ جواب صاف ہے کہ کوئی براہِ راست تعلق بالکل نہیں۔ قانون سازی میں ایسی کوئی صورت پیشِ نظر نہیں رکھی جاسکتی جو انسان کو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال پر مجبور کر سکے۔ قانون کو اگر اخلاق کا کوئی معیار قائم ہی رکھنا ہے تو وہ سیدھا سادا اخلاقی فرائض کا معیار ہے، اور اسی دوسرے فائدے اور نقصان کے معیار کو سامنے رکھکر قانون ساز کو قمار بازی یا کسی اور عمل کے متعلق جائز یا ممنوع کا حکم لگانا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ طبعی اخلاق کی یہ بہت بڑی خامی ہے کہ اُسے اوامر اور نواہی کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ لیکن اس خامی کی تلافی اخلاق کی مسلّمہ قدروں کی عمومیت سے ہوجاتی ہے۔ کیونکہ قانون کا مقصدِ آخر تو یہی ہوتا ہے کہ قواعد اور ضوابط کے ذریعہ سے انسانی عمل کو قسمت آزمائی اور غیر یقینی نتائج کے دائرے سے نکال کر معین اور بامقصد نتائج کی راہ پر لے آئے۔ مثلاً جب کسی معاملے میں واقعاتی غلطی کی بنیاد پر کوئی رقم مِل جائے تو معاملات "قبل معاہدہ" کا قاعدہ پانے والے کو واپسیِ رقم کا ذمہ دار قرار دیتا ہے یا اگر متعلقہ واقعات کی بابت فریقین معاہدہ غلطی پر ہوں تو قانونِ معاہدہ کی رُو سے ایسے معاہدے کو ناقابلِ نفاذ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح سے قانونِ جنایات کے احکام ہیں۔ کوئی شخص اپنے کسی عمل کے اُن نتائج کا ذمہ دار نہیں جو اتفاقی طور پر واقع ہوں۔ لیکن اگر نتائج متوقع ہوں اور اُن نتائج کا نقصان

معیار مقررہ کے لحاظ سے متعین کیا جا سکتا ہو تو پھر مرتکب کو ذمہ دار قرار دے کر ہرجانے کا تعین کیا جائے گا۔ یہ سب ترقی یافتہ مہذب معاشرے کے قوانین ہیں، جو معاشرے کی ابتدائی حالت میں تصور میں بھی نہ آتے ہوں گے مگر اب ترقی اور تہذیب کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ غیر یقینی اور غیر مہذب نتائج سے یقینی اور اعلیٰ قدروں کی طرف ترقی کی یہ چند عمدہ مثالیں ہیں۔ پھر بھی یہ نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ انسان تو انسان ہے اور اُسے ایک خاص معیار اخلاق پر پورا اُترنے کے لئے مجبور کرنا مشکل ہے۔ کوشش بس یہی ہو سکتی ہے کہ انسانی عمل کو ضد، ناسمجھی اور بے عقلی کے تکلیف دہ اور مضرت رساں مظاہر سے پاک رکھا جائے۔ اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ لوگ سمجھداری اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ یہ چیزیں قاعدے اور قانون کی ترقی کی اس سطح پر پہنچنے کے لئے ضروری تو ہیں مگر کافی نہیں۔

اِخلاقی پیمانہ

اخلاق حسنہ متعدد اخلاقی اُصولوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یعنی اگر آپ اخلاق کا کوئی معیار پیمایش مقرر کرنا چاہیں جس طرح تھرمامیٹر سے بخار کا درجۂ حرارت معلوم کیا جاتا ہے یا طول ناپنے کے لئے فٹ رول ہوتا ہے تو ابتدائی درجات میں زندگی کے وہ چند اُصول ہوں گے جن سے معاشرہ کا قیام برقرار رہ سکتا ہے اور انتہائی ترقی کے قاعدے ایک مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کے مجموعی اخلاقی اُصولوں پر مشتمل ہوں گے۔ یوں سمجھیے کہ وہ ابتدائی قانون جن کے بغیر معاشرہ کا وجود ہی باقی نہیں رہتا، اخلاقی اسکیل کے ایک سرے پر ہوں گے تو مہذب اور مکمل ترین معاشرے کا مجموعۂ اخلاق حسنہ اسکیل کے دوسرے سرے پر۔ اس فرضی پیمانے کے بیچ میں کہیں وہ نقطہ ملے گا

جہاں اخلاقی فرائض کی حدود ختم ہوتی ہیں اور معیاری اخلاق حسنہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ کونسا مقام ہے اس کے متعلق بقدرِ توفیق ہر معاشرے میں خاموش بحث جاری ہے۔ بولتا کوئی نہیں مگر بقدرِ توفیق اور بہ لحاظِ ذوقِ سلیم ہر معاشرہ محسوس کرتا ہے کہ کہاں انسانی عمل کا محرک قانونی فرض یا اخلاقی فرض نہیں بلکہ حُسنِ اخلاق کا تقاضا ہے۔ وہ لوگ جنھیں ہم غیر ضروری اور تکلیف دہ حد تک حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرتا دیکھیں گے فرائض کے حدود کو وسیع کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ غیر ضروری اور تکلیف دہ کے الفاظ ہم نے یوں استعمال کئے ہیں کہ یہ با اخلاق لوگ اپنی دعوتِ حُسنِ عمل کو کچھ اس قدر سختی اور تلخی سے پیش کرتے ہیں گویا ایک اعلیٰ ترقی یافتہ معاشرے کی تعمیر از خود کافی محرک عمل نہیں بلکہ اغیار کا عاید کردہ فریضہ ہے جس سے خواہ مخواہ کراہت محسوس ہو۔ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ہر شخص کو یہ تجربہ ہوتا ہے کہ اُسے جیسے خلافِ طبع اخلاق سے پیش آنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور کسی شخص کی زندگی میں حُسنِ اخلاق کا درس مسلسل اِسی سختی سے دیا جاتا رہے تو ظاہر ہے کہ وہ حُسنِ اخلاق کے نام سے چڑھنے لگے گا۔

میں نے ابھی اُس نقطے کا ذکر کیا جہاں قانونی اخلاق کی حدود ختم ہو جاتی ہیں اور حسنِ اخلاق یا طبعی اخلاق کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس نقطے کے تعین میں افلاطون کے زمانے سے آج تک مفکرین اُلجھن میں گرفتار رہے ہیں۔ مگر یہ اُلجھن غیر ضروری ہے۔ میرے خیال میں سوچنا یوں چاہیے کہ انسانی عمل کو بُرا یا غلط قرار دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اچھے یا نیک عمل کے متعلق ذہن میں کوئی شبہ نہ ہو۔ ہر عمل کو جانچنے کے لئے یہ غور کرنا چاہیے کہ وہ ایک اچھی اور مکمل زندگی کے لئے کہاں تک ضروری ہے۔ جب تک ہمارے ذہنوں میں اعلیٰ اور مکمل زندگی کا واضح تصوّر نہ ہو ہم انسانی فرائض کا کوئی معیار قائم نہ کر سکیں گے نہ انسانی صلاحیتوں کے بھرپور

استعمال کے لئے کوئی صحیح راستہ معیّن کر پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اعلیٰ اور مکمل زندگی کو معیار قرار دیں گے، اُن کیلئے اعلیٰ اور معیاری اخلاقی قدروں کے سوا کسی اور قسم کے محرک اور پیمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر اِن کے لئے یہ جستجو بیکار ہوگی کہ کہاں فرائض کی حد ہے اور کہاں حسنِ اخلاق شروع ہوتا ہے۔ وہ حُسنِ اخلاق کے تقاضوں کو ہی لازم اور فرض سمجھکر پُورا کریں گے۔ اور ان کے نزدیک طبعی اخلاق ہی معیارِ عمل ٹھہرے گا۔ پس جو لوگ طبعی اخلاق یا حسنِ اخلاق ہی کو اپنے عمل کا اُصول اور معیار بنالیں انھیں تقاضائے اخلاق اور فریضے میں حد بندی کیا ضرور ہے۔

ظاہر ہے کہ جب کسی فعل کے متعلق اخلاقی نقطۂ نظر سے تنقید کی جاتی ہے تو ذہین میں اخلاقی کمال کا کوئی نہ کوئی تصور ہوتا ہے۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ تنقید کی مناسبت کے متعلق اسی اخلاقی کمال کا حوالہ دے کر متضاد باتیں کہی گئی ہیں۔ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ اخلاقی تنقید صحیح اور واقعیت پسندی پر مشتمل ہے وہ کچھ اس طرح بحث کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ کیا چیز بُری اور مضر ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اچھائی اور خوبی کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے۔ فلسفہ اخلاق دراصل اسی خوبی اور اچھائی کو تصورات اور الفاظ کی مدد سے اجاگر کرنے کا علم ہے جس کی مبادیات پہلے سے ذہنوں میں موجود ہیں۔ یہ افلاطون اور سقراط کی طرزِ فکر ہے۔ اس کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اچھائی اور خوبی کے متعلق کوئی بھی دو سوچنے والے آج تک متفق نہ ہو سکے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ اس کے عکسی تصور یعنی برائی اور بدی کے متعلق واضح اتفاق رائے پایا جائے، یہ خیال ہی خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بُرائی اور بدی دراصل سماجی عادات، رواجی معیار اور تعصّب کی پیداوار ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان مباحث میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آدمی بُرائی

اور بد اخلاقی کا کوئی صحیح تصور اُس وقت تک قائم نہیں کر سکتا جب تک اُس کے سامنے اعلیٰ اخلاق یا حُسنِ اخلاق کا مکمل تصور موجود نہ ہو۔ پر لطف بات یہ ہے کہ انسان کا روزمرہ کا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مثلاً قتل جائز نہیں ممنوع ہے۔ ایک معمولی تجربے کی بات ہے۔ مگر اس حکم کے لگاتے وقت مکمل اور مثالی زندگی کے تصور کا وجود کیا ضروری ہے۔ قتل کی ممانعت تو اظہر من الشمس ہے۔ اور صرف اس سادہ حقیقت پر مشتمل ہے کہ اگر قتل جائز فعل قرار پائے تو اخلاقِ کامل کا نمونہ پیش کرنے کے لئے بچے گا کون۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی ایک کام کو پورا کرنے کے لئے صرف ایک ہی دفعہ آلے سے مدد لینا کافی نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی ایسا بسولا نہیں جو ایک مرتبہ کے استعمال میں ٹھیک اس طرح لکڑی کی شکل نکھار دے جیسی بڑھئی چاہتا ہے۔ اس شکل کو نکھارنے کے لئے اس بسولے سے بار بار کام لے کر مطلوبہ نتیجے کے قریب آہستہ آہستہ پہنچا جاتا ہے۔ اسی طرح طبعی یا مثالی اخلاق کو واضح کرنے کے لئے ہمیں اس کے قریب اور قریب تر نا مکمل تصورات کا ذکر کئے بغیر چارہ نہیں۔ بسولہ یا ہتھوڑی اُس وقت بالکل بیکار ہو جاتی ہے، جب کوئی بہت نازک نقش اُبھارنا ہو یا بہت باریک کیل لگانی ہو۔ یا اس کے برعکس کوئی زبردست میخ نصب کرنی ہو، یا بہت بڑا مجسمہ تیار کرنا ہو اُس وقت دوسرے قسم کے آلات سے مدد لینی پڑتی ہے۔ فن کار کو حسب ضرورت مختلف آلات استعمال کرنے پڑتے ہیں، اور اسی طرح ایک ہی آلے سے وہ مختلف کام نکال سکتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ کسی آلے سے کوئی مخصوص کام نہیں لیا جا سکتا، بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے۔ گویا انسانی اعمال کی گوناگوں شکلوں پر غور کرنے سے یہ نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی عمل کو نامناسب قرار دینے کے لئے مناسب کا کوئی واضح تصور موجود ہونا چاہیئے۔ اس بات کی تشریح ایک مثال دے کر کی جا سکتی ہے۔

فرض کیجیے کہ میرا کوئی ساتھی اپنا مقصد ظاہر کئے بغیر مجھ سے ہتھوڑی یا اسی طرح کی کوئی چیز مانگتا ہے۔ ایسی صورت میں یقیناً یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرنا چاہتا ہے، مگر میں یہ تصور ضرور کر سکتا ہوں کہ کون سے آلات میرے دوست کے لئے بالکل بیکار ہوں گے اور اُسے پیچ کش یا رسّی ہرگز نہ دوں گا۔ گویا اس صورت میں مجھے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا آلہ "ناموزوں" ہے۔ گو میں "موزوں" آلے کا تعین، جو بیک جنبش میرے ساتھی کا کام پورا کردے، ہرگز نہ کر پاؤنگا۔ بالکل یہی کیفیت اخلاقی معیار اور رواج اور دستور کے قواعد کی ہوا کرتی ہے۔ یعنی ہم بلا تامل بدی اور بُرائی اور ناانصافی کے متعلق رائے قائم کرنے پر قادر ہیں خواہ ہم اسی قدر آسانی اور یقین کے ساتھ نیکی، اچھائی اور انصاف کی تعریف نہ کر سکیں۔

اِس ساری بحث کا مقصود یہ نہ سمجھا جائے کہ قانونی اخلاق اور حسنِ اخلاق یا طبعی اخلاق کے درمیان حدّ فاصل قائم کرنا کوئی آسان بات ہے۔ یہ تعین کرنا کہ کس حد پر فریضہ ختم ہوا اور حسنِ اخلاق کا اقتضا شروع ہوا، فلسفۂ اخلاق کا بڑا مشکل مقام ہے۔ اس معاملے میں صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے شخصی اندازے اور معیار کو بڑا دخل ہے۔ مختصراً یہ کہ اس معیار کے تعین میں اختلاف رائے ناگزیر ہے لیکن صحیح نتیجے پر پہنچنے کی دقت سے ہمیں مجبور نہ ہو جانا چاہیے، نہ اس سے فرار مناسب ہے۔ طبعی اخلاق اور قانونی اخلاق کی حدِ فاصل ہم اُس وقت یقیناً مقرر اور معین کر سکیں گے جب ہم اپنی بساط بھر کوشش کے بعد حسنِ اخلاق یا طبعی اخلاق کا پورا خاکہ کسی نہ کسی طرح تیار کر لیں۔ لیکن اس مقام پر پہنچکر ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مثالی اخلاق یا طبعی اخلاق کا کوئی فرضی خاکہ تیار کر کے دعوتِ عمل دینے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنی معلومات کی حد تک اُن حالات اور شرائط کی وضاحت کریں، جن کے سہارے انسان کے لئے اعلیٰ طرزِ عمل اختیار کرنا ممکن ہوتا ہے اور وہ حسنِ

اخلاق سے متصف سمجھا جاتا ہے۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قانونی اخلاق کا معاملہ انسان کی سماجی زندگی سے متعلق ہے، کیونکہ فرائض کا تعلق انسانوں کے باہمی برتاؤ سے ہے۔ اس کے برعکس طبعی اخلاق کا معیار یا تو خود انسان کا ضمیر قائم کرتا ہے یا یہ انسان اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے۔ ایک مشہور مفکر رلیمانٹ Lamont نے اپنی کتاب The value of Judgement میں جو تجزیہ پیش کیا ہے اس میں بنیادی غلطی اس کا یہ مفروضہ ہے کہ فرائض انسانوں کے باہمی تعلقات سے ہی متعلق ہوا کرتے ہیں اور طبعی اخلاق کا پیمانہ ہر شخص کا خود ساختہ ہوتا ہے، یہ دونوں باتیں صرف اس حد تک صحیح ہیں کہ فرائض سے مثالی اخلاق تک نوعیتِ عمل کے جو درجے ہیں اُن میں فریضے اور حسنِ عمل کی حدِ فاصل قائم کرنے کے لئے شخصی رجحان اور صلاحیت کار کو بڑا دخل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مثالی اخلاق کا معاشرے سے قطع نظر کر کے کوئی پیمانہ بنایا جا سکتا ہے۔ مثالی اخلاق کی مستند وضاحت ہمیں یونانی فلسفیوں کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ان فلسفیوں کے نزدیک یہ مسلّمہ تھا کہ انسان بحیثیت ایک فرد کے معیاری اعلیٰ ترین زندگی اپنے ہم جنسوں سے علیحدہ بسر نہیں کر سکتا۔ یعنی اگر کوئی فرد معاشرے کی لازمی خصوصیات یعنی زبان، فکر، ادب اور فن سے فرار اختیار کرے تو اس کی زندگی بس ایک جانور کی سی زندگی ہو گی۔ طبعی اخلاق کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ وہ معاشرے کی ان خصوصیات کو نہ صرف برقرار رکھے بلکہ انھیں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے اور ترقی دے۔

اخلاقی اصطلاحیں اور اخلاق کے دو پیمانے

اخلاقی فرائض اور اخلاقِ حسنہ یا مثالی اخلاق کے تصورات زیادہ عام اس

وجہ سے نہیں ہیں کہ بالعموم اِن اصطلاحوں کو عام بول چال میں زیادہ احتیاط کے ساتھ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ بلا خاص فرق کا لحاظ رکھے اخلاق، فریضہ، حسنِ اخلاق اور اعلیٰ اخلاق کے الفاظ استعمال ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا اصطلاحی فرق ملحوظ خاطر نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر Value Judgement کا مفہوم ہمارے ذہنوں میں "قدر کی تشخیص" تک محدود ہے۔ حالانکہ دراصل اس اصطلاح کا صحیح ترجمہ اور تصور "قدر شناسی" ہوگا جو اخلاقِ حسنہ کے تصورات میں ایک لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہے۔ لیکن جب قدر کے ساتھ آپ تشخیص کرنے یا مقرر کرنے کا تصور کرتے ہیں تو یہ اصطلاح کسی اعلیٰ معیار کے بجائے کسی ضروری فرض کے تصور سے قریب رہ جاتی ہے، اور "قدر شناسی" کے تصور کی عظمت سے محروم ہو جاتی ہے۔ الفاظ اور اصطلاحوں کو اس طرح ذہنی لاپروائی اور بے خیالی سے استعمال کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدر شناسی جیسی متعدد اصطلاحیں جن کا تعلق خالصتاً اخلاقِ حسنہ یا مثالی حسنِ کردار سے ہے، روزمرہ کی گفتگو میں معمولی انسانی فرائض کے تصور تک گر جاتی ہیں اور اخلاقی انسانی فرائض اور لوازم کو تحت شعور اور پیرایۂ گفتگو میں اخلاقِ اعلیٰ کا درجہ بخشنے لگتی ہیں اس طرح قیمت اور قدر کا بین فرق ذہنوں سے محو ہونے لگتا ہے۔ قیمت حقیقتاً ایک واقعاتی چیز ہے۔ جو لوگ قدر اور قیمت کے باہمی تعلق کی بحث کرتے ہیں، وہ اگر ان اصطلاحوں کے اخلاقی مضمرات کو ذہن نشین رکھا کریں تو خود بخود غلط تصورات اور غلط مبحث سے محفوظ رہیں گے کیونکہ قیمت کا تصور محض واقعہ کی حیثیت سے فرائض کی اصطلاح میں داخل ہے اور آپ کسی شئے کی قیمت مقرر اور ادا کرتے وقت اخلاقِ حسنہ یا مثالی اخلاق کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے کسی خیر کی قدر و منزلت اُس کے حقیقی افادے سے زیادہ آپ کی اپنی قدر افزائی پر اور حاجت

برابری کے تناسب سے زیادہ ممنونیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس نازک فرق کو ملحوظ خاطر رکھنے کے بعد غور کیجیے کہ اگر آپ کسی معاملے پر محض بطور واقعہ نظر رکھیں اور اپنی ذمّہ داری محض فرض کی حد تک محسوس کریں تو اس صورت میں یہ لازمی ہے کہ آپ اپنی ذمّہ داری کے تصور میں قانونی نقطۂ نظر سے پوری طرح متاثر نہیں۔ اغلب یہ ہے کہ بیشتر معاملات میں قانونی ذمہ داری کا گمان بھی نہ ہوتا ہوگا، مگر اس میں کیا شک ہے کہ بہر کیف قانونی ذمہ داری کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن اسی قسم کے معاملات کو اخلاق حسنہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو تصور ہی بدل جاتا ہے اور ہم افادیت کے دائرے سے نکل کر جمالیات کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ تیھر ڈھونا نہیں ہے حُسن کاری ہے۔ اس فرق کو کسی قدر وضاحت سے بیان کرنا ہوگا۔ جب ہم کسی فنّی شہہ کار کو دیکھتے اور اس کی قدر کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ جستجو ہوتی ہے کہ ہم فنکار کے اصلی مفہوم اور منشا تک پہنچ جائیں۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ فنکار آخر کیا کہنا اور کیا واضح کرنا چاہتا ہے۔ ہماری پسند اور تعریف انھیں سوالوں کے جواب پر منحصر ہوتی ہے۔ یہاں فنکار کا مطلب سمجھنے میں خود ہی قدر اور ناقدری کا پہلو مضمر ہوتا ہے یعنی اس شہہ کار کے سمجھنے ہی میں اس کی قدر مضمر ہے یا ناقدری کا ردِعمل چھپا ہوا ہوتا ہے، کسی بیرونی تصور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم اپنی رائے کے لئے کوئی بیرونی معیار ڈھونڈھتے نہیں پھرتے۔ اگر شہہ کار ہمیں پسند نہیں آتا اور ہمیں خیال ہوتا ہے کہ ہماری رائے صحیح نہیں تو ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارے پیش نظر غلط معیار تھے بلکہ ہم یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ بھئی ہم تو ان فنکار صاحب کا مفہوم اور منشا سمجھ ہی نہ سکے۔ مثال کے طور پر میں آئی اے رچرڈس کی کتاب[لے] کا حوالہ دوں گا۔ اُس کا خیال ہے کہ جب طلباء کسی ادبی شہہ کار کو اپنے مفروضہ

لے Practical Criticism — A Study of Literary Judgement.

معیار خوب و زشت سے جانچنا شروع کرتے ہیں اور مصنف کے مقصد اور منشا کو نظر انداز کر جاتے ہیں، تو ادبی تنقید بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح نارمن نیوٹن نے اپنی کتاب "An Approach to design" میں مثالوں کی مدد سے بڑی خوبی سے ثابت کیا ہے کہ جب فنِ تعمیر کے کسی نمونے کے متعلق رائے ظاہر کرنے کے لئے مناسب الفاظ دستیاب نہیں ہوتے تو دیکھنے والوں کی گفتگو سے یہ اندازہ مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ قدردانی فرما رہے ہیں یا ناقدری۔

اِن وضاحتوں سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ اخلاقِ حمیدہ کا جو معیار ہمارے ذہن میں ہے اس میں معقولیت نہیں۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جب بطور فریضے کے کسی معاملے کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے اور پھر اس رائے کے متعلق وجوہ اور اسباب بیان کرنے پڑتے ہیں تو مسئلہ نزاکت احساس سے، جو اخلاقِ حمیدہ یا طبعی اخلاق کی صحیح کسوٹی ہے، بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ اِس نظریے کی وضاحت سقراط کے خیالات سے ہو سکتی ہے۔ سقراط کو یقین تھا کہ اگر لوگ حُسنِ عمل کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف ہو جائیں تو وہ بڑی خوشی سے اور مستعدی سے اس عمل کو اختیار کر لیں گے۔ گویا ماہیت کا صحیح احساس ہی حسنِ عمل کی بنیاد ہے۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ تنقید کرنے والوں نے اس نظریہ کو ناقابلِ فہم یا بعض وقت مہمل بھی کہا ہے۔ حالانکہ یہ تنقید صحیح نہیں۔ یہ تو اسی وقت صحیح ہوتی جب سقراط کا نظریہ یہ ہوتا کہ اخلاقی فرائض کی ماہیت اور حقیقت کا احساس ہی ادائے فرض کی بنیاد ہے اور ادھر فریضے کی نوعیت سمجھ میں آئی اور اُدھر انسان اُسے ادا کرنے پر بخوشی تیار ہو گیا۔ غور کیجئے تو فریضے کی ادائی لازمی ہوتی ہے، اُس میں اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ پسندیدہ کے تصورات کا ذکر ہی کیا۔ مگر اپنی دُھن میں اور

اپنے نظریے پر پوری طرح یقین رکھتے ہوئے سقراط لوگوں سے بحث و تمحیص میں پڑا رہتا اور سمجھاتا رہتا کہ اعلیٰ اخلاقی اعمال کی ماہیت کیا ہے۔ پھر اس کو اطمینان ہو جاتا کہ عوام اُس کے اخلاق حسنہ کے معیار کو عادتاً اپنا لیں گے۔ یقیناً سقراط کی منطق یہ بھی ہو سکتی تھی کہ "دیکھو میں تمہیں اچھی زندگی کی مثالیں دیتا ہوں۔ تم ان مثالوں سے اندازہ لگاؤ کہ اعلیٰ اخلاقی قدریں کیا ہوتی ہیں۔ اور اگر تم لوگ اِن قدروں کو اپنا لوگے تو تمہاری زندگیاں بھی مثالی ہو جائیں گی۔" لیکن خود اُس کے اپنے نظریے کے لحاظ سے یہ حجّت معکوس ہوتی کیونکہ وہ تو فقط ماہیتِ عمل سے واقفیت ہی کو نیکی کی بنیاد سمجھتا تھا اور مثالیں دینا ایک غیر ضروری عمل گردانتا تھا۔ اس کے نظریہ کے لحاظ سے عاقل و دانا کی زندگی ہی اخلاق حسنہ کا نمونہ ہو سکتی ہے اور اس کا عکس ناممکن ہے۔ سقراط کے اس نظریے سے ہمارے موضوع کی ایک پیچیدگی بڑی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، اور وہ پیچیدگی یہ ہے کہ اخلاقی فرائض اور طبعی اخلاقی اعمال کے مباحث میں بیشتر ایک ہی قسم کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں اور خلطِ مبحث کا بڑا اندیشہ ہے۔ چنانچہ عام طور سے "نیکی" اور اخلاقی فرائض اور بجا آوری ہم معنی اصطلاحیں بن کر رہ گئی ہیں۔ صلاحیت، صلاحیت کا مکمل استعمال، باہمت عمل، اپنے مفاد سے زائد دوسروں کے مفاد کا خیال رکھنا جو پہلے اعلیٰ اور مثالی اخلاق کے لاینفک اجزا تھے یقیناً نیکی کے مفہوم میں داخل سمجھے جاتے تھے۔ مگر اخلاقی انحطاط کے باعث محض فرائض کی بجا آوری "نیکی" کہلانے لگی ہے۔ ع "ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا"

اسی طرح بدی اور گناہ کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ ہم ترکِ فرض کو گناہ کا درجہ دیتے ہیں، حالانکہ عیسائیت کی اصطلاح میں ذرا سی لغزش گناہ کہلاتی ہے بلکہ عیسائی مبلغوں نے تو حرص اور زناکاری کے علاوہ بقول ہیجوک

"مایوسی" اور (Outlines of History of Ethics – 1929)
"بیزاری" کو بھی گناہِ کبیرہ کی تعریف میں داخل کر رکھا تھا۔

معیارِ افادیت اور طبعی اخلاق

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ عام فہم مثالیں دینا مقصود ہو تو اگر اخلاقی فرائض کو قانون سے مطابق سمجھیں تو مثالی اخلاق یا اخلاقِ حسنہ کو جمالیاتی اقدار سے مماثلت دینی ہوگی۔ مضمون کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ ہم اخلاق کے ان دو متذکرہ اقسام کا آپس میں تعلق کسی قدر ٹھوس مثالوں کی مدد سے بھی سمجھاتے چلیں۔ یہ طریقہ ذرا نرالا تو ہوگا مگر ہم اپنی رائے اور خیالات، اقتصادی اصطلاحات استعمال کر کے زیادہ بہتر طریقے پر ذہن نشین کرا سکیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ خود ماہرینِ اقتصادیات اپنے فن کی بعض اصطلاحوں کے صحیح مفہوم اور منشا میں متفق نہیں۔ خود علم اقتصادیات کے متعلق یہ تصور ہے اور مجھے اِس سے بڑی حد تک اتفاق بھی ہے کہ اقتصادیات تمام سماجی علوم میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ شعبہ ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ ابھی دنیا کے تمام ماہر اس علم کی وسعت اور حدود پر بھی متفق نہیں۔ بیشتر اقتصادی تصانیف اس پر اکتفا کرتی ہیں کہ وہ کن معاشی مسائل اور متعلقہ سوالات کے حل پیش کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں، اور بلاشبہ یہ اقتصادی ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اِس سے زیادہ معاشیات کی کوئی واضح تعریف اِن کتابوں میں نہیں ملتی۔ مشہور ماہر اقتصادیات پال اے سیموئیلسن نے اپنی معروف کتاب "Economics, An Introduction Analysis." میں جو آج کل درسی کتب میں سب سے زیادہ مقبول ہے، ایک باب "اقتصادیات کی حدود اور انتہا" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ یہ علم صرف 'ذرائع' تک محدود ہے اور 'نتائج' سے اس کا

تعلق نہیں۔ مگر اسی کتاب کے پانچویں ایڈیشن میں یہ نامکمل بلکہ گمراہ کن تعریف حذف کر دی گئی اور مصنف نے صرف اُن چند موضوعات کی فہرست دیدی ہے جن پر اس کی تحقیقات مشتمل ہے اس کے برعکس آر۔ ایف ہیرڈ نے اپنی تصنیف "Scope and Method of Economics" میں کہا ہے کہ اقتصادیات کا علم چند معاشی نتائج کے حصول کا علم ہے اور اگر وہ مخصوص نتائج حاصل کرنا زیر بحث نہیں تو سمجھئے کہ موضوع اقتصادیات نہیں رہا۔ لیکن اس میں اختلاف کے باوجود بعض علمائے نے اقتصادیات اور معاشیات کے دائرہ عمل کو متعین کرنے کی قابلِ تعریف کوشش کی ہے۔ دیکھئے لائنل رابنسن کی کتاب "An Essay on the Nature and Significance of Economic Science" واقعہ یہ ہے کہ معاشیات اور اقتصادیات کی تعریف دو طرح سے ممکن ہے۔ ایک سادہ سی تعریف تو یہ ہے کہ علم معاشیات تبادلۂ اشیاء کے اصولوں کا علم ہے۔ دوسری تعریف یہ ہے کہ ہر شئے کی اقل ترین افادیت کا اُصول علم اقتصادیات کی بنیاد ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہمیں جو معاشی مقاصد مطلوب ہیں وہ اپنے ہی موجودہ وسائل سے کس طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں، یعنی اپنے وسائل کو ہم اقل ترین فرض کرتے ہوئے ان سے زیادہ سے زیادہ معاشی فائدے کس طرح اُٹھائے جائیں۔ ان دونوں تعریفوں کے فرق کو سمجھنے کے لئے ایک فرضی مثال عام طور پر دی جاتی ہے، اور وہ رابنسن کروسو کی کہانی ہے۔ رابنسن کروسو ایک باغی ملاح تھا جسے اُس کے جہاز کے کپتان نے ایک چھوٹے سے غیر آباد جزیرے میں چھوڑ دیا تھا اور جہاں اُسے اپنی ہی استعداد اور مشقت سے کچھ عرصے تنہا زندگی گزارنی پڑی۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصہ بعد ایک اور شخص فرائڈے نامی اپنے جہاز کے ڈوبنے کے بعد تختے کے سہارے بچ بچا کر اسی جزیرے پر آنکلا۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ جب تک فرائڈے (Friday) صاحب تشریف نہ لائے

تھے، رابنسن کس سے اشیاء اور وسائل کا تبادلہ کر سکتا۔ ہاں یہ صورت ضرور تھی کہ اُس کی ذاتی مشقت کا معاوضہ اشیائے مایحتاج کی شکل میں ملتا رہتا، تو معلوم ہوا کہ اگر معاشیات انسانوں کے درمیان تبادلۂ اشیاء کا معاملہ ہے تو رابنسن کروسو معاشی مسائل سے آزاد تھا۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ مسئلہ ہر وقت درپیش رہتا کہ جزیرے میں جو کچھ بھی معاشی وسائل کم یا زیادہ موجود تھے اُن سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ کم سے کم وقت اور محنت سے کس طرح اُٹھائے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کسی قطعۂ زمین پر کاشت کرتا ہوگا تو اُسے یقیناً یہ غور کرنا پڑا ہوگا کہ وہ ایک گھنٹے کی تخم ریزی سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکے گا، یا اگر وہ اتنا ہی وقت مچھلی پکڑنے میں صرف کرے تو نسبتاً محنت کم اور فائدہ زیادہ ہونے کی توقع ہے۔ اقتصادی اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ ایک خاصا اہم مسئلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری اپنی رائے میں اخلاق کی جو دو قسمیں بتائی گئی ہیں اُن کے فرق اور معاشیات کے بیان کردہ دونوں نظریات کے فرق میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ تبادلۂ اشیاء کا اقتصادی نظریہ بڑی حد تک اخلاقی فرائض کے معاملات اور مسائل سے مماثلت رکھتا ہے اور کم سے کم معاوضے کے بدلے اور توقع میں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی سعی اور کاوش مثالی اخلاق کی عمدہ تمثیل ہے۔ میں اس دوسرے معاملہ کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

طبعی یا مثالی اخلاق کا تعلق خالصتاً اِس کوشش سے ہے کہ اس مختصر سی زندگی کو زیادہ سے زیادہ بہتری اور نیکی میں صرف کیا جائے، اور یہ وہی اُصول ہے کہ جو معاشیات کی اصطلاح میں یوں پیش کیا جائے گا کہ کم سے کم معاشی وسائل سے زیادہ سے زیادہ اقتصادی فائدے حاصل ہوں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان دونوں اُمور کے مقاصد اور حدود دکار میں بڑی یکسانیت ہے۔ مثالی اخلاق یا اخلاقِ حمیدہ کے تصور سے

اِنسان کی انتہائی فلاح وبہبود کے تصور کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، اور اسی طرح مکمل افادیت کا تقاضا ہے کہ خریدار اپنے ایک ایک پیسے کا انتہائی معاوضہ وصول کرے۔ پھر جس طرح مثالی اخلاق کی ضمن میں انتہائی فلاح وبہبود کی اصطلاح محتاج تشریح ہے، اسی طرح مکمل افادیت کی اصطلاح معاشی مباحث میں ایک ناقابلِ تعین قدر ہے۔ گویا دونوں موضوعات میں اعلیٰ ترین قدر محسوس تو کی جاتی ہے مگر الفاظ میں بند نہیں کی جاسکتی ہے۔ اب آگے چلئے۔ اگر کوئی خریدار کتابوں کی خریداری اپنی خواہش کے مطابق کرچکا ہے کہ اب اِس مد میں مزید صرف اُس کو نفع بخش معلوم نہ ہو تو وہ اپنی رقم دوسری ضروریات پر صرف کرے گا اور اپنی رقم کو کارآمد قرار دے گا۔ گویا افادیت ایک ایسی اصطلاح ہے جو کئی ضروریات کے پُورے ہونے پر حاوی ہے اور فرداً فرداً ہر ضرورت کے پُورے ہونے سے زیادہ وسیع ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح معاشیات میں 'افادیت' ایک وسیع مگر ناقابلِ تعین مفہوم ہے اُسی طرح مثالی اخلاق کی بحث میں 'فلاح' بھی اُسی قدر وسیع مگر ناقابلِ تعین عنصر ہے۔ گویا جہاں حسب ضروریات اشیاء کی خریداری میں ایک شئے کے انتخاب کے بعد دوسری شئے کی خریداری اور پھر تیسری شئے کی خریداری کا جواز لفظ 'افادیت' سے پیش کئے بغیر چارہ نہیں رہتا اور جب یہ کہنا پڑتا ہے کہ اب ایک شئے کافی ہوگئی تو دوسری لی جارہی ہے، اور پہلی شئے پر پیسہ صرف کرنا فضول ہے" تو معلوم ہوا کہ افادیت کا تعلق کسی خاص شئے سے نہیں بلکہ اشیاء کے مجموعے سے ہے اور افادیت ایک ایسی قدر ہے جو نوعیت اشیاء سے ماورئی ہے اور چیزوں کے انتخاب پر مجبور کرتی ہے۔ بعینہ یہی اصول اخلاقیات میں بھی جلوہ گر ہے۔ آپ انسانی فلاح کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی صلاحیت کے مطابق دوسرے کے ساتھ بہتر سے بہتر عمل کرنے کے اور برتاؤ چاہنے کے خواہش مند رہتے اور سعی کرتے رہتے ہیں تاکہ انسانی فلاح کا اعلیٰ ترین مظاہرہ ہو۔ مگر اس پوری

سعی اور نتائج سعی کی کوئی تعریف ممکن نہیں۔ الّا یہ کہ آپ فلاح و بہبود کے الفاظ استعمال کرتے رہیں۔ اِن مواقع پر تخیل کار آمد مگر بیان عاجز ہے۔ اِن تقابلی وضاحتوں پر یہ اعتراض ممکن ہے کہ ماہرِ معاشیات کی توجہ واقعات کی طرف ہوتی ہے اور اخلاقی فلسفی صرف امکان اور صلاحیت سے بحث کرتا ہے۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ خریدار قوتِ خرید اور ضروریات کی بات کرتا ہے اور اُسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اصولاً اُسے کیا خریدنا چاہیے یا اُصولاً اس کی ضرورت کیا ہونی چاہیے یہ بھی صحیح ہے کہ معاشی ماہر کے لئے یہ دریافت کرنا غیر ضروری ہے کہ خریدار کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ مگر معاشی ماہر بھی اُن امور کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو انسانی ضروریات کا باعث ہوتے ہیں۔ اِس لئے معاشی مفکر کو غور کرنا پڑتا ہے کہ خریدار نے خریداری کا خیال صحیح محرکات کی بنا پر کیا ہے یا نہیں۔ مثلاً فنونِ لطیفہ کے نمونوں کی شوقیہ خریداری میں اقتصادی اصولوں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

عالمِ معاشیات کے لئے افادیت کی مکمل اور صحیح تعریف میں جو مشکلات ہیں اُنھیں دیکھتے ہوئے اور اخلاقیات میں فلاح کی تعریف کو اِن مشکلات سے بچانے کے لئے فلسفی جریمی بنتھم نے اخلاق حسنہ یا طبعی اخلاق کا معیار فلاح کی جگہ مسرت کو قرار دیا ہے، لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ ہر اخلاقی کوشش کا نتیجہ "مسرت" کو قرار دینے میں مفہوم کی وہی عمومیت اور غیر معیّن کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ہر معاشی معاملے کا معیار "افادیت" جیسی وسیع اصطلاح کو استعمال کرنے سے ہوتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اگر حُسنِ اخلاق کا مقصد "مسرت" سے کسی قدر محدود کر کے فلسفی مِل کے الفاظ میں "اطمینان" کو قرار دیا جائے تو ہم اخلاق مثالی کے یونانی تصوّر کے قریب رہتے ہیں۔ لیکن یہ سب انتہائی مقاصد والی بحث ہے۔ اخلاق اور معاشیات دونوں میں اگر فلاح اور افادیت کے انتہائی تصورات میں ہم کسی قدر ترمیم کو تیار ہوں

اور 'فلاح' اور 'افادیت' کو متوازن اور متوسط 'بہبود' اور 'نفع' تک محدود کر دیں تو یہ دونوں تصور مناسب حدود میں آجاتے ہیں اور انسانی دسترس سے باہر نہیں رہتے، یہ بات محض ایک فرسودہ خیال نہ سمجھی جائے۔ ایک متوسط الحال اور اچھے کردار کا آدمی اگر معمولاً مناسب خوبی اور خوش اخلاقی کی جگہ ہر لحظہ اور ہر دم اعلیٰ ترین اخلاق کا جگہ بے جگہ مظاہرہ کرتا رہے تو لوگ اُسے سنکی حتیٰ کہ پاگل کہنے لگیں گے۔ ظاہر سی بات ہے ہر انسانی عمل کے مختلف ملے جلے محرکات ہوتے ہیں اس لئے 'میانہ روی' فطرتِ انسانی کے لئے 'انتہا پسندی' سے زیادہ مناسب رویہ ہے۔ کسی قدر عجیب حجّت جو سینٹ تھامس اکوینس ('St. Thomas Aquinas) نے اِس باب میں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان کے کردار میں مختلف محرکات کارفرما ہوں تو وہ صرف ایک ہی نہج پر کام کرتا رہے گا اور یہ بداہتاً ناممکن ہے۔ اس کے خیال میں انسانی عمل کی تبدیلی، محرکات کی تبدیلی پر منحصر ہوتی ہے، اور آدمی محرکات کی تبدیلی پر مجبور ہی نہ ہو، اگر کوئی آخری اعلیٰ مقصد اُس کا مطمحِ نظر نہ ہوا کرے۔ اِس سلسلے میں ایک دوسرے مفکر کا نظریہ زیادہ معقول نظر آتا ہے۔ ارسطو ہمیشہ میانہ روی اور توازنِ عمل کا قائل رہا۔ یہ 'میانہ روی' کا تصور آج کل کے مروجہ 'درمیانی راہ' سے بالکل علیحدہ تصور ہے۔ آج کل جس 'درمیانی راہ' کے تصور کی تعریف کی جاتی ہے وہ تو بڑا پیش پا اُفتادہ تصور ہے۔ آجکل تو لوگ آسان عمل کے قائل ہیں جس میں اُنھیں کم سے کم ذمہ داری اُٹھانی پڑے۔ اسکے برخلاف ارسطو کی 'میانہ روی' ایک مشکل چیز تھی۔ وہ ایسے مناسب اور افراط و تفریط سے بچے ہوئے طرزِ عمل کا قائل تھا جس کا اختیار کرنا، ہر لاپروا، سہل انکار کے لئے 'تقریباً' ناممکن تھا۔ اس کے مقرر کردہ اصولوں کے لحاظ سے ہر عمل میں فہم و فراست اور احتیاط کو اس درجہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے جتنا کہ ایک کامیاب صنعت کار کو خوش انتظامی کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

اب اگر اخلاقی فرائض اور تبادلہ اشیاء کی مماثلت پر غور کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ اوپر جو بحث ہم نے کی ہے وہ تو کم معاوضہ کی توقع میں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے اصول سے متعلق تھی جو ہو بہو اخلاق حسنہ یا مثالی کردار کی بنیاد ہے۔ اس کے برعکس اخلاقی فرائض، خواہ وہ قانون نے بھی تسلیم کر رکھے ہوں یا محض رواج اور عمومی اخلاق نے، جب زیر بحث ہوں تو وہ دو ہی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ یا تو فریقین معاملت معاہدے کی شکل میں ایک دوسرے سے وعدہ کے معاوضے میں وعدہ کرتے ہیں یا کسی موجودہ خدمت کا معاوضہ آئندہ ادا کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں تبادلہ اشیاء کی مثال واضح ہے اور خدمت کا معاوضہ اخلاقی فرض کے تصور کی بنیاد پر ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ بعض اخلاقی فرائض معاوضہ کے تصور سے بے نیاز بھی ہو سکتے ہیں، یا شاید وہ سماجی فرائض ہوں جن کا معاوضہ فرد کے لئے کچھ نہیں مگر معاشرے کیلئے بہت کچھ ہوتا ہے۔ مثلاً حق رائے دہی کا ذمہ دارانہ استعمال۔ اس مثال پر غور کرتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ ووٹ ڈالنے کی ذمہ داری بہرطور بلا معاوضہ ہی عائد ہوتی ہے اور معاوضے کے جس تصور کا ابھی ذکر کیا گیا وہ زیادہ ٹھوس یا مادی نہیں۔ 'اخلاقی فرائض' اور تبادلہ اشیاء کی مماثلت کی بحث میں ایک تیسرے عنصر کا وجود بھی ضروری ہے اور وہ ہے ذمہ داری کا توازن۔ تبادلہ اشیاء میں معاوضہ کی کمی بیشی کا خیال تو بہرصورت عام ہی ہے مگر اخلاقی فرائض کے معاملے میں تو یہ توازن قدم قدم پر پیش رکھنا پڑتا ہے۔ ذمہ داری کے توازن کا یہ تصور جو اخلاقیات میں فرض کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی درس و تلقین میں بھی موجود ہوگا۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کے آخری مشہور خطبے کے الفاظ ہی کو لیجیے۔ اُن کا ارشاد ہے: "دوسروں کے معاملات میں حکم نہ لگاؤ، اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے معاملات میں دوسرے حکم نہ لگائیں، کیونکہ حکم لگانے میں تم جو اصول برتو گے جان لو کہ وہی اصول

تمہارے معاملے میں بھی برتا جائے گا۔ اور جو ناپ تول تم دوسرے کے ساتھ کروگے وہی پیمانے تمہارے لئے بھی استعمال کئے جائیں گے .... اس لئے تم خود اپنے ساتھ جس قسم کا برتاؤ پسند کرتے ہو ویسا ہی برتاؤ دوسروں کے ساتھ کیا کرو۔ یہی قانونِ الٰہی ہے۔" اسی کو شیخ سعدیؒ نے یوں کہا ہے کہ ہر چہ برخود مپسندی بہ دیگراں مپسند، اور مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا، تمہیں ناگوار ہوتا

اِس قسم کے درس ہر فلسفے اور ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں لیکن یہ درحقیقت 'اخلاق کا بدلہ اخلاق' کے اصول سے آگے نہیں بڑھتے، لیکن اس کا، جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ بھی مطلب نہیں کہ ہر فریضہ راست کسی معاملے سے ہی پیدا ہوتا ہے یا آمنے سامنے کا سودا ہے۔ دراصل یہ اصول کہ "تم جیسا برتاؤ میرے ساتھ کرنے کا وعدہ کرو بعینہٖ ویسا ہی برتاؤ میں تمہارے ساتھ کرنے کو آمادہ ہوں"۔ کوئی قابلِ فخر اور مثالی اخلاق کا اصول نہیں ہے۔ اس قسم کا وعدہ حسنِ اخلاق، معمولی اخلاقیات تو کجا بلکہ نرا محتاط اور کسی قدر خشونت آمیز معاملہ ہے۔ اگر قدم قدم پہ یہی معاملے ہوا کریں تو معاشرے کی دھجیاں بکھر جائیں۔ سنہرا اصول تو یہ ہے کہ معاشرہ باہمی روا داری کے زریں اصول پہ قائم رہے جس میں ہر عمل اور اس کا جواب تجارتی نوعیت نہیں رکھے۔ باہمی رواداری کا یہ عام تصور جس طرح بالعموم اخلاق کا جواب اخلاق سے دینے پر مشتمل ہے اِسی طرح معمولی اخلاق کے جواب میں لازماً اخلاق کے مظاہر پر بھی منطبق ہے کیونکہ کچھ نہ کچھ تو باہمی رواداری کا اصول تو بہرحال پیشِ نظر ہوتا ہے۔ جب آپ کا ضمیر کسی اخلاقی عمل کے لئے عقلی جواز تلاش کرے گا تو وہ کسی نہ کسی شکل باہمی رواداری یا امدادِ باہمی کے اصول کا سہارا لے گا۔ یہاں باہمی رواداری

کو سماجی یک جہتی کا مترادف سمجھنا بہتر ہوگا کیونکہ بغیر سماجی یک جہتی کے معاشرہ بے شیرازہ رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب آپ کسی رائے دہندہ کو حق رائے دہی استعمال کرنے پر، جب وہ ووٹنگ میں حصّہ نہ لینا چاہتا ہو آمادہ کر رہے ہوں گے تو کسی نہ کسی مرحلے پر آپ کو یہ ضرور کہنا ہوگا کہ "بھئی اگر سب لوگ تمہاری ہی طرح اِنکار کریں تو آخر حشر کیا ہوگا"۔ یہاں اعتراض ممکن ہے کہ یہ حجّت تو سماجی فرض سے متعلق ہوئی نہ کہ حسنِ معاشرت سے، مگر یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جب کسی شخص کو کسی ناگوار فریضے کی ادائی پر اُبھارا جاتا ہے تو کسی نہ کسی فائدے کی اُمید دلائے بغیر چارہ ہی نہیں رہتا۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے کہ بالآخر مجبوری کا نام صبر رکھ لیا جائے جیسے عام طور سے سیاسی اقتدار کو تسلیم کرنے میں جبر کا جو پہلو ہوتا ہے اُسے رُوسو نے معاشرتی یا عمرانی معاہدے کا دل خوش کن نام دے دیا ہے۔

باہمی رواداری کا اُصول نہ صرف ہمارے خیالات میں جاری وساری رہتا ہے، بلکہ بیشتر باہمی برتاؤ میں بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے، خواہ محسوس نہ ہو۔ اچھے عمل اور نیک برتاؤ کے وعدہ پر یا اُمید پر نیک برتاؤ کرتے رہنا بہتر اصول ضرور ہے اور کارآمد اُصول بھی، مگر اسی کے ساتھ ذہنی طور پر جو بات محفوظ رہتی ہے وہ یہ ہے کہ "جیسے ہی یہ معلوم اور محسوس ہو آپ کا ارادہ میرے ساتھ وہ برتاؤ کرنے کا نہیں ہے جیسا برتاؤ کہ آپ مجھ سے چاہتے، تو پھر میں اپنے برتاؤ میں یہ کیوں خیال رکھوں کہ آپ کا برتاؤ میرے ساتھ متوازن رہے گا۔ مجھے کیا مجبوری ہے کہ میں اپنے عمل میں آپ کی رواداری اور نیک نیتی فرض کر کے قدم اُٹھاؤں۔ جب آپ متوازن ردِ عمل کی صلاحیت سے عاری ہیں یا معاوم ہوتے ہیں تو مجھے کیا غرض ہے کہ اپنے عمل میں آپ کے احساسات اور ارادوں کا لحاظ کروں"۔ مختصراً یہ کہ اگر باہمی رواداری کا اصول انسانوں کے باہمی تعلقات میں ملحوظ نہ رہے تو آزادیٔ عمل، اور آوارگیٔ عمل میں فرق کیا رہے گا۔

ردِعمل کو معمولی اخلاقی فرض سے تعلق باقی نہ رہے گا۔ جس شخص کے جی میں جو آئے وہ کر نا درست سمجھے گا۔ نقطہ متعین نہ ہو سکے گا جب آپ کے عمل کا بدل مناسب باقی نہ رہے گا بلکہ نامناسب کی تعریف میں آجائے گا۔ توازنِ عمل کی میزان ہی قائم نہ ہو سکے گی۔ غیر متوازن ردِعمل ہی کو تو جھگڑے کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ واقعہ بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اعمال کا ردِعمل بالکل ہی ظاہر نہ ہو اور آپ کو اس کا علم بھی ہو جائے، جیسے آپ ووٹ ڈالنے جائیں گے' بکو دل! اگر یہ یقین ہو جائے کہ آپ کا ووٹ گنا ہی نہ جائے گا۔ پاکستان میں بیسک ڈیماکریسی کے ممبروں کا جب انتخاب ہوتا اور جب یہ یقین ہو جاتا کہ ووٹوں کے دلے بدل دئے جائیں گے تو کتنے شرفاء ووٹ دینے جاتے ہی نہ تھے۔ ووٹ ڈالنے کا فریضہ کوئی قانونی فریضہ یہاں تو نہ تھا' یہ تو عام اخلاقی نظام کے قیام کی طرف پہلا قدم تھا جب چند اور اشخاص کی طرف سے اس اقدام کا متوقع جواب ملنے کی توقع بندھتی تب ہی تو آدمی کا جی چاہتا کہ وہ ووٹ ڈالے یا جب کوئی شخص یہ محسوس کرانا چاہتا کہ انتخاب محض ڈھکوسلہ ہے۔ اور ووٹ گنے ہی نہیں جاتے تو وہ اس صریح بداخلاقی کا پردہ فاش کرنے کے لئے ووٹ ڈالنے جاتا، غرض عمل اور بدل عمل اور اشیاء کے تبادلے کا مماثل اصول یہاں بھی کاربند نظر آتا ہے، یہ عمل محض بیکار تو اسی وقت ہو گا جب سماج اس طرح برائی کے ظاہر ہونے پر بھی اثر نہ لے۔ گویا معاشرہ اتنا گر جائے کہ اس کی توجہ برائی کے ردِعمل کی طرف مبذول ہی نہ کرائی جا سکے۔ معاشرے کی یہ بے حسی اخلاقی فلسفیوں کی نظر میں معاشرے کی موت ہی۔ گویا وہاں حسنِ اخلاق، معمولی اخلاق، تبادلہ اخلاق، غرض کوئی اصول اخلاق باقی نہیں رہا۔ اس طویل گفتگو میں جہاں آپ کے سامنے کئی مثالیں پیش کی گئیں دراصل یہی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ ہر شخصی یا سماجی فریضے کا وجود بغیر متوقع بدل یا ردِعمل کے تصور کے ممکن ہی نہیں۔ اخلاقیات کی زبان میں اخلاقی فریضہ بلابدل

یا ردعمل کے تصور کے وجود میں نہیں ہوتا ہے

ہر عمل کے لئے ہے ردِ عمل — دہر میں نیش کا جواب ہے نیش

یہ بات اپنی جگہ صحیح ضرور ہے کہ بعض معاشرتی تعلقات بدل سے اور فرائض عائد کرنے کے تصور سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ مثلاً عاشق اور معشوق کے تعلقات' یا ایسے چھوٹے سے گروہ کے باہمی تعلقات جو کسی ہنگامی حالات کے تحت وجود میں آیا ہو۔ جیسے چند سپاہی جو دشمن کے نرغے میں محصور ہوں۔ اِن مخصوص حالات میں بدل اور بالا بدل امداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک اعلیٰ اُصول کارفرما ہوتا ہے' ایک کی بھلائی سب کی بھلائی اور سب کی بھلائی ایک کی بھلائی شمار کی جانے لگتی ہے' شخصی مفاد کا معیار باقی نہیں رہتا۔ لیکن جہاں کہیں ہر رکن معاشرہ کی سعی اور جہد کا حصہ مقرر ہوا تو فرض کا تصور پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور اُس کا معیار' یعنی متوقع بدل بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ جب رکنِ معاشرہ اپنا مقررہ فرض ادا کرے گا تو ذہن میں یہ توقع موجود ہو گی کہ اُس کے حقوق بھی ادا کئے جائیں۔ ان حقوق اور بدل کا معیار کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اُن عام اُصول اور رواج میں ملے گا جو اس معاشرے میں جاری اور ساری ہیں اور معاشرے کی تشکیل کے تانے بانے کہلائے جا سکتے ہیں۔ اگر اس طرح کے مربوط معاشرے کے وہ اصول اور رواج جو اخلاقی بنیادوں پر بدل کو لازم کرتے ہیں مسلسل توڑے جانے لگیں تو ظاہر ہے کہ ہر فرد اور رکنِ معاشرہ اُن اخلاقی فرائض اور اُصولی قیود سے آزاد ہو جائے گا جن کی بنیاد پر معاشرہ قائم ہوا تھا اور جن کی خلاف ورزی سے اِس معاشرے کے تار پود ہی بکھر جائیں گے۔

اِس پوری بحث میں ایک نہایت اہم مفروضہ ہر لحظہ ذہن میں موجود ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ایک غیر محسوس طریقے سے دوسرے فرد سے تعاون کے لئے آمادہ اور متقاضی رہتا اور اسی آمادگی کی بنیاد پر وہ غیر شعوری طریقے

سے وہی رواج، قاعدے اور عمل اختیار کرتا ہے جو بطور ایک مربوط اور متداول نظام کے معاشرے میں جاری و ساری ہیں۔ یہ کیفیت معمولی معاشی ادل بدل کے قاعدے سے بظاہر بہت دُور نظر آتی ہے، مگر یہ خیال رکھنا چاہیے کہ روزمرہ کا معمولی اخلاقی عمل اور جوابی عمل بھی تو خریداری کے لین دین اور تجارتی پہلو سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، مثلاً اگر دو آدمی یہ طے کرلیں کہ وہ کسی خیراتی کام میں برابر کے حصّہ دار ہونگے تو اس میں ادل بدل کی معاملت کی کیفیت اور خصوصاً معاشی معاوضہ کی وجہ تحریک ہی موجود نہ ہوگی۔ لیکن اس واقعے میں بھی کسی قدر معاشی توازن، اخلاقی ذمہ داری کی شکل میں کارفرما ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر خیراتی فنڈ کو کوئی قانونی گرفت حاصل نہ ہو گئی ہو (جیسے وصیت نامے میں تذکرے سے ہو جاتی ہے) تو اگر ایک فریق چندہ دینے سے مکر جائے تو دوسرے کے لئے مکرنا جائز ہو جائے گا اور کوئی اعتراض ممکن نہ ہوگا۔ اِس مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ معاشرتی تعلقات اور باہمی رواداری کی گرفت دونوں فریقوں پر اسی طرح مؤثر تھی جس طرح سماج میں رسم و رواج، دستور، طریقہ، خوش سلیقگی یا ہم چشمی جیسی اخلاقی پابندیاں جو بظاہر نظر نہ آئیں مگر مؤثر ہوتی ہیں۔

اب آگے چلیے اور غور کیجیے کہ جس طرح فرض یا ذمہ داری باہمی رواداری توازنِ عمل کے تقاضے سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح رواداری اور توازنِ عمل کے مختلف درجے بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بعض مواقع پر تو ذمہ داری کا احساس کہ ہم بھی کچھ کریں بلا کسی غور و خوض کے بدیہی طور پر پیدا ہو جاتا ہے، لیکن بعض مواقع ایسے بھی ہو سکتے ہیں جب اسی قسم کی جوابی ذمہ داریاں معاشرے کے طریقوں اور رواج کی وجہ سے ہی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ ذمہ داریاں قانونی ہوں یا اخلاقی کبھی دو فریقوں کے درمیان راست معاملت کے مثل ہوتی ہیں اور بعض اوقات رسم اور رواج

کی بنیاد پر پیدا تو ہوتی ہیں مگر ان کا احساس راست معاملت کی طرح نہیں ہوتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن حالات میں یہ اخلاقی یا قانونی ذمہ داریاں راست اور لازمی سمجھی جاتی ہیں۔ ہر جوابی ذمہ داری اخلاقی فرض کی کیفیت اختیار تو کر لیتی ہے مگر اسی صورت میں جب اس میں تین کیفیتیں پائی جائیں۔ اگر یہ تین شرطیں نہ ہوں تو پھر فریضے کی کیفیت موجود تو ہوگی مگر اتنی لازمی نہ گردانی جائے گی جتنی ان شرائط کی موجودگی میں گردانی جاتی۔ گویا فریضے کو اگر فریضہ سمجھنا ہے تو اُس میں حسب ذیل تین شرطیں موجود ہوں گی۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ اخلاقی یا قانونی ذمہ داری اُس وقت فرض کی کیفیت اختیار کر لیتی ہے جبکہ باہمی معاملہ فریقین کی رضامندی اور اتفاق رائے سے وجود میں آیا ہو اور ان میں راست معاملت ہوئی ہو۔ گویا دونوں نے ذمہ داریاں بخوشی پیدا اور قبول کی ہوں۔

فرض اور فریضے کے پیدا ہونے کی اور ذمہ داری کے مکمل ہونے کی دوسری شرط، ذمہ داریوں یا فرائض کی مساوات ہے۔ فریقین اپنی اپنی ذمہ داری کی جو بھی قدریں ذہن میں مقرر کرتے ہوں وہ برابر برابر ہونی چاہئیں ورنہ ناانصافی، مجبوری، حتیٰ کہ بدمعاملگی کا بھی احساس پیدا ہونا تعجب خیز نہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ باہمی رضامندی میں بڑی حد تک ہم قدری کا تصور مضمر ہوتا ہے مگر واقعی ہم قدری سے معاملت کی پختگی اور قلب کے اطمینان کی کیفیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہ غلط فہمی بہرطور نہ رہنی چاہیے کہ بدل بالکل ایک ہی شکل میں ہو۔ مثلاً اگر میں نے اور آپ نے ایک ایک روپیہ یا ایک ہی تصنیف کے دو۲ نسخے بدل لئے تو یہ ہم قدری تو ضرور ہوئی مگر اس معاملت میں ذمہ داری اور فریضے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوا۔ تبادلۂ اشیاء جیسی کیفیت تو پیدا ہی اُس وقت ہوگی جب اشیاء مختلف ہوں ایک ہی نہ ہوں۔ چیزوں کی قدر

اور قیمت کا لحاظ کرنے سے ہی تو معاملت میں بدل کے برابر ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ قدر کا برابر مگر اشیاء کا مختلف ہونا ہی تو معاملت کی بنیادی خصوصیت ہے۔

تیسری خصوصیت جو معاملت یا فریضے کو مستقل قدر بخشتی ہے وہ اس کا امکان ہے کہ فریقین معاملت کی حیثیت بدلتی بھی رہے گی۔ یعنی آج کا خریدار کل کا بیچنے والا بھی ہو سکتا ہے۔ آج آپ جو زیور اپنی ہونے والی بہو کے لئے دے آئے ہیں کل اسی طرح ہونے والے خسر کو اپنے داماد کے لئے کچھ نہ کچھ دینا ہوگا۔ گویا حق اور فرض، خواہ وہ کسی شخص کی تحریک پر ظہور میں آئیں فرض اور حق میں بدل بھی سکتے ہیں۔ آج کا ذمہ دار کل کا حقدار اور آج کا حقدار کل کا ذمہ دار بھی ہو۔ اگر معاملت اور انسانی تعلقات میں یہ خصوصیت نہ ہو تو پھر روسو کا یہ قول صادق آئے گا "کیا وجہ ہے کہ میں جو میں ہوں اور کبھی تم نہ ہوں گا، عمل اس طرح کروں گویا میں تم ہوں اور کل کو تم میرے ساتھ وہی عمل کر سکو گے۔" یہ مثل روسو کی کتاب Emile سے لی گئی ہے۔ ایک اور مقنن Justice ، نے اپنی تصنیف "Dal Vecchio" میں دوسرا نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ روسو تو خیر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ فریضے کی ادائی کسی آئندہ مفاد کے خیال سے نہیں کی جاتی۔ اس کے برعکس ڈل ویچیو انصاف کے تصور میں 'بدل' کے خیال کو لازمی سمجھتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ محض سوال کرنے میں اور حق طلب کرنے میں فرق یہی ہے کہ مؤخر الذکر صورت میں ذمہ داری کے بدل جانے کا امکان پیش نظر رکھ کر فریقین میں دادرسی کی تجویز کی جا سکتی ہے۔ ہماری اُوپر گنائی ہوئی شرطوں میں یہ تیسری شرط ہے۔ مگر یہ تنہا 'فرض اور ذمہ داری کی تعریف کے لئے کافی نہیں۔ فرض کیجیے کہ فریقین میں جو تعلق حق اور ذمہ داری کا ہے وہ بدلا ہی نہ جا سکے۔ یعنی غلام غلام ہی رہے اور

آقا، آقا ہی۔ اُس وقت غلام کو یہ سمجھانا کہ اگر تم آقا ہوتے تو اپنے موجودہ آقا پر وہی ذمہ داری ڈال سکتے تھے جو اب تم پر آپڑی ہے، ایک ایسا تصور ہے جو نظریاتی طور پر صحیح ہے مگر تشفی بخش بالکل نہیں۔ اور تشفی انصاف رسانی کا لازمی جزو ہے۔

غرض "فرض" کا مکمل احساس پیدا ہونے کے لئے اُن تین شرطوں کا وجود جن کا ذکر ہوا ازحد ضروری ہے۔ یہ تینوں شرائط اخلاقی فرض کو با مقصد بھی بناتی ہیں اور گوارا بھی۔ معاشی مثالوں سے وضاحت ہی برکت ہے کہ ذمہ دار تاجروں میں آپس کی معاملت میں اخلاقی فرض کی متذکرہ تینوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تاجر آپس میں راست اور اپنی مرضی کے مطابق معاملے کرتے ہیں۔ پھر بدل کا مساوی ہونا بھی آزاد تجارت کے بازار میں بہ آسانی طے ہو سکتا ہے بمعاملہ کھُلا ہو اور اشتراکی بازاری قیود سے آزاد ہو، ہر تاجر اپنی جنس کی قدر و قیمت سمجھ بوجھ کر فریقِ مقابل سے سودا طے کرتا ہے۔ اِس طرح مختلف اجناس کے تبادلہ کی قدر کا معیار قائم ہو جاتا ہے۔ اگر اس طرح کا معیار مقرر نہ ہو تو بدل کا مساوی ہونا نرا خیال ہی خیال رہ جائے۔ تاجروں ہی کی جماعت ہے جس میں خریدار بعد کو بائع بھی ہوتا ہے اور بائع خریدار۔ ذمہ داری اِس طرح کندھے بدلتی رہتی ہے، اور یہ محض تصور ہی تصور نہیں بلکہ ٹھوس شکلوں میں بائع کا کبھی مشتری ہونا اور مشتری کا کبھی بائع ہونا ذمہ داری کی تبدیلی کی ایسی مثال ہے جو تاجروں کے علاوہ اور گروہوں میں کم از کم اس درجے میں نہیں پائی جاتی یعنی ذمہ داری کے احساس کی یہ کیفیت اُن فرائض اور حقوق میں ممکن نہیں، جہاں معاملت کے فریقین، والدین اور اولاد، میاں بیوی، یا شہری اور حکومت ہوں۔ ایک ماہرِ قانون ہائیک (Hayek) کی رائے میں قانون کی حرمت تو وہیں قائم ہوتی اور باقی رہتی ہے جہاں قانون ساز جماعت، جو قانون کے ذریعہ فرائض اور حقوق مقرر ہوتی ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کہ کل اُسے خود ہی قانون کی پابندی میں اپنے حقوق

فرائض کا تعین کرنا ہوگا جب مقننہ اِس چکر میں پڑ گئی کہ اُس کے اراکین خود اپنے مفادات کس طرح محفوظ رکھیں وہاں نہ صحیح قانون بنے گا نہ اُس کا نفاذ بے لوثی سے ہوگا اور قانون کی حرمت اور بالا دستی متاثر ہو کر معاشرے کو سخت نقصان پہنچائے گی۔ اس کی بڑی عمدہ مثال یہ ہے کہ جب بیسک ڈیماکریسی کو رکھنے یا باقی نہ رکھنے کا سوال ایسی مقننہ کے سامنے رکھا جائے جو بیسک ڈیماکریٹوں کے ووٹ سے منتخب ہوئی اور ہو سکتی تھی تو اس کی کیا گنجائش تھی کہ مقننہ بخوشی اس نظام کو ختم کر کے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار لے۔ اِسی لئے حکومت کو مجبور کرنے کے لئے کہ وہ اس جبری انتخابی نظام کو بدلے، ساری سعی و کوشش پارلیمان سے باہر کرنی پڑی اور یہ مہم سر ہوگئی۔ دوسرے امور مثلاً ایک یونٹ توڑنا، یا آبادی کی بنیاد پر نمائندگی، آئندہ انتخاب سے قبل عوامی لیڈروں کے اتفاق رائے سے یا آزاد، بلا توسط انتخاب کے ذریعہ منتخب شدہ نمائندوں کی کثرت رائے سے طے ہو سکتے ہیں اور ان میں وہ بنیادی پیچیدگی موجود نہیں جو خود بیسک ڈیماکریسی سے منتخب نمائندوں کے ذریعہ سے انھیں کا گلا کاٹنے میں پیدا ہونے کا قوی اندیشہ تھا۔ اسی قسم کے خیالات کے اثر سے ہائیاک کی یہ قطعی رائے قائم ہوئی کہ اُسی معاشرے میں جو آزاد تجارتی اصول پر معاملات کا عادی اور آزادی سے خیالات اور آراء کے قیام کا جویا ہو، قانون کی بالا دستی اور حرمت قائم رہ سکتی ہے ورنہ معاشرے کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قانون کو بالا دستی کے قیام کے لئے ایسے معاشرے کی ضرورت ہے، جو آزاد تجارت، ذمہ داری کی ایک فریق سے دوسرے فریق پر تبدیلی، اور اقدار کے معیار میں ضمیر کی آزادی اور رائے کی حرمت کا قائل ہو۔ یہ آزاد جمہوری، اور ایک حد تک سرمایہ داری کے اصولوں کے پابند معاشرے میں ہی ممکن ہے! وہاں قانون بھی آزاد جمہوری مساویانہ برتاؤ کے تصورات کی بنیادوں پر منفقہ مرضی اور مساوی ذمہ داری اور حقوق کے اصولوں پر بنتا ہے، اشتراکی فلسفیوں میں صرف پاشوکانس Pashukanis نے قانون کے ان معاشرتی تقاضوں سے اتفاق نہیں کیا تھا

ہماری رائے میں اشتراکی معاشرت میں قانون سازی کے تصور کی صحیح بنیاد صرف پاشوکانس کے نظریات میں ملتی ہے۔ پاشوکانس کے اس نظریۂ قانون کو "فلسفۂ قانون بر بنیادِ تبادلۂ اشیاء" کا نام دیا گیا تھا مگر ہمارے خیال میں پاشوکانس کے نظریہ کو "فلسفۂ مساواتِ حقوق و فرائض" کا نام دینا صحیح ہوگا۔ مگر غور کیجئے تو پاشوکانس کے فلسفے میں دو ہی بنیادی تخیل ہیں اور دونوں کارل مارکس کے رہینِ منت۔ پہلا تخیل تو یہ کہ معاشرہ کی تشکیل میں معاشی پہلو کی بالادستی ناقابلِ انکار ہے۔ قانونی اور اخلاقی اصول ہوں یا ادارے صرف اقتصادی بنیادوں پر بنائی ہوئی تعمیریں ہیں جو اپنی بنیاد سے علیٰحدہ نہیں سمجھی جا سکتی ہیں، دوسرا تصور یہ کہ جب اقتصادی اور معاشی بنیاد پر معاشرے کا یہ ڈھانچہ تیار اور مضبوط ہو کر مکمل نظام کی شکل اختیار کر لے گا تو نہ حکومت کی ضرورت ہوگی نہ علیٰحدہ قانون کی۔ وسائل پیداوار اور تقسیم پیداوار کا عمل ایک خود کار غیر ارادی عمل ہو کر قائم رہے گا اس نظریہ کی وضاحت کسی قدر سادہ سی ہے۔ پاشوکانس کا کہنا تھا کہ سرمایہ داری نظام میں ہی ہر چیز کا بدل مقرر ہوتا ہے یا کر لیا جاتا ہے، ایسے نظام کے قانونی اور سیاسی اداروں کی بھی یہی کیفیت ہوگی کہ اُن میں سودے بازی کا تصور موجود ہوگا۔ اسی لئے سرمایہ داری نظام کے تحت قانونِ تعزیرات میں جرم اور اس کے بدلے سزا کا ایک پورا نقشہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ گویا بدعملی کا کفارہ ادا کرنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ پھر اگر نظام سرمایہ داری کے نجی قانون پر غور کیجیے تو ایک حقدار ہوگا تو دوسرا ذمہ دار۔ یہ دونوں اپنے مناقشات طے کرانا چاہیں گے۔ دونوں باہمی رضامندی سے یہ کام تیسرے شخص سے کرا لیتے ہیں۔ لین دین غرض سرمایہ داری کی جان ہے اور قانونی اور سیاسی اداروں میں جاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس اشتراکی نظام میں دولت یا مال کی مساوی تقسیم کا عمل جاری رہتا ہے۔ نہ کوئی حقدار ہے نہ ذمہ دار۔ پورا معاشرہ دولت یا اشیاءِ ضروری پیدا کرتا ہے اور تقسیم کر لیتا ہے زیادہ لینے کا سوال ہی نہیں نہ ضرورت سے زیادہ حق نہ کسی دوسرے کے حصے

کا غصب، نہ اُن کی واپسی کی ذمہ داری۔ اس لیے اشتراکی معاشرے میں قانونی حقوق اور ذمہ داریوں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کسی قسم کی حجت نظامِ اخلاق کے معاملے میں کی جاتی تھی جب اشتراکیت کی بنیاد پر معاشرہ مرتب اور منظم ہو جائے تو کسی پیمانۂ اخلاق کا کیا سوال ہے۔ فرض کا لفظ بے معنی ہو جائے گا۔ اب اُس ایک طرفہ نظریے کو جرمن فلسفی کانٹ کے خیالات کی روشنی میں دیکھیے۔ کانٹ کا بنیادی تصور یہ تھا کہ دوسرے انسان کا وجود ہمارا کوئی ذریعہ یا آلۂ کار نہیں بلکہ ایک مستقل حقدار وجود ہے جو حقوق ہمیں حاصل ہیں ٹھیک اِسی طرح اُس دوسرے انسان کو بھی حاصل ہیں۔ اِس کے مقابلے میں پاشوکانس دوسرے انسان کے وجود کو متقابل حقوق اور فرائض کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ یہ دوسرا شخص صرف اسی حد تک ہمیں اپنا آلۂ کار بنا سکتا ہے جتنا وہ ہمارا آلۂ کار بننے کو تیار ہو۔ اُس کے خیال میں بدل کا تصور چاہے وہ راست عمل پیرا ہو یا غیر ظاہر طور پر ہر انسان کو دو حیثیت میں پیش کرتا ہے اپنی حد تک وہ ایک مستقل ہے مگر دوسرے کے لئے ایک آلہ تبادلہ۔ پاشوکانس کی رائے میں جب دولت کی پیدا کرنے کی خاص ضرورت نہ رہے گی اور ملک کی ہر قسم کی پیداوار ہر ملکی کو برابر پہنچتی نہ رہے گی تو حکومت کی ضرورت رہے گی نہ کوئی حق نہ فریضہ۔ لطف یہ ہے کہ پاشوکانس کے یہ اصول اسٹالین کے عہد میں جب حکومت قائم تھی بلکہ سخت گیر تھی، کیونکر مقبول ہو سکتے تھے۔ اِس کے باوجود کہ پاشوکانس کے نظریے کی بنیادیں اشتراکیت کے اولین مبلغین کے خیالات پر قائم تھیں اسٹالین نے پاشوکانس کو ۱۹۳۷ء میں ختم کروا دیا۔ غور کیجیے تو پاشوکانس کے خیالات خود مارکس کے فلسفے سے ماخوذ تھے جو حکومت کو نہ صرف پیدائش اور تقسیم دولت کیلئے ضروری کہتا تھا اور پھر بعد میں اس کے قابل حذف ہونے کا قائل تھا۔ ایسی صورت میں کسی قانون کے وجود کا بھی کیا سوال تھا۔ مارکس کی زندگی جس طرح فلاکت اور اہلِ دولت کے خلاف

بغاوت میں گزری اُس کا تقاضا یہی تھا کہ "مردم بےزاری" اُس کے تحت شعور میں سرایت کر گئی تھی۔ مارکس کو اس تصور سے خلقی طور پر نفرت تھی کہ ایک انسان دوسرے انسان کا آلۂ کار بنے اور جس نظریے یا فلسفے میں اُسے اس کی جھلک نظر آتی وہ اسکی مخالفت کرتا۔ حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ جب تک باہمی رواداری اور متبادل ذمّہ داری کا احساس نہ ہو، دو انسانوں کے تعلقات تو کجا ایک منظم معاشرے کا وجود بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ یہی تحت الشعور جذبہ تھا جس کی وجہ سے مارکس نے تمام عمر تقسیم کار کے اصول کی مخالفت کی۔ حالانکہ مارکس جیسے ذہین آدمی کو محسوس کر لینا چاہیے تھا کہ جس قدر دولت کی پیدائش کے طریقے ہیں اُن کے پُوری صلاحیت سے پیدا آور ہونے کے لئے فرائض کی تقسیم کر کے ماہرانہ صلاحیت کی شدید ضرورت ہو گی تاکہ معاشرہ خود مکتفی ہو سکے۔ ایک دوسرے کی امداد کا سہارا بھی مارکس کے نزدیک ایک قابل نفرت تصور تھا۔ اس نفرت کا اظہار مارکس کے اس مشہور مقولے سے ہوتا ہے کہ "ایک سرمایہ دارانہ معاشرت میں انسان دوسرے انسان کو آلۂ کار بناتا ہے، پھر اسی نظام کی بدولت وہ دوسروں کا آلۂ کار بنتا ہے اور پھر یہ سب مل کر سرمایہ دار کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

مگر کارل مارکس کا فلسفہ ہی تو سب کچھ نہیں۔ ذرا اس کا مقابلہ فلپ وکیسٹیڈ (Philip Wickstead) کی تحقیقات سے کیجئے جو پہلے ایک موحد پادری تھا اور پھر ماہر اقتصادیات ہو گیا۔ وکیسٹیڈ کا قول ہے کہ "جہاں کہیں باہمی رواداری اور متقابل وعدوں کے ایفاء کا سوال ہے، حصولِ مقصد کا زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ فریق مقابل کی فوری اور شدید ضرورت کو جلد سے جلد رفع کر دیا جائے۔ یہ طریقہ اپنے مقصد کے حصول کا بالواسطہ طریقہ ضرور ہے مگر اخلاقی دباؤ کے طور پر بے حد مؤثر بھی ...... انسانوں کو معاملات میں ایک دوسرے سے پختہ وعدے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ جن سے ہم معاملہ کرتا ہے وہ اپنے مقصد کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں جیسے

کہ ہم اپنے مقصد کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں حق بجانب ہیں۔ گویا جس طرح ہم آپ ان کے مقصد کو ثانوی اہمیت دیتے ہیں، اسی طرح وہ بھی ہماری ضرورت کو بجا طور پر ثانوی اہمیت دیتے ہوں گے ...... اس لئے اگر ہم باہمی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دوسرے شخص کی ضرورت کو ترجیح دے کر اپنا مطلب نکالیں تو یہ کوئی قابلِ نفرت یا رکیک بات نہیں .... اِن واقعات کی روشنی میں متقابل وعدوں یا باہمی معاملت کا رشتہ اور رابطۂ انسانی تعلقات کے دائرے اور کاربرآری کے ذریعوں کو وسعت اور پختگی بخشتا ہے۔ گویا جن گروہوں کے پاس خاص مہارت اور ذرائع اور وسائل کاربرآری موجود ہیں، دوسرے گروہ سے جسے مہارت اور آلات پر قابو نہیں مگر خام مال اور سرمایہ پر ہے، گوناگوں تعلقات پیدا کر سکتا ہے، اس طرح معاشرے میں ہم آہنگی اور یگانگت ہوگی اور کارکردگی اس وجہ سے رُک نہ جائے گی کہ مہارت کار اور وسائل پیدا وار ایک ہی جگہ مجتمع نہ ہو سکے۔"

اگر کسی طرح زمانہ کی رفتار اُلٹی جا سکتی اور مارکس کے سامنے یہ خیالات اس طرح پیش کئے جاتے ہیں جس طرح ویکسٹیڈ نے لکھے ہیں اور وہ اُن کے مطالب اور مفہوم کو سمجھ گیا ہوتا تو شاید تاریخ کا دھارا اس طرح نہ بہتا ہوتا جس طرح آج بہتا ہے۔

اخلاقی معیار کا تعیّن

اخلاقی اور اقتصادی پیمانوں کو ہم نے ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ کر کچھ تصورات واضح کئے ہیں۔ اب اس تشبیہ سے کچھ اور بھی فائدہ اُٹھانا مقصود ہے۔ ہم نے اوپر یہ بیان کیا ہے کہ اخلاق کا معمولی سے معمولی تصور وہ ہے جو معاشرے کو ایک منظم حیثیت سے باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے، اور اُس کے مقابلے میں اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ یا حسنِ اخلاق کا وہ تصور ہے

جو ایک اعلیٰ تر اخلاق والے انسان میں پایا جاتا ہے جب وہ اپنے اوصاف اور صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے۔ ان دونوں تصورات کو درجہ بندی کے پست ترین اور بلند ترین درجے مان لیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ فرائض اور اخلاق حسنہ یا مثالی اخلاق میں کیا رشتہ ہے۔ درمیانی درجے موجود ضرور ہیں اور ہونے بھی چاہئیں، مگر ان کا تعین اور خصوصاً ان کے نام مقرر کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ تو بہر صورت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ فرائض اور حسنِ اخلاق کی ذمہ داریوں کے بیچ میں ایک خطِ فاصل ضرور ہے۔ اگر انسانی فرائض کی حدود وسیع کی جائیں اور ان کی بجا آوری میں جبر اور تعدی سے کام لیا جائے تو لزوم کا احساس، تجربات کی خواہش، تخلیقی تحریک اور انسانی دماغ کی اُپج کے حق میں سم قاتل ثابت ہوگا۔ اگر کوئی کام لامحالہ بہ جبر و اکراہ کرنا ضروری ہی ہے تو پھر اس میں اطمینانِ قلب اور حصولِ مسرت کا امکان برائے نام ہی باقی رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اخلاقِ حسنہ کے تقاضے اتنے ضروری گردانے جائیں کہ جیسے فرائض ہوتے ہیں تو لوگ اخلاقِ حسنہ کا معیار اپنی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کرنے پر مجبور ہوں گے تاکہ شدت میں کمی محسوس ہو۔ انسانی اوصاف اور صلاحیتوں کے پورے استعمال کو جو اخلاقِ حسنہ کے اجزا ہیں مبالغے کی حد تک بڑھانے سے نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ اپنی شاعرانہ صلاحیت یا اعلیٰ معیار مہمانداری کو اجاگر کرنے کے لئے آدمی اہل و عیال کے فرائض ترک کرکے بس شاعری کے پیچھے پڑا رہے، یا مہمانداری میں گھر بار لٹا دے۔ کچھ اسی قسم کا تعلق معاشی مسائل، تبادلۂ اشیاء اور اقل ترین افادیت میں پایا جاتا ہے۔ جہاں تک وسائل اور افادے کا تعلق ہے، بلا کسی تکلف یا لحاظ کے وسائل سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنا، اقل ترین افادیت کا عملی نتیجہ ہے۔ یہاں اخلاق اور رواداری کا سوال نہیں۔ کم سے کم وسائل صرف کرو اور رگڑ کے کام لو اور زیادہ سے زیادہ نفع کماؤ۔ برعکس اس کے تبادلۂ اشیاء کے

اصول میں، دو بنیادی تصور داخل ہیں یعنی شئے اور معاہدہ۔ یہ عمل اور ردِ عمل یا بدل اور توازن، باہمی رواداری، ٹھوس قسم کی قابلِ پیمائش چیزیں ہیں۔ بدل کا تصور، اصولِ تبادلۂ اشیاء کی جان اور مساوات کا لحاظ اس اصول کا فطرتی تقاضہ ہے۔ بدل اور مساوات کا خیال بلحاظ ضرورت فریقین تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کم معاوضہ زیادہ مال، قلتِ اشیاء، زیادہ قیمت یہ سب عناصر تغیر و تبدل پذیر ہیں مگر اشیاء یا ملکیت کی عظمت اور معاہدہ کی پابندی کا لزوم بڑی مستحکم قدریں ہیں۔ جب تک ملکیت کی اہمیت اور معاہدے پر بلا لحاظ نفع و نقصان پابندی کا ارادہ اپنی جگہ مستقل حیثیت نہ رکھیں اور نہ مضبوط اور مستحکم تصورات کے طریقے پر قبول نہ کئے جائیں، تبادلۂ اشیاء کا اصول معاشیات میں اور باہمی رواداری اور امداد باہمی کے اصولِ اخلاقیات میں اُس کشتی کی طرح بے اطمینانی کے دھارے میں بہتے پھریں گے۔ ع

نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادباں باقی،

کوئی شخص خواہ معاشرتی زندگی کا خیال کرے یا معاشی معاملات کا کسی طرح جان ہی نہ پائے گا کہ اُسے ملے گا کتنا اور دینا کیا چاہیے، یا کسی قسم کے برتاؤ کا جواب کیا ملیگا۔ لیکن ملکیت اور معاہدہ کے تصورات میں لچک اور لوچ بھی ہونا ضروری ہے۔ ملکیت اور معاہدہ کے مفہوم سے آزادیِ عمل کے تصور کو بالکل ہی خارج نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں آزادی عمل کی اصطلاح کو آزادانہ استعمال کے ہم معنی اور مخصوص استعمال کی ضد سمجھا رہا ہے۔ اگر ملکیت اور معاہدہ کے حقوق کا استعمال آزادانہ طریقے پر نہ ہو اور اُن کا فائدہ پورے معاشرے کو پہنچنے پر قیود عائد کی جائیں اور وہ صرف شخصی، یا طبقاتی یا فرقہ وارِ تک محدود رکھے جائیں تو یہ دونوں حقوق جائز نہیں بلکہ ناجائز استعمال ہوں گے۔ مثلاً مکان صرف سفید فام خریداروں کو بیچا جائے یا خیراتی فنڈ صرف خاص فرقے کے لوگوں کے لئے مخصوص ہو، یا حقِ رائے دہی صرف ان لوگوں کو دیا جائے جو اپنے ہی

نظامِ انتخاب کو باقی رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ حقِ ملکیت اور حقِ معاہدہ کا اس طرح مشروط استعمال آزادیِ عمل کے مغائر ہے اور مخصوص بازار Reserved Marker اور محفوظ حقوق Infra Structure کو جنم دیتا ہے۔ یہ بات دوہرانے میں ہرج نہیں کہ یہ ملکیت اور معاہدہ کے حقوق کا سخت ناجائز استعمال ہے جو بلا وجہ معقول معاشرے کی آزادی پر بیجا پابندی کے مترادف ہیں۔ ملکیت اور معاہدے کے حقوق کے جائز اور ناجائز استعمال میں کس طرح امتیاز کیا جائے، آخر جائز اور ناجائز کی حدِ فاصل اِن حقوق کے استعمال میں کہاں قائم ہوگی۔ یہ اسی طرح کا غور طلب مسئلہ ہے، جیسے فرائض اور اخلاق حسنہ کے خطِ فاصل کا۔ لیکن یہاں پھر ماہرِ معاشیات کے لئے اپنے مسئلے کا سلجھانا زیادہ آسان ہے، اور وہ محض اس وجہ سے کہ معاشیات میں مبادلہ اشیاء اور مکمل افادہ کی درمیانی معاشی کیفیتوں کو ظاہر کرنے کے لئے بہت سی اصطلاحیں موجود ہیں خواہ حدِ فاصل کا تعین وہاں بھی مبہم یا مشکل ہو۔ یہ صحیح ہے کہ افادیت ایک عام سی اصطلاح ہے اور کم یا زیادہ کے الفاظ بڑھا کر کچھ حد تک کام چلایا جا سکتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی معاشیات میں "اجارہ" "بند بازار" "مقررہ قیمت" "متوازی یا جوابی نتیجہ" جیسی اصطلاحیں موجود ہیں جن سے خریداری اور فروخت یا تبادلہ "اشیاء" یا "افادیت" کے مدارج کی مختلف کیفیتیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر فریضے میں خواہ اخلاقی ہو یا قانونی لزوم کا پہلو کم و بیش موجود ہوتا ہے۔ اس لزوم کو خواہ آپ باہمی امداد و رواداری یا کسی اور تعلق کا نام دیں مگر اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ اس کے برعکس اگر مطمحِ نظر اعلیٰ ترین اخلاق اور برتری کی خواہش ہو یا کم سے کم وسائل سے زیادہ سے زیادہ مفاد کرنا مقصود ہو تو راہِ عمل تلاش کرنے میں حالات اور موقع محل کا خاص لحاظ کرنا ہوگا۔ اس لئے معاشرے کی تعمیر میں مخصوص مقاصد اور انتہائی اعلیٰ معیار کے حصول کے طریقوں میں توازن قائم

رکھنا ضروری ہوگا۔ یعنی اس کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ کہاں پر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے ذرائع اور طریقے جن سے معاشرے کے خاکے میں رنگ بھرنا مقصود ہو اس طرح غالب نہ آجائیں کہ معاشرے کے بنیادی ڈھانچے کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے۔ ایک تازہ مثال لیجئے کہ ملک میں جمہوریت کی خواہش اور کوشش میں ذرائع کا استعمال ضرور ہوگا۔ یہ ذرائع مختلف ہوں گے، اور مکان کا قبضہ لینے کے مقررہ ذرائع مثلاً دعوے اور عدالتی چارہ جوئی کی طرح بے لچک اور جامد نہ ہوں گے مگر جمہوریت جو ملک کے خاکے میں آزادی اور ترقی کا رنگ بھرتی ہے، بے لگام نہیں ہونے دی جاسکتی۔ اس کے حصول کے ذرائع متعدد ہیں اور اُن میں لچک بھی ہے مگر اس لچک سے اس طرح فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا کہ ملک کا استحکام اور اس کا بنیادی ڈھانچہ ڈھے کر رہ جائے۔ یہ مثال ہم نے سیاست اور قانون کے مسائل سے پیش کی۔ مگر بنیادی ڈھانچے Infra Structure اور اعلیٰ مقاصد کے لئے ارتقائی عمل میں امکانی تضاد کی کیفیت اور توازن قائم کرنے کی ضرورت تقریباً ہر علم و فن اور شعبۂ زندگی میں ملے گی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے اخلاقیات، قانون، معاشیات، جمالیات، یہاں تک کہ سائنس کے ہر شعبے میں سابقہ پڑے گا اور مناسب حل تلاش کرنا ہوگا۔ یہ بڑا مشکل کام ہے کیونکہ ہر جگہ مسئلہ ایسی گھسی پٹی شکل میں تو نہ پیش آئے گا جیسے آزادیٔ عمل اور تحفظِ ذاتی۔ یہاں ایک کی آزادی ختم اور دوسرے کی ذات کی حفاظت ضروری ہے بڑا پیش پا افتادہ موضوع ہے۔ اِس موضوع اور مقصد میں زیادہ پیچیدگی یوں بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ذاتی آزادیٔ عمل اور ذاتی تحفظ حقوق کی بنیاد پر دو افراد کے مناقشے میں، عام سماج کی فلاح کا مسئلہ ایک تیسرا عنصر بھی زیرِ غور آجاتا ہے، اور سماج کی فلاح کی شکلیں جو بعض رسوم و رواج کے علاوہ امن عامہ، مساوی مواقع ترقی، اور ایسی ہی ضروریات پر مشتمل ہیں بالکل نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہیں بلکہ اُن کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔ امریکہ کے مشہور جسٹس ہومز (Holmes) کا خیال تھا کہ

قانونی حق بہر صورت مستحکم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس میں ہمیں اس قدر اور اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ استحکام کی یہ کیفیت نہ صرف قانونی حق بلکہ اخلاقی ذمہ داری میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح فرض اور فریضہ خواہ قانونی ہو یا اخلاقی ایسا مستحکم تصور ہے جس میں استثناء یا ترمیم کی گنجائش نہیں ہوتی۔ حقوق اور فرائض سے ملتی جلتی اور بھی اصلاحیں ہیں اور حقوق اور فرائض سے ملتے جلتے اور بھی تصورات ہو سکتے ہیں۔ لیکن تصورات اور ان کی اصطلاحیں مثلاً احتیاج یا احتیاط' یا نظریہ کے تقاضے، کسی قدر ذمہ داری کا اظہار تو کرتے ہیں، مگر ان میں حقوق اور فرائض جیسا استحکام اور استقلال نہیں۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ حقوق اور فرائض خواہ قانونی ہوں یا اخلاقی استحکام اور استقلال کی صفت میں یکساں ہیں۔ بعض موقعوں پر ان حقوق اور فرائض میں بھی استثناء یا ترمیم کی ضرورت پڑ جاتی ہے مگر حقوق اور فرائض کا حقیقی اور صحیح تصور استثناء اور ترمیم سے یقیناً بے نیاز ہے۔ یہاں جسٹس ہومز کے فیصلے کا یہ اقتباس دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا: "حقوق تو یقیناً اپنی جگہ انتہائی حد تک مستحکم اور غیر تبدیل پذیر ہونے اور بیان کئے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت پسندی کی پالیسی سے گریز ممکن نہیں اور یہ قسم کے حق کے استعمال یا نفاذ میں حقیقت پسندی کے اصولوں کا بھی لحاظ رکھنا ہوتا ہے اور یہ اصول یقیناً حق کی بنیاد سے مختلف ہوتے ہیں بعض اوقات تو حقیقت پسندی کے اصول اچھی طرح سے حق کے نفاذ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

"Ascription of Responsibility and Right" in A G.N. Flew's Essays on Logic and Language 1952) pp. 145-66

جسٹس ہومز کی یہ رائے بلا تائید نہیں۔ ایچ۔ ایل۔ اے۔ ہارٹ نے اپنے ایک مضمون میں جو "ناقابل عمل تصورات" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں جسٹس ہومز کی بڑی حد تک تائید کی ہے۔

(Hudson Country Water Company vs Mc Carter 209 U S. 349 at Page 355 1908)

حقوق اور ذمہ داری کے استحکام کی ایک مثال لیجئے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے معاہدہ کیا ہے تو صحیح تصور یہ نہیں کہ اُس نے کسی طرح کی ذمّہ داری قبول کرنے کی طرف ایک امکان اپنے خلاف پیدا کر لیا۔ نہیں معاہدہ کر لینے کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ وہ قبول کردہ ذمّہ داری کی تکمیل پر مجبور ہے تاوقتیکہ یہ ذمّہ داری جبراً قبول نہ کرائی گئی ہو، یا اس کا ایفاء ناممکن نہ ہو چکا ہو۔ آپ اسے اخلاقی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ اُس شخص نے ایک اخلاقی ذمّہ داری جو قانون کے حدِّ اقتدار میں آتی ہے قبول کر لی اور قانون کے اقتدار کا تقاضا ہے کہ جو اُمور اُس کے حدود میں داخل ہو جائیں انھیں مخالف حالات اور خیالات کے متضاد اثرات سے پُوری طرح محفوظ رکھا جائے۔ جہاں معاملہ قانونی شکل اختیار کر لے وہاں اور قسم کی مصلحتوں کو قطعاً اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ قانونی عظمت کو متاثر کر سکیں حسنِ اخلاق اور اخلاقی فرض میں ایک اور فرق قابلِ ذکر ہے اور وہ اس قدر واضح ہے کہ کسی تفصیلی گفتگو کا محتاج نہیں۔ ہم معاشرے کے عادات اور رواج میں اس فرق کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے ان دونوں قسموں کے اخلاق کے لئے سزا اور جزا کے مختلف اُصول اور پیمانے بنا رکھے ہیں۔ جہاں تک اخلاق کی فرائض والی قسم کا تعلق ہے اُس کے متعلق ترک پر سزا ضرور ہے گو عمل پر جزا کا کوئی خاص خیال نہ رکھا جاتا ہو۔ اگر کوئی شخص معمولی زندگی کے فرائض ادا کرتا رہتا ہے جن کی اصل وجہ یہ ہے کہ بغیر ایسے عمل کے معاشرہ باقی ہی نہیں رہ سکتا تو کسی تعریف یا انعام کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم ایسے شخص پر جو اس عمومی اخلاق کا پابند ہو کوئی توجہ نہیں کرتے۔ البتہ جو شخص معمولی اخلاقی فرائض کے ترک کا مرتکب ہوتا ہے، معاشرہ اُس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ خواہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کرتا ہو۔

اِس عام برتاؤ کا تقاضا ہے کہ جہاں تک اخلاقِ حسنہ کا تعلق ہے جہاں انسان

انتہائی خوبی اور صلاحیت کا طالب ہوتا ہے وہاں جزا، تعریف اور توصیف کا عنصر غالب ہوگا۔ ایک حد تک واقعہ بھی اسی توقع کے مطابق ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ جہاں بہت اعلیٰ معیار اخلاق کا لحاظ رکھا جائے اور آدمی غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کر رہا ہو، وہاں عام سطح سے اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ عوام اس کی خوبی اور صلاحیت کار کا احساس ہی نہیں کر پاتے۔ سزا اور جزا کا معاملہ صرف قانون کے دائرۂ عمل تک محدود نہیں بلکہ شعبۂ تعلیم، صنعت، زراعت اور تفریحی مشاغل میں بھی سزا اور جزا کا عمل دخل پایا جاتا ہے۔ پھر چند ادر عام اصول بھی ان شعبوں میں یکساں رائج ہیں۔ جب انعام و اکرام یا اعزاز دینا ہو یا زجر و توبیخ مقصود ہو تو ان امور کا تصفیہ کرنے کے لئے کوئی شخص یا جماعت ثالث کے فرائض انجام دیتی ہے اور بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ ثالث سمجھداری اور غیر جانبداری سے اپنے فریضے کو انجام دے گا۔ لیکن یہاں بھی سزا اور زجر و توبیخ کے نتیجے پر پہنچنے کے لئے جو بھی ضابطہ یا قاعدے مقرر ہوں وہ بالعموم اُس انداز کے نہ ہوں گے جو انعام و اکرام یا اعزاز دینے کے لئے رائج ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ جہاں سزا دینی مقصود ہے وہاں اس کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ایک مقررہ ضابطہ موجود ہو جس کی پوری پابندی کے بعد ہی ثالث سزا مقرر کرنے کا مجاز سمجھا جائیگا۔ یہ ضابطے بالعموم کسی قدر تفصیلی بھی ہوتے ہیں اور اس طرح وضع کئے جاتے ہیں کہ ان کے استعمال پر عوام کو اعتبار بھی رہے کہ ناانصافی نہیں ہوئی۔ جہاں تعریف و توصیف انعام اور اعزاز عطا کرنے کا سوال ہوتا ہے وہاں ضوابط اور قاعدوں کی پابندی پر اتنی کڑی نگرانی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ اور اس فرق کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔

جب سزا اور تاوان کا سوال پیدا ہو تو وہ ایسے ہی عمل انسانی کے متعلق ہوتا

ہے جس کے سمجھنے اور تمیز کرنے میں کسی خاص دقت اور پیچیدگی کا موقع نہیں ہوتا۔ بدکرداری یا غلط عمل عام اخلاق کی ایسی سطح پر ہوتے ہیں کہ ذرا بھی احتیاط رکھی جائے تو اُن کا انکشاف اور موازنہ ممکن ہے اور اُن کی جانچ پڑتال کے لئے پیمانے بہ آسانی بنائے جا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں انعام اور اعزاز عطا کرنے کا سوال ہوگا وہ انسانوں کے ایسے اعمال کے متعلق ہوگا جن میں صلاحیت کار یا حسن عمل کا بہ طریق احسن مظاہرہ ہوا ہو۔ معیاری کام اور اعلیٰ ترین اخلاق کے مظاہرے کو پہچاننا اور تمیز کرنا عوام کالانعام کا کام نہیں کیونکہ خود ان کی فہم و فراست محدود ہوتی ہے اور نازک خطوط اور دقیق محرکات کو خاطر خواہ طریقے پر پرکھنے کے لئے نازک احساس اور دقتِ نظر کی حاجت ہے جو عوام کے بس کی بات نہیں۔ فنون لطیفہ کے اعلےٰ نمونوں کی قدر تو کیا بعض وقت صحیح شناخت بھی اِس طرح نہیں کی جاتی جس طرح ایک مقدمہ میں جُرم کے ثابت ہونے یا نہ ہونے کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ جرائم اور قابل ملامت افعال کی مذمت اور زجر و توبیخ کا معیار، جانچنے کا طریقہ اور ضابطہ اور نتائج کی نوعیت کا معاملہ بالکل علیحدہ ہونا چاہیے اور ہے۔ اچھے قابل تحسین کاموں، قابل اعزاز کارناموں، انسانی اعلیٰ صلاحیتوں کے شہکاروں کی جانچ پڑتال کا معیار، تشخیص کے ضابطے اور قاعدے بالکل دوسری ہی نہج کے ہوتے ہیں۔ ان دونوں عام نظریوں کی مختلف مثالیں ذہن میں آتی ہیں لیکن ہم دو ایک مثالوں پر ہی اکتفا کریں گے۔ مزدوروں اور آجروں کے مناقشوں اور جھگڑوں میں خدمت سے علیحدگی ایک سزا ہے اور ہر متمدن معاشرے میں کوئی نہ کوئی طریقہ ثالثی کا مقرر ہوتا ہے کہ اس سزا کے مناسب یا نامناسب ہونے کے متعلق فیصلہ کرے۔ مگر ترقی کے لئے اور انعام و اعزاز کے لئے صوابدید کا طریقہ مقرر ہے اور کوئی محاسبہ نہیں ہوتا۔ اگر جانچ کی نوبت بھی آئے تو حاکم مجاز کی تجویز سے اختلاف محض

شخصی رائے پر ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے معاملات میں ایسا کوئی کلیہ مقرر نہیں۔ ہمیشہ مناسب سزا کو ملے۔ اور یہ جرم ہوا، سزا دو) کے اصولوں میں ایک اہم اصول ہے۔ مثلاً کھیل کے میدان میں لیجئے کہ غلطیاں مقررہ قواعد کی خلاف ورزی کا نام ہے اور اس پر کوئی نہ کوئی "تاوانی" حکم لگا دیا جاتا ہے، اس کے برعکس اچھے اور لاجواب کھیل کا معیار بالعموم شخصی رائے یا پسند کرنے والوں کے خطوط پر منحصر رہا کرتا ہے۔ ایک ٹھوس مثال لیجیے کہ کوئی اچھا بیٹس مین بڑے غیر معمولی کیچ کی وجہ سے کم رن بنا کر یا زیادہ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ دیکھنے والوں کی رائے میں کیچ کی اچھائی ایسے معیار سے طے کی جا رہی ہے جو محض شخصی ہے اور ممکن ہے کہ ایسا عمدہ کیچ اُس فیلڈر کے لئے محض اتفاقی۔ دوسری جانب اگرچہ بیٹس مین کا اوسط اس ایک کیچ پر منحصر نہیں مگر آؤٹ قرار دئے جانے میں کھیل کی غلطی صاف پکڑی جاتی ہے، اور نظر انداز نہیں ہو سکتی۔ غرض سزا کا معیار اصولی اور جزا کا شخصی ہوا کرتا ہے۔ اور سنئے، جب اعزازی ڈگریاں یونیورسٹی سے ملتی ہیں، یا فوجی اعزاز عطا ہوتے ہیں، یا جانبازی کے انعام تقسیم کئے جاتے ہیں، یا ادب سائنس، یا خدمتِ عامّہ کے سلسلہ میں معاوضے وظیفے یا عطیے مقرر کئے جاتے ہیں تو دینے والے اشخاص یا ادارے یہ امور اپنی اپنی شخصی رائے یا آراء سے طے کرتے ہیں اور رائے عامّہ کو مناسبت کی جانچ کا موقع شاذ ہی ملتا ہے۔ اس کلیے میں استثنائی شکلیں بھی ہیں، مثلاً رومن کیتھولک چرچ میں سینٹ (Saint) یا ولی کا اعزاز بخشنے کے لئے بڑا ہی سخت معیار "معجزہ" دکھانے کا مقرر ہے، اور "معجزہ" ثابت کرنے کے لئے بڑی سخت شرائط ہیں مگر یہ انعام نہیں مذہبی مفروضہ ہے۔ اور معجزے کی شرط اسے عام انسانوں کے معیار سے ممیّز کر دیتی ہے۔

سماجی مصروفیات اور روزمرہ کے اعمال سے جو مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں

اُن پر غور کیا جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک مفروضہ بالکل صحیح نہیں، وہ مفروضہ یہ ہے کہ اچھائی اور اعلیٰ قدر کی حقیقت اور معیار کو مقرر کئے بغیر برائی، بدی، اور بدعملی کا صحیح تصور قائم نہیں ہوتا۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہوتا تو پانچ فی صد بُرائی اور بدی بھی بغیر چھپے نہ رہتی اور برائی، غلط کاری اور بدعملی کو جانچنے کے لئے اس قدر سخت معیار اور قواعد اور احتیاطی ضابطے نہ مقرر ہوتے جتنے معاشرے نے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سخت قواعد اور احتیاطی ضابطوں کے طفیل ہی تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بُرائی، بدی اور بداخلاقی کے معیار ٹھوس ہیں اور بہ آسانی شناخت اور تشخیص ممکن ہے۔ اعلیٰ قدروں، اور صلاحیتوں کے کمال کو اتنی آسانی اور بندھے ٹکے طریقوں سے نہیں جانچ سکتے۔ عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ ہمیں اپنے رسم و رواج اور دستور العمل اور معیارِ خوب و زشت کی ترتیب تعمیر اور تشخیص میں اس بنیادی کلیے کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

باب دوم

اخلاق اور قانون کا وجود

ایسا قانون جس کی تعمیل یا جس پر عمل امکان سے باہر ہو، قانون ہی نہیں اور کالعدم ہے۔ متضاد احکام پر عمل ہی ممکن نہیں۔ (چیف جسٹس واگھن ٹامس بنام سورل ۱۶۷۷)

ہمارے قابل وکلاء کو اس سوال پر ہمیشہ غور کرنا چاہیے کہ کیا عوام نے مقننہ کے ارکان کو منتخب کرنے کے بعد قانون وضع کرنے کے ایسے غیر محدود اختیار دے دئے کہ اپنے ہی وضع کردہ سابقہ قوانین کی تنسیخ کے بغیر وہ نئے قوانین بنانے چلے جائیں۔ (Lilburne, England's Birthright Justified, 1645)

اس باب کے مطالب کو واضح کرنے کے لئے ہمیں بڑی دور تک افسانوی طرز اختیار کرنا ہوگا۔ یہ ایک ایسے فرمانروا کے ناکام عہدِ حکومت کا قصہ سمجھئے جس کو ہم صرف بادشاہ کے غیر دلچسپ اور غیر معین نام سے یاد کریں گے، تو چلئے سنئے۔

وہ آٹھ طریقے جن سے قانون سازی ممکن نہیں۔

بادشاہ تخت نشین ہوئے تو اس جوش اور جذبے سے کہ گویا ملک و قوم

کی اصلاح اِنھیں پر منحصر اور موقوف ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ ان کے پیش رو قانون سازی کے معاملے میں بالکل ہی ناکام رہے ہیں۔ مدتوں کیا نسلوں سے نظام قانون کی اصلاح کا کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ دادرسی کے ضابطے بڑے دِقت طلب اور بے ڈھنگے تھے۔ قانون اور قواعد کی زبان دقیانوسی تھی۔ انصاف حاصل کرنا مشکل بھی تھا اور بڑا مہنگا پڑتا تھا۔ نظمائے عدالت بڑے کاہل اور بعض بعض بددیانت بھی تھے۔ بادشاہ کا مصمم ارادہ تھا کہ ان خرابیوں کو دور کیا جائے تاکہ اُس کا نام بحیثیت ایک مصلح قانون، در مقننن کے تاریخ میں یادگار رہے۔ مگر بڑے تاسف کا مقام ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود وہ اپنے مقاصد میں ناکام رہا۔ اور یہ ناکامی بھی بڑی فاش ناکامی تھی۔ ضروری اصلاحیں تو بجا رہا کیا کرتا وہ سرے سے اچھا یا برا کسی قسم کا قانون ہی نہ بنا پایا۔

اِس خیال سے کہ ایک مثالی نظام قانون رائج کیا جائے، ہر مبتدی مصلح کی طرح بادشاہ نے نہایت ڈرامائی انداز میں اور بڑی نیک نیتی سے اپنی رعایا میں اعلان کر دیا کہ تمام پُرانے قوانین یک قلم منسوخ اور کالعدم قرار دیئے جاتے ہیں۔ ہم اپنی عزیز رعایا کی فلاح و بہبود کی خاطر پورا نظامِ قانون بدلیں گے۔

اِس اعلان کے ساتھ ہی بادشاہ نے نئے قوانین کی تیاری کا کام بڑی سرگرمی سے شروع کر دیا۔ مگر ایک بڑی کوتاہی اور کمی یہ محسوس ہونے لگی کہ بحیثیت شہزادے کے بادشاہ صاحب کی تعلیم و تربیت ایک مخصوص طریقے پر ہوئی تھی اور کسی طرح اس کام کے لئے موزوں نہ تھی۔ بادشاہ معمولی سا معمولی کلیہ وضع کرنے میں دقت محسوس کرتا۔ وہ چند مثالوں اور واقعات سے کوئی قاعدہ صحیح طور پر اخذ نہ کر پاتا۔ واقعہ یہ نہ تھا کہ اس میں قوت فیصلہ کی کمی تھی۔ ہر مناقشے اور نزاع کو وہ بڑی خود اعتمادی سے طے کر دیتا۔ لیکن جب اس سے اپنی تجویز

کے مؤثر وجوہ ظاہر کرنے کی استدعا کی جاتی تو باوجود سعیِ بلیغ وہ اپنے کو مجبور پاتا۔

مجموعۂ قوانین کے مدوّن کرنے کی مشکلات کا پوری طرح احساس کرنے کے بعد اور اس میں اپنی بے بضاعتی محسوس کر کے بادشاہ نے اعلان کرا دیا کہ خیر اب ہم یہ کریں گے کہ آئندہ سے اپنی رعایا کی تمام نزاعات بذاتِ خود فیصل کریں گے۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ اس طریقے سے جب ہر قسم کے معاملات اُس کے سامنے پیش ہوں گے تو وہ ان پر غور اور فکر کر کے قواعد اور ضابطے مدوّن کرنے کی کوشش کریگا۔ اور رفتہ رفتہ ایک ایک قاعدہ وضع کر کے پورا نظامِ قانون مکمل کیا جا سکے گا لیکن بدقسمتی سے یہاں بھی اس کی کم علمی اور دنیا کے تجربات کا فقدان آڑے آیا اور تمام پُرخلوص کوششوں پر پانی پھر گیا۔ سیکڑوں کیا ہزاروں مقدمات کے فیصلے تو اُس نے کر دئیے مگر نہ خود بدولت اور نہ رعایا میں سے کوئی اِن فیصلوں سے کوئی مقررہ اُصول اخذ کر سکا۔ اور اگر کسی نے کبھی اِن فیصلوں سے بطور آزمایش عام اُصول اخذ کرنے کی کوشش بھی کی تو اُلجھن اور بڑھ گئی اور بجائے اس کے کہ کچھ قواعد متعین کئیے جا سکتے، خود بدولت ہر نئی نزاع کے تصفیہ میں جب پُرانے فیصلوں کا سہارا لینے جاتے تو معاملہ کچھ پیچیدہ ہی ہوتا جاتا۔

اِن ناکامیوں نے بادشاہ سلامت کو مجبور کیا کہ کوئی نیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے استنباط اور انطباق کے متعلق درس لینے شروع کئے اور بڑی دلچسپی سے علمِ منطق کی تکمیل کی۔ اس عمل سے کچھ خود اعتمادی ضرور پیدا ہوئی اور پھر ایک دفعہ قانون کی تشکیل کا سودا سر میں سما گیا۔ بڑی محنت اور کوشش سے بالآخر بادشاہ سلامت ایک خاصا طویل مسودہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ پرانا تجربہ اور اُس کی ناکامی کا خیال مانع آتا

اور بجائے اس کے کہ مجموعۂ قوانین عام طور پر نافذ اور عام کر دیا جاتا حضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ لوگوں کو یہ تو بتا دیں کہ ایک مجموعۂ قوانین تیار ہے مگر جب تک تجربے سے خود بدولت اسے کامیاب نہ پائیں گے یہ مجموعہ راز میں رہے گا۔ گو یہ ضرور ہے کہ فیصلے بالکل اُسی کے مطابق کئے جائیں گے۔ لیکن بادشاہ سلامت کو بڑا تعجب ہوا جب اس اعلان سے رعایا میں عام ناراضگی اور بے چینی پھیل گئی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے، انھیں عجب بے اعتباری کی بات معلوم ہوتی کہ ہمارے فیصلے تو قواعد کے مطابق کئے جائیں اور ہمیں خود اُن قواعد کا پتہ ہی نہ چلے۔

عوام کے اِس ردِّ عمل سے بادشاہ سلامت کو بڑا صدمہ ہوا، مگر اب اُنھوں نے خود اپنی خامیوں اور صلاحیتوں کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خود اپنے تجربوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے، اور تجربہ یہ کہتا ہے کہ فیصلہ یا تجویز یا نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد اُس کے وجوہ بیان کرنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اِس کے کہ قواعد و اُصول پر غور کر کے فیصلہ لکھا جائے۔ کیونکہ قواعد اور اُصول کی تدوین مشکل چیز ہے۔ چنانچہ آپ نے اعلان فرمادیا کہ تمام مقدمات کے فیصلے بعد غور اور بہ اظہار وجوہ ہر سال کے آخر میں سُنا دئے جایا کریں گے۔ مگر شرط یہی ہوگی کہ کوئی فیصلہ بطور نظیر کام نہ آسکے گا۔ اس تجربے کا ایک فائدہ یہی تھا کہ فیصلے مدلل ہوتے، جو بادشاہ کے لئے بڑی ہی قابلِ اطمینان بات ہوتی۔ مگر اس طریقے میں ایک بڑا نقص بھی تھا۔ یہ اعتراض کہ فیصلے بلا اظہارِ اسباب و وجوہ ہوتے ہیں بیشک عائد نہ ہوتا، اور بادشاہ سلامت کے خیال میں یہی بڑا اعتراض تھا مگر رعایا میں بھی تو آخر سمجھدار لوگ تھے، اُنھوں نے اس نئے اعلان کو خاموشی سے سُن تو لیا مگر اپنے لیڈروں کے ذریعہ سے گذارش پیش کرائی کہ اُن کا اصلی منشا اب بھی پُورا نہ ہوگا۔ وہ ایسے قاعدوں سے اور اظہارِ اسباب سے فائدہ ہی کیا اُٹھا سکتے ہیں

جب تک انھیں ان اصول و قواعد کا پہلے سے علم نہ ہو۔ بادشاہ سلامت اس نئے اعتراض پر جز بز تو ہوئے مگر فرمانے لگے کہ اچھا اس کے متعلق بھی غور کیا جائے گا۔

بہر کیف اب یہ بات طے شدہ تھی کہ مجموعۂ قوانین کا اعلان قبل از قبل کئے بغیر چارہ نہیں اور ایک مرتبہ پھر حضرت سلامت کو تدوین اور تکمیل کا کام شروع کرنا پڑا۔ رعایا نے اس نئے اعلان کا خیر مقدم کیا کہ چلو اب تو انھیں ان قواعد کا پہلے سے علم ہو جائے گا جن کی پابندی لازمی ہے۔ آخر بڑی تحقیق اور بے انتہا مشقت اٹھا کر بادشاہ سلامت نے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کے نفاذ کی تاریخ کا بھی اعلان ہو گیا۔ رعایا میں بڑی خوشی منائی گئی کہ اب تو زندگی میں باقاعدگی پیدا ہو گی۔ لیکن یہ مسرت عارضی تھی۔ اس لئے کہ جب مجموعہ قوانین شائع ہوا تو ہر شخص کا ردِ عمل واضح تھا۔ ماہر قانون ہو یا عامی ہر ایک نے محسوس کیا کہ اس مجموعہ کا ایک جملہ بھی قابل فہم ہی نہیں قابل عمل تو کجا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ایک مجمع محل کے دروازوں پر اکٹھا ہو گیا۔ یہ لوگ ہاتھوں میں پوسٹر لئے تھے کہ "جو قاعدہ سمجھ میں نہ آئے اس کی تعمیل اور پابندی کیونکر کی جائے"۔ بادشاہ سلامت نے فوراً ہی اعلان کروایا کہ قوانین کا جو مجموعہ نافذ کیا گیا تھا، بمصالح چند واپس لیا جاتا ہے۔

لیکن اتنی ناکامیوں کے بعد اب خود بدولت کی بھی سمجھ میں آنے لگا تھا کہ قانون سازی کسی ایک کے بس کا کام نہیں۔ بلاشبہ مدد کی ضرورت ہو گی۔ اس لئے انھوں نے قانون کے ماہروں کی ایک کمیٹی بنا دی جس نے پورے مجموعے پر نظر ثانی کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن پھر بادشاہ کی انا آڑے آگئی کیونکہ کمیٹی کو حکم ملا کہ وہ صرف زبان اور بیان کی حد تک اصلاح کر سکتے ہیں انھیں اصل موضوع اور احکام کو بدلنے کا اختیار نہ ہو گا۔ یہ ترمیم شدہ مجموعہ جب سامنے آیا تو محسوس ہوا کہ زبان اور بیان کی حد تک شاید ہی اس پر اعتراض ہو سکے مگر احکام کی خامیاں، تناقص اور تضاد

اب بھی باقی ہے بلکہ زبان کا اُلجھاؤ دور ہو جانے سے یہ کمزوریاں کچھ زیادہ ہی نکھر آتی ہیں۔ یہاں تک بات پہنچ گئی کہ مجموعے میں کوئی ایسا حکم نہیں تھا جس کے نقیض اور خلاف دوسرا حکم کسی اور حصے میں موجود نہ ہو۔ یہ مجموعۂ قانون نہیں مجموعۂ اضداد تھا۔ شاہی محل کے سامنے پھر مظاہرے شروع ہو گئے اور نئے پوسٹروں کی عبارت تھی: "حضورِ والا کے احکام اس قدر صاف ہیں کہ ہر کام جائز بھی ہے اور ناجائز بھی۔" حضرت سلامت بڑے برہم ہوئے اور جلد ہی احکام کے واپس لینے کا اعلان کرنے پر مجبور بھی۔ لیکن انسان ہی تو تھے، اب کے مشیرانِ قانونی کے نام حکم صادر ہوا کہ رعایا نے ہمیں "تنگ کر رکھا ہے" ہمارے خلوص اور محنت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا حالانکہ ہم صدقِ دل سے خدمتِ خلق کرنا چاہتے ہیں، بہتر ہے کسی قدر سختی سے کام لیا جائے۔ لہٰذا حکم ہے کہ جہاں تمام اختلافات اور تبائن رفع کئے جانے ضروری ہیں وہاں یہ بھی خیال رکھا جائے کہ قوانین کی شرائط سخت تر کر دی جائیں اور نئے جرائم کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ ان نئی ہدایتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ نہ صرف معمولی معمولی غلطیاں جرائم کی فہرست میں شامل ہوئیں بلکہ احکام کی تعمیل کی مدت میں بے انتہا کمی کر دی گئی۔ پہلے حکمِ شاہی پر حاضری کے لئے دس دن کی مہلت ہوا کرتی تھی، اب اسے گھٹا کر دس سکنڈ کی مدت کر دیا گیا۔ بادشاہ کے حضور کھانسنے چھینکنے، ہچکی لینے، حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑنے کی حرکتیں جرم قرار پائیں جن کی سزا دس سال قیدِ سخت تک مقرر کی گئی۔ جمہوریت اور ارتقا کے مسائل کو صحیح طور پر نہ سمجھنے اور ان پر ایمان نہ لانے کو بغاوت قرار دے کر سنگین سزا مقرر ہوئی، شاہِ ذی جاہ مطمئن تھے کہ اب کام چل نکلے گا۔ لیکن جیسے ہی قانون کا نیا مجموعہ شائع ہوا اور لوگ اس سے واقف ہوئے تو جیسے انقلاب سا آ گیا ہے معزز اور وفادار شہریوں نے اعلان کرنا شروع کر دیا کہ وہ قانون شکنی کو تیار ہیں۔ ایک

باریک بیں نے ایک پرانے مقنن نے کتاب کا حوالہ دے کر لوگوں میں چرچا کیا کہ "ناممکن العمل احکام دینے سے قانون نہیں بنتا بلکہ بگڑتا ہے۔ کیونکہ جس حکم کی تعمیل ممکن نہ ہو اُس سے سوائے پریشانی، خوف اور بدنظمی کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔" اس قول کو نقل کرکے ہزاروں لاکھوں محضر بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش ہونے لگے۔ بادشاہ سلامت کو بھی مخالفت کی شدت کا احساس ہوا اور بڑے رنج و افسوس کے اظہار کے بعد انھوں نے اپنا مجموعۂ قانون پھر واپس لیا۔

اب کے قانون سازوں کو حکم ہوا کہ احکام میں نرمی کی جائے اور جہاں جہاں ناممکن العمل قاعدے ملیں اُنھیں آسان اور قابلِ عمل بنایا جائے تاکہ رعایا کیلئے سمجھنے میں اور تعمیل میں آسانی ہو۔ ان ہدایتوں کی تعمیل کا نتیجہ ظاہر ہے مجموعے کے ہر حکم کو ترمیم یا منسوخ کرنا پڑا۔ اب جو مجموعہ تیار ہوا وہ قانونی مہارت کا شاہکار تھا۔ احکام واضح، ایک دوسرے سے مربوط، معقول اور ایسے پائے گئے کہ جن پر عمل نہ صرف ممکن بلکہ آسان بھی تھا۔ اس مجموعے کے ہزاروں نسخے چھپوا کر رعایا میں مفت تقسیم کرادیے گئے۔ لیکن بدقسمتی نے اب بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ بادشاہ کے ابتدائے مسودے اور پھر نوبت بہ نوبت تنسیخ اور ترمیم میں اتنا کافی عرصہ گزر گیا تھا کہ جب نفاذ کی تاریخ آئی تو حالات کے لحاظ سے زمانہ اور حالاتِ زمانہ مجوزہ قوانین اور قواعد سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ مسودے کی تیاری نوبت بہ نوبت تبدیلی میں اور ترمیم اور پھر نفاذ میں جو عرصہ گزرا تھا اس مدت میں سماجی اور معاشی ترقی اور تبدیلیوں نے قانون کو پھر ضروریاتِ زمانہ کے غیر مطابق کر دیا تھا۔ ان معاشی اور سماجی تبدیلیوں کے پیشِ نظر مجموعہ میں بنیادی تبدیلیوں کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی نیا نظامِ قانون نافذ کیا گیا ترمیمات اور توضیحات کا ایک سیلاب اُمنڈ پڑا جو اپنی جگہ بالکل جائز بلکہ ضروری محسوس

ہوتی تھیں۔ عوام کی بے اطمینانی نے پھر مخصوص شکل اختیار کرنی شروع کر دی۔ کسی منچلے نے بے نام دبلے کتابچوں اور اشتہاروں کی بوچھار کر دی جس میں بادشاہ کے طرح طرح سے کارٹون ہوتے اور ایک نہ ایک مقالہ ہوتا جس کا مستقل عنوان یہ ہوتا "اُس قانون سے جو روز بدلے، لاقانونیت بہتر ہے"۔

کچھ مدت میں جب ترمیمات کی ضرورت اور تعداد میں نمایاں کمی آنے لگی تو بے اطمینانی میں کسی قدر کمی آگئی۔ مگر قبل اس کے کہ حالات میں توازن پیدا ہو۔ بادشاہ سلامت نے ایک اور اعلان فرما دیا۔

انھوں نے اس مسئلے پر کافی سوچ بچار کیا تھا کہ آخر اُن کی مسلسل ناکامیوں کی ذمہ داری کس پر ہے۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے ماہر مشیر بڑی حد تک ان کی ناکامیوں کے ذمہ دار تھے۔ لامحالہ انھیں یہی صورت اختیار کرنی پڑی کہ وہ عدلیہ کی تمام تر ذمہ داری خود سنبھال لیں۔ اس طرح نئے مرحمہ نظام قانون پر عمل صحیح طریقہ پر ہو سکے گا، اور آراء کے اختلاف کا سوال پیدا نہ ہوگا نہ رعایا کو بلاوجہ بے اعتمادی کا شکار ہونا پڑے گا اور عام تشویش بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔ ملک کو تشویشناک صورتِ حال سے بچانے کی خاطر بادشاہ سلامت اب اپنا پورا وقت نئے قانون کے تحت پیدا ہونے والے مقدمات کے تصفیئے میں صرف کرنے لگے۔

اس محنت اور تندہی کا ایک فائدہ تو بے شک ہوا اور وہ یہ کہ کثرت کار کی وجہ سے بادشاہ کا تجربہ بڑھا اور قاعدۂ کلیہ وضع کرنے کی وہ صلاحیت جو اُن کے ذہن میں بڑی حد تک خوابیدہ تھی بیدار ہونے لگی۔ اُن کی تجاویز میں خود اعتمادی اور فنی مہارت جھلکنے لگی۔ وہ اپنی سابقہ تجاویز اور زیر نظر مقدمہ کے حالات میں تمیز کرنے اور تمیز کے وجوہ ظاہر کرنے پر مہارت حاصل کرنے لگے۔ قواعد اور کلیات کے حوالے دینے میں اُنھوں نے استعداد پیدا کر لی، اور آئندہ تنازعات کے تصفیئے

کے لئے اشارات ان کے فیصلوں میں بطور خاص نمایاں نظر آنے لگے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رعایا کے دن پھر گئے اور بہت جلد ان کے لئے ایک ایسا قابل عمل مجموعہ قانون و نظائر مکمل ہو جائے گا جس میں عوام کی فلاح و بہبود کی مکمل ضمانت ہوگی۔

لیکن بالآخر ان اُمیدوں اور تمناؤں پر اوس پڑ گئی۔ جب بادشاہ سلامت کی تجاویز کا مجموعۂ نظائر طبع ہوا اور اس کی جلدیں عام مطالعے میں آئیں تو غور و خوض کرنے والوں نے محسوس کیا کہ درحقیقت ان نظائر میں اور اُس مجموعۂ قانون میں جو رائج کیا گیا تھا، کوئی خاص ربط اور مطابقت نہیں۔ پیش نظر مقدمہ کا فیصلہ حالات اور واقعات کے لحاظ سے بڑی دیانت داری اور محنت سے لکھا گیا۔ مباحث اور نظریات بڑے واضح انداز میں بیان کئے گئے اور نتائج و یقین مقدمہ کی حد تک اطمینان بخش بھی تھے مگر قانون نافذہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بہ الفاظِ دیگر اگر وہ مجموعۂ قانون جو نیا اور نافذ کیا گیا تھا موجود نہ بھی ہوتا تو بھی حضرت سلامت کی تجاویز اور نظائر پر کوئی خاص ناپسندیدہ یا پسندیدہ اثر نہ پڑتا۔ یہ اور بات تھی کہ تجویز اور نظیر میں بار بار خود بدولت نے مجموعۂ قانون کے قواعد اور دفعات کا بڑی پابندی سے حوالہ دیا تھا، اور اُسے ملک کا بنیادی قانون قرار دیتے رہتے تھے۔

لیڈروں اور معزز شہریوں نے جو بادشاہ سلامت کے خلوص اور ان کی محنت اور مشقت کے قائل ضرور تھے پھر مشورے اور مجلسیں کرنی شروع کر دیں جس میں یہ اُمور زیر بحث رہتے کہ کس طرح، علم بغاوت بلند کئے بغیر، اپنے نیک فطرت اور نیک نیت بادشاہ کو کرسیِ عدالت سے ہٹا کر پھر تختِ سلطنت پر ہی متمکن رہنے دیا جائے۔ ابھی یہ مشورے اور چرچے جاری ہی تھے، اور غالباً

ان کی بھنک بادشاہ کے کانوں میں پڑ ہی گئی تھی، کہ اپنے وقت سے پہلے اور اپنی رعایا کی بددلی اور احسان فراموشی سے دل شکستہ ہو کر بادشاہ نے دفعتاً انتقال کیا۔

مرحوم بادشاہ کے جانشین اول نے اپنی تخت نشینی کے بعد پہلا اعلان تو یہ کیا کہ وہ حکومت چلانے کے تمام اختیارات قانون دانوں سے واپس لے کر انھیں حکمائے نفسیات اور ماہرینِ تعلقاتِ عامّہ کے سپرد کر رہے ہیں۔ ان کی اپنی قطعی رائے یہ تھی کہ اس طرح عوام کو، قانون اور قواعد کی الجھنیں پیدا کئے بغیر اس نئے انداز سے خوش حال اور مطمئن رکھا جا سکتا ہے۔

ناکامیوں کے نتائج

اِس افسانوی بیان سے ہمیں چند سبق ملتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی غیر مربوط قانون سازی اور غیر متوازن انصاف رسانی کی کوششوں سے کم از کم یہ تو اچھی طرح ثابت ہوا کہ کوئی قانونی نظام نیا ہو یا پرانا کسی معاشرے پر بہ آسانی مسلّط نہیں کیا جا سکتا اور بالخصوص اس راہ میں بنیادی مشکلات حائل ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں جنھیں مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) کوئی ایسا معاشرہ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا، یا آبھی جائے تو باقی نہیں رہ سکتا جہاں سرے سے قواعد ہی مقرر نہ ہوں اور حکمران کی ذاتی رائے سے ہی تنازعات کا تصفیہ ہوا کرے۔

(۲) جن قواعد کی پابندی مقصود ہو ان کی پہلے سے تشہیر اور تفہیم نہ کرائی گئی ہو۔

(۳) تنازعات اور مناقشات کے وقوع کے بعد قواعد وضع کر کے تصفیے کی کوشش دو طرح سے ناکام رہے گی۔ پہلی دقّت تو یہ ہوگی کہ لوگ قوانین سے واقف ہی نہ ہوں گے اور توقع کی جائے گی کہ وہ دقت کے وقت بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کرتے چلے آ رہے ہوں۔ دوسری خرابی یہ ہوگی کہ جو قواعد معلوم بھی ہوں گے

ان کے متعلق یہ یقین تو بہر طور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ عین تصفیئے کے وقت بدل نہ جائیں گے۔ گویا نظام موجودہ پر بے اعتمادی اور بدل جانے کا خوف ہر وقت غالب رہے گا۔

(۴) نظامِ قانون کی چوتھی بنیادی خرابی ہو سکتی ہے کہ قواعد اور ضوابط موجود تو ہوں مگر انہیں کوئی سمجھ ہی نہ سکتا ہو۔

(۵) نظامِ قانون کے قواعد نقیض، ایک دوسرے کے خلاف، متضاد اور مختلف المعنی ہوں۔

(۶) سرے سے ان قوانین پر عمل کرنا ہی انسان کے اختیار سے باہر ہو۔

(۷) قوانین اتنے جلد جلد منسوخ یا ترمیم کئے جاتے ہوں کہ طریق عمل کی صحت کے متعلق یقین ہی نہ رہے۔

(۸) نظامِ قانون اور اس پر طریق عمل اور طریقِ نفاذ میں مطابقت نہ پائی جائے۔

ان آٹھ بنیادی نقائص میں سے اگر ایک بھی موجود ہو تو ایسا نظام قانون نہ صرف برا قانون کہلائے گا بلکہ عملاً اس کا ہونا یا نہ ہونا ہی معرض بحث میں رہیگا۔ اس کی مثال یہ سمجھئے کہ جیسے ایک کالعدم معاہدے کو ایک قسم کا معاہدہ ہی شمار کیا جائے۔ یا بدنظمی اور لاقانونیت کو نظامِ قانون کی قسم شمار کی جائے۔ بھلا ایسے قاعدے کی پابندی کا کیا اخلاقی جواز یا قابلِ فہم وجہ ہو سکتی ہے، جس کا سرے سے وجود شخصی رائے میں پایا جائے۔ یا جو بصیغہ راز میں رکھا گیا ہو۔ یا کسی شخص کے عمل کے بعد اس معاملے کے متعلق بنایا جائے، یا جو انسان کی سمجھ سے باہر ہو۔ یا جس کے متضاد احکام موجود ہوں، یا ناممکن العمل ہو، یا وقت کے وقت بدل جایا کرے۔ اور آخری شکل یہ ہے کہ قاعدہ کی پابندی ممکن

قابلِ فہم، آسان اور سبھی طرح ممکن ہو مگر یہ معلوم ہو کہ پابندی کرانے والا خود رائے قائم کرتے وقت اس قاعدے کو وقعت ہی نہ دے گا۔ عمل ممکن تو ہوا مگر بے مصرف اور بے مصرف پابندیاں بھلا کس کو پسند آتی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ رائے پنچوں کی صحیح ہے مگر پرنالہ وہیں رہے گا۔ مشہور ماہر عمرانیات سِمل (Simmel) نے اپنے مجموعے (The Sociology of Simmel) میں صفحہ ۹-۱۸۶ اور صفحہ ۶۷-۲۵۰ پر بڑی سیر حاصل بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ قوانین کی پابندی ایک معاملہ ہے جسکی بابت حکومت اور رعایا میں ایک طرح کی لین دین کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حکومت کو رعایا سے یہ کہتی ہے کہ "دیکھو یہ قاعدے تمہارے لئے لازمی قرار دئے گئے ہیں۔ اگر تم ان کی پابندی کرو گے تو یقین رکھو کہ تمہارے اعمال کی جانچ انھیں کے مطابق کی جائے گی"۔ جب حکومت اس قسم کی جوابی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو رعایا سے قانون کی پابندی کی توقع کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

یہ جوابی ذمہ داری دو طرفہ ہوتی ہے:-

اگر قانونی نظم و نسق اور طریق عدل ہی انحطاط کی طرف مائل ہو جائے گو جوابی ذمہ داری کی کیفیت بالکل ہی مفقود کیوں نہ ہو پھر بھی رعایا کا اطمینان اور چین بہت متاثر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہٹلر کے زمانے میں جوابی ذمہ داری حکومت کی اور رعایا کی زوال پذیر ضرور تھی مگر نظام عدل بالکل ہی شکستہ نہیں ہوا تھا تاہم نظم و نسق اور انصاف رسانی کے معیار میں خاصا انحطاط آگیا تھا۔ ہٹلر کے دور کی اس کیفیت کا تفصیلی ذکر طلبا کو میرے مضمون میں ملے گا جو (The Sociology of Simmel) کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں (Positivism and Fidelity to Law). میں طبع ہوا ہے۔ جنگ

عظیم کے اختتام کے بعد اتحادیوں کے زیرِ اہتمام مغربی جرمنی میں جو نظامِ قانون اور عدالتیں بحال ہوئیں انھیں لازماً ایسے معاملات کے متعلق فیصلے صادر کرنے پڑے جو ہٹلر کے زمانے میں مکمل ہوئے تھے۔ ان فیصلوں میں خصوصاً جو کچھ مدت بعد تحریر کئے گئے۔ ججوں نے یہ نقطۂ نظر اختیار کیا کہ ہٹلر کی عدالتوں کے فیصلے کالعدم ضرور ہیں مگر اس وجہ سے نہیں کہ وہ ظالمانہ عہد کے کالعدم قوانین کے تحت صادر ہوئے۔ عدالتوں نے نقطۂ نظر یہ اختیار کیا کہ ہٹلر کے زمانے کے فیصلے یوں کالعدم ہیں کہ ججوں نے صحیح اور عادلانہ طریقے پر اُن قوانین کی پابندی نہیں کی جو انھیں کی حکومت نے نافذ کئے تھے۔ میرے مضمون میں اس نظریہ کا ذکر ضرور ہے مگر میرا جائزہ مکمل نہیں۔ نازی عدالتوں کی تجاویز کو کالعدم قرار دینے کی جن دو بنیادوں کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے ان کے متعلق طالبعلموں کو ایک اور مضمون (Dr. Pappe) کا ملے گا۔ یہ مضمون سنہ ۱۹۶۰ء میں (71, Harvard Law Review, p. 630) پر طبع ہوا ہے۔ مگر میرے خیال میں ڈاکٹر پاپے نے دونوں قسم کے فیصلوں میں منطقی فرق کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ نازی قوانین ہی میرے مسلّمہ اصول قانون سازی کے خلاف تھے اور کالعدم تھے، کیونکہ ان کی گنجلک عبارتیں اور اختیارات کی تقسیم عام قانونی مسلمات کے خلاف تھیں۔ فقط غلط تاویل کا اغراض، جس پر آج کل کی جرمن عدالتیں نازی فیصلوں کو کالعدم قرار دیتی ہیں زیادہ وقیع نہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ نازی قوانین کی جو تعبیریں آجکل کی جرمن عدالتیں کر رہی ہیں وہ زیادہ معتبر ہیں۔ خیر یہ مسئلہ تو بر سبیل تذکرہ نکل آیا ہمارا اصل موضوع تو یہ تھا کہ رعایا کی حالت بڑی کس مپرسی کی ہو جاتی ہے جب نظامِ قانون اور انصاف رسانی کی سہولتیں تو میسر ہوتی ہیں اور رعایا پابندی پر آمادہ بھی

مگر قانون سازی، اور اُس کے طریقِ نفاذ اور ملک کے عام نظم و نسق میں بیّن انحطاط اور بے اُصولی پیدا ہو جائے۔

اس قسم کے حالات کی چند کیفیتیں یوں بیان کی جا سکتی ہیں۔ نئے قوانین بالعموم شائع کئے جاتے ہیں اور ان کی تشہیر بھی مناسب طریقے پر ہوتی ہے مگر بعض اہم قوانین شائع ہی نہیں کئے جاتے۔ اگرچہ زیادہ تر قوانین بعد نفاذ مؤثر قرار دے جاتے ہیں مگر حکومت کے اس مسلمہ اختیار کا کہ وہ بعض قوانین کو تاریخ سابقہ سے بھی نافذ قرار دے سکتی ہے بڑی فیاضی سے استعمال کیا جاتا ہے، رعایا میں خود اعتمادی اور قانون میں یقین اور اعتماد باقی نہیں رہتا کہ نجانے کب حکومت کی مصلحت سے، معاملات اور افعال کے وقوع کے بعد، وہ خلاف قانون قرار دیدئے جائیں۔ جہاں حکومت سے وفاداری مشتبہ ہوتی ہے وہاں خاص فوجی عدالتیں قائم کر دی جاتی ہیں، جن کا واحد مقصد سزا دہی ہوتا ہے خواہ اس مقصد کے حصول میں اُنھیں قوانین کو نظر انداز ہی کرنا پڑے۔ حکومت جو ایسی ہو جیسی ہٹلر کی تھی اپنا منشا پورا کرتی ہے۔ لیکن یہ منشاء دراصل یہ نہیں ہوتا کہ رعایا کے مفاد کے لئے قانون اور قواعد کا احترام کرایا جائے بلکہ اس کے برعکس رعایا کو خوف زدہ کر کے اپنی بقا کا اہتمام پیش نظر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں قانون کا احترام ہی مجروح ہو جاتا ہے۔ خوف یہ ہی نہیں ہوتا کہ الکشن میں رائے دہندہ کا ووٹ شمار ہی نہ ہوگا بلکہ خوف یہ ہوگا کہ وہ رائے دہندہ کی رائے کے خلاف شمار کیا جائے گا۔ اس لئے گو بظاہر رعایا نہ قانون سے محروم رہتی ہے نہ ملک پر قانون کے فقدان کا الزام صحیح ہوتا ہے مگر قانون پر اعتبار ضرور متزلزل ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں آخر اس نظامِ قانون کا جو اعتماد کھو چکا ہے ساتھ بھی دیں یا نہیں۔ بالکل یہی نقشہ ہٹلر کے

تحت جرمنی کا تھا کہ لوگ سوچنے لگتے کہ جتنا کچھ بھی قانون ملک میں موجود ہے اس کی پابندی کریں بھی یا نہیں۔

اِس قسم کے حالات میں کوئی معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا جس کے لحاظ سے یہ طے کیا جا سکے کہ رعایا کو قوانین کی پابندی کرنی چاہیے یا نہیں اور نہ ایسا کوئی معیار مقرر ہو سکتا کہ کب رعایا پر بغاوت اور انقلاب میں حصہ لینا فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن اس گفتگو میں ایک چیز بالکل صاف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک منتظم برسر اقتدار حکومت کو تسلیم کر لینے میں اور قانون کی سچی وفاداری میں بڑا فرق ہے۔ اوپر دیے ہوئے افسانے میں بادشاہ سلامت کی عزیز رعایا نے کبھی انقلاب اور بغاوت کا خواب بھی نہ دیکھا گو اُنھوں نے قوانین کی پابندی میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں لی، یہ نامہ در اصل آنجہانی کے طویل زمانۂ حکومت میں کوئی نظامِ قانون وجود ہی میں نہ آ سکا۔

قانون کی بالادستی کی آرزو

اب تک ہم جس موضوع پر بحث کرتے رہے وہ ان طریقوں کا تعین تھا جن سے کوئی منظم اور قابلِ احترام نظامِ قانون وجود میں نہیں آ سکتا لیکن ان طریقوں یا غلطیوں کو پیشِ نظر رکھنے سے قانون سازی کی وہ آٹھ بنیادی خوبیاں خوب سمجھ میں آ جاتی ہیں جن کے بغیر قانون کی بالادستی اور اس کا واقعی احترام ممکن نہیں۔ وہ ابتدائی اور لازمی اصول جن کے بغیر کوئی منظم معاشرہ اور قابلِ احترام نظامِ قانون وجود ہی میں نہیں آ سکتے، اگر اُن اُصولوں کو تعمیر اور ترقی کی بنیاد قرار دیا جائے تو انسانی صلاحیتوں کو پوری طرح اجاگر ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور یہ صورت فلاحِ انسانی کے لئے ایک مستقل دعوت بن جاتی ہے۔ اچھے نظامِ قانون کی بہترین تشکیل تو ایک ایسا فرضی نظام ہے جس کی خوبیاں سوچی

سمجھی تو جا سکتی ہیں مگر عدیم الوقوع ضرور ہوں گی۔ معاشرے کی اس خیالی معراج میں احکام صاف اور بلا ابہام ہوں گے، تضاد نام کو نہ ملے گا۔ ہر شخص ان سے پوری طرح واقف ہوگا اور کوئی قانون کسی تاریخ سابقہ سے نافذ یا واقعات سابقہ سے متعلق نہ سمجھا جائے گا۔ قوانین اور احکام بلا لحاظ وقت اور مواقع مستقل اور مقرر ہوں گے۔ ان پر عمل امکان سے باہر نہ ہوگا، اور پولیس، عدالتیں اور انتظامیہ ان کی حرف بہ حرف پابندی کرتی ہونگی۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ یہ مثالی نظام قانون جس میں اچھے قانون کے آٹھ بنیادی اصول پوری طرح کار فرما ہوں اور جو اُن آٹھ برائیوں سے جن کا ذکر ہوا یکسر پاک ہو، ایسے نظام قانون کی تشکیل کی فکر کوئی بہت مستحسن اور کارآمد بات نہ سمجھی جا سکے گی۔ قانون کے مکمل اور محکم ہونے کا مسئلہ ان مبادیات سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ جن آٹھ خرابیوں اور اُن کے بالمقابل جن آٹھ خوبیوں کا ہم نے تذکرہ کیا ان کو اچھی قابلِ عمل قانون سازی میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہر قانون کو اُسکی خوبی کا معیار مقرر کرنے کے لئے ان بنیادی نکات سے جانچے بغیر چارہ نہیں۔

اپنی کتاب کے پہلے باب میں میں نے اخلاقی فرائض اور مثالی اخلاق کے درمیان جو فرق ہے وہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے وہاں بتلایا ہے کہ اگر ہم اخلاق کی کوئی اسکیل، جیسے اخلاق پیمائی کہئیے، مقرر کریں تو انتہائی ضروری اور بالکل بدیہی اخلاقی ذمہ داریاں اس پیمانے کے سب سے نچلے سرے پر ہونگی اور جتنا جتنا اخلاقی پیمانے پر ترقی کی طرف معیار بلند ہوتا جائے گا اسی تناسب سے عمل میں خوبی، اور صلاحیت عمل کے پورے جوہر نمایاں ہوتے چلے جائیں گے اور حسن عمل کے تقاضے بڑھتے جائیں گے۔ میں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ اس معیارِ عمل کے پیمانے میں ایک نقطہ ایسا ہوتا ہے جس کے بعد

ذمہ داری اور فریضہ کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور عمل انسانی، معیاری اور حُسنِ اخلاق کی حدود میں پہنچ جاتا ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شخصِ متعلقہ نے اپنا فرض ادا کیا، بلکہ اُس کے عمل کو حسنِ اخلاق اور اوصافِ حمیدہ کا درجہ مل جاتا ہے۔ انسان پر فریضے کا بوجھ نہیں رہتا، بلکہ اخلاقِ اعلیٰ کی دعوت پیشِ نظر رہتی ہے۔ قانون کے پسِ منظر میں جو اخلاق کارفرما ہے یا وہ اخلاق کا نظام جسے ملک کے قانون کا درجہ حاصل ہے اس کی تہہ میں بھی بطورِ بنیاد کے عمل کی اسی طرح تقسیم اور درجہ بندی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور قانونِ ملکی میں بھی فرائض اور حسنِ عمل کی ایسی ہی بنیادی تقسیم موجود ہوتی ہے۔ قانون میں اسی طرح کے مماثل معیار یوں مقرر ہوتے ہیں اور مسئلہ یہی درپیش رہتا ہے کہ فرائض کی سرحد کہاں تک ہے جس کے ترک پر سرزنش ہونی چاہیے۔ گویا جن کی ادائی کوئی کارنامہ نہیں۔ اور کہاں سے حسنِ عمل کی حدود شروع ہو جاتی ہیں اور آدمی تعریف کا مستحق قرار پاتا ہے یا اعلیٰ معیار تک نہ پہنچنے پر متاسف ہوتا ہے۔ ہمارے پہلے باب کی متذکرہ تمام کیفیتیں جو وہاں اخلاقِ عامہ سے متعلق تھیں قانونِ ملک سے بھی متعلق کی جا سکتی ہیں، مگر کچھ بنیادی تفاوت اور فرق ہمیشہ ملحوظ رکھنے ہوں گے۔ قانون کی تہہ میں جو اخلاقی نظریات کارفرما ہوا کرتے ہیں اُن میں بعض خصوصیات ہیں جو عام معیارِ اخلاق سے الگ ہیں۔

ایک وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ فرائض کی خود دو قسمیں ہیں۔ وہ فرائض جو کسی خاص ذات سے متعلق یا کسی خاص تعلق کی بنیاد پر عائد ہوتے ہیں وہ مثبت قسم کے ہوتے ہیں اور وہ فرائض جو معاشرے کے فرد کی حیثیت سے انسان پر لازمی قرار پاتے ہیں۔ دوسرے قسم کے فرائض جو معاشرے کی جانب سے انسان پر عائد ہوتے ہیں وہ منفی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں دراصل ترکِ عمل

یا ترکِ مضرت کو دخل ہوتا ہے۔ قتل نہ کرو۔ ضرر نہ پہنچاؤ۔ دھوکہ اور دغا سے بچو۔ تہمت نہ لگاؤ۔ بدنام نہ کرو۔ یہ اچھے معاشرے کے عائد کردہ عام فرائض ہیں۔ ان فرائض کی بہ آسانی اصطلاحیں وضع کر کے تعریفیں مقرر کی جا سکتی ہیں۔ اس قسم کے عمومی فرائض، یا معاشرتی ذمہ داریاں خواہ اخلاقی ہوں یا قانونی ایک مقررہ معیار سے جانچی جا سکتی ہیں اور بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ اُن سے آدمی عہدہ برآ ہو سکا یا نہیں۔ اگرچہ مقررہ معیار میں کسی قدر لچک ضرور ہوتی ہے مگر پھر بھی آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس طرح کے اعمال اور افعال سے اجتناب ضروری ہے۔ مگر عمومی اور معاشرتی ذمہ داریاں صرف منفی پہلو ہی نہیں رکھتی ہیں، یعنی قانون میں اخلاق کے جو اصول ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں وہ صرف یہ "نہ کرو" وہ نہ کرو تک محدود نہیں، اُن کا بھی مثبت پہلو ہوتا ہے۔ عمومی ذمہ داریوں کو جنھیں جو قانون عائد کرتا ہے اخلاقی ذمہ داریوں کی طرح معروف اور مشتہر ہونا چاہیے، ان میں ابہام نہ ہو بلکہ احکام واضح ہوں، ان کی مسلسل اور بلاچون وچرا پابندی کی جاتی ہو اور کرائی جاتی ہو۔ اِن مثبت پہلوؤں کو عملی شکل دینے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ صرف عمل کے اجتنابی پہلو پر ہی زور نہ دیا جائے بلکہ اس کے ایجابی معیار، بلند مقرر کئے جائیں۔ قانون کا اخلاقی پس منظر اس کا متقاضی ہوتا ہے کہ صرف منع کی ہوئی چیزوں یا حرکتوں سے اجتناب ہی ضروری نہیں بلکہ عمومی قانونی ذمہ داریوں کو بھی اعلیٰ معیار اور حسنِ عمل کی بلندی پر ادا کیا جائے۔

قانون کی بنیاد جس اخلاقی معیار پر مستحکم اور قایم ہوتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ قانون میں تعمیری اور ایجابی احکامات زیادہ ہوں۔ اسی لئے قانون کو صرف فرائض کے تعین تک محدود رکھنا کچھ زیادہ مفید نہ ہو گا۔ یہ ایسا کلیہ ہے جو قانون اور عام اخلاق دونوں پر منطبق ہوتا ہے اور محض فرائض کی وضاحت کا نظریہ ایک جامد

نظریہ ہے۔ اِنسانی کوششوں میں سے بہت سی کوششیں پسندیدہ ہوتی ہیں لیکن اگر آپ کسی سعی یا کوشش کو فریضے کا درجہ دیں تو آپ کے سر یہ ذمہ داری بھی پڑے گی کہ آپ وہ درجہ یا نقطہ بھی مقرر کردیں جس کی عدم تکمیل کو ناکامی اور ترکِ فرض کا درجہ یا نقطہ کہا جائے گا۔ بہ الفاظِ دیگر تکمیل اور عدم تکمیل فرض کا معیار مقرر کرنا ہوگا۔ یہ بڑی ذمہ داری ہے۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ قانون ساز کے لئے لازمی ہے کہ وہ واضح قوانین وضع کرے جس میں شک اور شبہ کا امکان نہ ہو اور لوگ بہ آسانی اُنھیں سمجھ سکیں۔ لیکن یہ بات ایک نصیحت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر ہم "صاف اور واضح" کا معیار مقرر نہ کریں اور "صاف اور واضح" کا معیار بھی ہے کہ ترکِ فرض کا صحیح مرحلہ اور نقطہ معین اور شبہ سے پاک ہو۔ صفائی اور وضاحت قوانین کا لازمی وصف ہیں۔ اور مقنن کی کوششوں کو اسی سمت میں جاری رہنا چاہیے لیکن مقنن کی کامیابی یا ناکامی کسی بندھے ٹکے معیار اور پیمانے سے ناپی نہیں جا سکتی۔ مقنن کوشش کرتا رہے کہ قانون واضح ہو مگر اس کی کامیابی کچھ غیر معین سی شئے ہے۔ محض اس کی نیت سے کہ قانون واضح ہو، قانون واضح نہیں ہوا کرتا۔ محض نیک نیتی کامیابی کی ضامن کبھی بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ بالکل قرینِ عقل ہے کہ باوصف جہد و کوشش ریاضی کی طرح "درست اور واضح" کا "معیار" موضوعہ قوانین کی حد تک مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے قانون میں اندرونی طور پر اخلاق کی کارفرمائی کا معیار فرائض کی تکمیل کے معاملے تک محدود نہیں بلکہ حسنِ اخلاق کے پیمانے سے جانچا جائے گا۔ قانون کو اچھا اور مکمل اسی صورت میں کہا جائے گا جب وہ "فرض شناس" کے مرحلہ سے بڑھ کر "امانت دار" اور "حسن کار" کے معیارِ عمل کا طلب گار ہو۔ چونکہ قانون کے الفاظ کی پابندی کے علاوہ اُس کی روح اور اخلاقی تقاضے کی تکمیل بھی ضروری ہوتی ہے،

اِس لئے قانون، اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کی بنیاد پر ہی وضع کیا جانا چاہیئے۔ لیکن اعلیٰ ترین تقاضوں کو الفاظ میں محدود اور مقید کرنے کی راہ میں ایک چیز اور حائل ہو جاتی ہے، اور وہ یہ شرط ہے کہ قانون عام طور پر مشتہر اور معلوم ہو۔ یہ ایسی شرط ہے جس کے پورے کرنے کو بعض ضوابط مقرر کرنے ہوتے ہیں۔ اور ضوابط کی پابندی ایک بڑی ہی سطحی چیز ہے۔ ہر ملک کا دستور عام طور سے قانون کی اشاعت کا طریقہ مقرر کرتا ہے۔ اور عام اخلاق کا بھی تقاضا ہے کہ جب عوام کو کسی قاعدے کا پابند کرنا مقصود ہو تو وہ قاعدہ عوام کو معلوم اور عام طور پر مشتہر بھی ہو۔ لیکن یہ ذمہ داری اگر محض رواج اور عام اخلاق کے تقاضے پر چھوڑ دی جائے تو ادا نہ ہونے کی صورت میں کیا خاص گرفت ہو سکے گی۔ لیکن اگر ملک کے دستور میں نفاذ اور اشاعت کا طریقہ، وقت اور مقام معین کر دیئے جائیں تو پھر عوام کو اور عوام کے علاوہ وکلاء کو یہ معلوم ہو گا کہ قانون کہاں سے معلوم کیا جا سکتا ہے اور یہ یقین رہے گا کہ اگر دستور کے طریقۂ نفاذ و اشاعت کی پابندی نہیں ہوئی تو قانون ناقص رہا۔ بہر حال جہاں اندرونی طور پر قانون کو اعلیٰ معیارِ اخلاق کے حصول کی کوشش کرنی ہوتی ہے، وہیں چند بیرونی ضابطوں کی پابندی سے بھی قطع نظر ممکن نہیں، گو ان ضابطوں کا تعلق براہِ راست معیارِ اخلاق سے دُور کا بھی نہیں۔

اِسی مماثلت سے یہ کلیہ بھی بطور ضابطہ وضع تو ہو سکتا ہے کہ کوئی قانون نفاذ کی تاریخ سے ماقبل زمانے سے متعلق نہیں ہونا چاہیئے مگر ذرا غور کرنے پر محسوس ہو گا کہ ایسا کلیہ قاعدہ بعض صورتوں میں بڑی ضروری اور جائز ترمیم اور ضروریات کو نظر انداز کر کے ہی وضع ہو سکتا ہے۔ بعض وقت حالات کی تبدیلی اتنی واضح اور مقتضائے انصاف اتنا بدیہی ہوتا ہے کہ بغیر قانون کو ترمیم اور تبدیل کئے اور بلا اُسے زمانہ ماقبل سے متعلق کئے تلخیوں اور ناانصافیوں کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ یہ

نیچ ہے کہ عام حالات میں جو قانون آج بنایا جائے اسے آئندہ زمانے سے ہی متعلق کرنا قرینِ انصاف ہوگا لیکن بعض صورتوں میں جیسا کہ اشارہ کیا گیا، اس کلیے سے انحراف ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح سے یہ سادہ اور آسان اصول، قانونی مسائل میں بے حد پیچیدہ اخلاقی الجھنیں پیدا کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نفاذ کی حد تک تو ضابطے مقرر ہو سکتے ہیں اور ہونے چاہئیں کیونکہ اس کا تعلق قانون کے معلوم ہونے اور نہ ہونے سے ہے مگر اس کے علاوہ قانون بنانے کے متعلق اور پابندیاں عائد کرنا بہت مشکل ہے اور یہ ملک کے دستور اور عدالتوں کی صوابدید پر چھوڑنا پڑے گا کہ وہ چند معقول پابندیوں اور معقول تعبیروں سے انصاف کا خون نہ ہونے دیں۔ مگر زیادہ زور اس پر نہیں دیا جا سکتا کہ ان معاملات میں کوئی ناقابلِ تبدیلی اور بے لچک معیار مقرر کر دیں کہ قانون کس طرح وضع کیا جائے اور اس میں کیا کیا لازمی اجزاء ہوں جن کے بغیر وہ کالعدم اور ناقابلِ تعمیل سمجھا جائے گا۔

قانون اور معاشی فوائد

میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں یہ واضح کیا ہے کہ جب معیار اخلاق، فرائض سے شروع ہو کر حسنِ اخلاق اور اخلاقِ حسنہ کی طرف ترقی کرتا ہے تو ہمارے لئے اپنے عمل کے متعلق فیصلہ کرتے وقت، کم سے کم وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا معاشی اصول پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یعنی ہماری راہِ عمل نہ صرف اخلاقِ حسنہ کے معیار پر پوری اترے بلکہ اس سے دوسرے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ اگر آدمی کو صرف فرض ہی ٹالنا ہے تو پھر اس میں دوسرے کے مفاد میں کمی یا زیادتی کا کیا سوال ہے۔ لیکن اگر ہمیں اخلاق کی اعلیٰ ترین بلندی پر پہنچنا ہے تو ہمارے عمل سے

دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچنا چاہیے اور یہ خیال ہمارے عمل کا ایک لازمی جزو ہونا چاہیے۔

قانون کے بھی دو پہلو یعنی داخلی اور خارجی تقاضے ہوتے ہیں اور جب اِن دونوں میں کشمکش ہو تو پھر یہ بات آسانی سے ثابت کی جا سکتی ہے کہ معاشی فوائد کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے، مثال کے طور پر قانون کا داخلی تقاضا تو یہ ہے کہ قوانین ہمیشہ قائم و دائم رہیں اور وقت کے ساتھ ان میں ردّ و بدل نہ ہو لیکن عملاً یہ ممکن نہیں، حالات بدلتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی انسانی شعور بھی اور پھر یہ مطالبہ بھی سامنے آتا ہے کہ قانون اور اس کے مقاصد بدلے جائیں۔ بعض اوقات اس قدر تیزی سے تبدیلیاں ہوتی ہیں کہ انتشار پیدا ہونے لگتا ہے، ایسی صورتِ حال میں بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ راہِ اعتدال اختیار کی جاتی ہے کیونکہ نہ تو تبدیلی کو یکسر رو کا جا سکتا ہے اور نہ آئے دن کا ردو بدل اچھا ہوتا ہے، بہر حال جو راستہ بھی اختیار کیا جاتا ہے اس کا سبب محض یہ نہیں ہوتا کہ وہی صحیح راستہ ہے بلکہ یہ بات بھی پیش نظر ہوتی ہے کہ انتہا پسندی میں جو خطرات لاحق ہوتے ہیں اُن سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

قانون کے داخلی تقاضوں میں بھی باہمی آویزش کا امکان رہتا ہے مگر زیادہ واضح نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خود اخلاق کے عناصرِ ترکیبی میں تضاد پیدا ہو جائے، چنانچہ یہ بھی ضروری ہے کہ قوانین اپنی جگہ مستحکم رہیں۔ وقت کے ساتھ باقی رہیں اور ان کی پابندی اور تعمیل میں کوئی غیر معمولی رکاوٹیں حائل نہ ہوں۔ لیکن حالات کی تبدیلی کے ساتھ قانون پر بھی اثر پڑتا ہے۔ مثلاً افراطِ زر کی کیفیت پیدا ہو جائے تو ایک خاص قانون، جس پر پہلے آسانی سے عمل کیا جا سکتا تھا، ناقابل عمل بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی وہی راہِ اعتدال اختیار کرنی پڑتی ہے، جس میں کچھ خامیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن اس کے سوا اور کوئی

چارہ کار نہیں۔

مئی ۱۹۶۱ء میں میں جب پولینڈ گیا تو وہاں سابق وزیر انصاف سے میری ملاقات اور گفتگو ہوئی، یہاں میں اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وزیر انصاف نے (جو ایک خاتون تھیں) مجھے بتایا کہ کمیونسٹ حکومت کے ابتدائی دنوں میں اس بات کی منظم اور بھرپور کوشش کی گئی کہ ایسے قوانین اتنے واضح اور عام فہم بنائے جائیں کہ مزدور اور کسان بھی انھیں آسانی سے سمجھ سکیں۔ لیکن تجربے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ عام فہم قوانین بن تو سکتے ہیں لیکن بعض عملی دشواریاں ناگزیر ہیں۔ کیونکہ نظامِ قوانین میں ایک قانون دوسرے سے متعلق اور مربوط ہوتا ہے اور تمام قوانین باہم مربوط ہو کر ہی نظامِ قانون کی تشکیل کرتے ہیں اور جب تک یہ ربط اور مطابقت نہ ہو ان کی تعبیر و تشریح عدالتوں سے نہیں ہو سکتی۔ عدالتوں کے لئے ضروری ہے کہ قوانین آسان ہونے کے بجائے مربوط اور جامع اور مکمل ہوں۔ تجربے نے بتایا کہ آسان اور عام فہم قوانین میں ہمیشہ یہ خطرہ پوشیدہ رہتا ہے کہ عدالتیں اس کا نفاذ شخصی رائے سے کریں گی اور یہ بتانا مشکل ہوگا کہ کسی قانون کی تعبیر و تشریح کن خطوط پر کی جائے گی، کیونکہ اگر قانون کی زبان بالکل سادہ اور ناقابلِ تعین ہو تو اس کی کوئی بھی تشریح و توضیح ممکن ہے۔

اس قسم کی بے شمار مثالیں اور نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ بات تو سبھی مانتے ہیں کہ ایسے مثالی حالات تو دنیا میں کبھی اور کہیں بھی پیدا نہیں ہو سکتے جہاں قانون اور اخلاق کے سارے تقاضے بہ تمام طور پر پورے ہوتے ہوں۔ بہر حال یہ کوئی بڑا عیب اور عجیب بات نہیں ہے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں کسی بھی جدو جہد میں جب انسان بالکل ابتدائی زینے سے تکمیل کی منزلوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو کہیں نہ کہیں اُسے توازن اور اعتدال کا نقطہ معین کرنے کی مشکل حل کرنی

ہی پڑتی ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ قانون کے داخلی اخلاق کے آٹھوں تقاضوں کا الگ الگ جائزہ لیا جائے۔ اس راہ میں بعض سخت مقام بھی آئیں گے خصوصاً جب ہم قانون کی داخلی اور خارجی اخلاقیات کے تعلق کی بحث کریں گے تو ہم اس مسئلے پر بھی غور کریں گے کہ تاریخ میں قانون کی داخلی اخلاقیات کے تمسائل کیوں اور کس طرح نمودار ہوئے۔

قانون کی عمومیت

انسانی عمل کو کسی نہ کسی قسم کے قاعدے اور ضابطے کا پابند بنانا ضروری ہوتا ہے، تاکہ ایک منظم معاشرہ قائم و برقرار رہے۔ چنانچہ پہلی ضرورت تو یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ضابطے مرتب ہوں، گویا یہ ایک عام ضرورت ہے اور سبھی چاہتے ہیں کہ قاعدے قانون کے تحت زندگی بسر کریں۔

ماضی قریب میں ہمارے بعض تنظیمی اداروں کی طرف سے اس باب میں کوتاہی ہوئی ہے، اور وہ قانون اور قواعد کی ضرورت کو سمجھنے اور عام ضابطے مرتب کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مذکورہ بادشاہ سلامت کی طرح ان کا بھی یہی مُوقف تھا کہ رفتہ رفتہ یعنی ہزاروں تجربوں اور مناقشوں کے تصفیے کے بعد ان میں ایسی بصیرت پیدا ہو جائیگی کہ وہ فیصلے کے لئے عام معیار متعین کر سکیں گے بیشتر حالات میں یہ توقع بالکل پوری نہ ہو سکی۔ مثلاً شہری ہوابازی کے بورڈ اور مواصلات کے وفاقی کمیشن نے یہ اُمید پوری نہیں کی۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ ان اداروں کو جس قسم کا کام سونپا گیا تھا وہ اس راہ میں حائل ہوا۔ یہ ادارے نجی تصفیوں سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ان ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو ایک مربوط نظام قواعد مرتب کرنے کی کوششوں کے معاملے میں یہ ادارے

بالکل ناکام رہے ہیں۔

اِن اداروں کے خلاف جو جو شکایت ہے وہ یہ نہیں کہ ان کے قاعدے اور ضابطے غیر منصفانہ ہیں بلکہ یہ کہ انھوں نے کوئی معقول ضابطہ بنایا ہی نہیں۔ یہ امتیاز اس لئے ضروری ہے کہ عمومیت کے تقاضے کا اکثر یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ قانون کا اطلاق غیر شخصی طور پر ہونا چاہیے یعنی قوانین کا اطلاق تمام طبقوں پر یکساں ہونا چاہیے اور انھیں مخصوص نہیں ہونا چاہیے۔ دستور میں بھی "پرائیویٹ قوانین" اور "استثنائی قانون سازی" کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور اس میں بھی وہی عمومیت کا اصول کارفرما ہے۔ لیکن دستور میں جس اصول کا دفاع کیا گیا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ قانون اور انصاف کے معاملے سب برابر ہوں، اور تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق قانون کے خارجی اخلاق سے ہے۔

یہ اُصول، قانون کے داخلی تقاضے سے اس معنی میں مختلف ہے کہ داخلی تقاضا یہ ہے کہ قاعدے اور ضابطے موجود ہوں، خواہ وہ منصفانہ ہوں یا غیر منصفانہ۔ یعنی یہ بالکل ممکن ہے کہ قانون اور قواعد کا موضوع ایک فردِ واحد ہو اور جس میں دوسرے چند یا نامزد لوگوں کے ساتھ ہی اسکے طرزِ عمل اور رویے کی تشریح کی گئی ہو مثلاً مالک، آجر اور مزدوروں کے آپس کے تعلقات اور برتاؤ کو منظم کرنے کیلئے قواعد اور دستور العمل بنائے جانے اور ضروری ہیں۔

اگر کوئی کارخانہ دار یہ چاہتا ہے کہ اُسے مزدور کے سر پر ہر وقت کھڑا نہ رہنا پڑے اور مزدوروں کے ہر فعل اور عمل کی رہنمائی نہ کرنی پڑے تو پھر یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ بعض اصول اور ضابطے مرتب کرے اور اُن کے طرزِ عمل کی رہنمائی کے لئے بعض عام قواعد تیار کرے۔ اس کوشش میں اُسے ناکامی کی اُن تمام راہوں سے گزرنا ہوگا جو بادشاہ سلامت نے طے کی تھیں۔ ممکن ہے کہ وہ عام ضابطے نافذ کرنے میں ناکام ہو جائے اور کامیاب بھی ہو تو انھیں مزدوروں کے ذہن نشین

کرانے میں کامیاب نہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اگر کارخانے دار قابل عمل ضابطوں کا ایک نظام مرتب کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اُسے یہ پتہ چلے گا کہ یہ کامیابی اُسے اُس قیمت پر حاصل ہوئی ہے کہ وہ خود بھی بعض ضابطوں کا پابند ہو گیا ہے۔ اس کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ اس نجی قانون سازی میں محنت اور عقل استعمال کرے بلکہ اس کی کامیابی بھی خود اس کی آزادیِ عمل کو محدود کر دے گی۔ اگر وہ تعریف و تحسین اور تنقید یا انعام اور جرمانے کے اپنے بنائے ہوئے اصولوں سے رُوگردانی کرے تو اُسے معلوم ہو گا کہ اس کے مجموعہ قواعد کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور جب تک وہ اپنے عمل میں انقلابی تبدیلی پیدا نہ کرے گا اُسے ان ضابطوں سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔

انسانی عمل کو باضابطہ بنانے کے لئے جو نظام بھی تشکیل دیا جائے گا اس میں ایک عام اصول ضرور کارفرما رہے گا۔ ایک معمولی سی خواہش یا حکم کی تکمیل کے لئے بھی کچھ نہ کچھ عمومیت اور وسعتِ عمل لازم ہے۔ مثلاً اگر ایک کتّے کو تربیت دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ "ہاتھ ملاؤ" تو اس میں بھی مالک اور کتّے کے درمیان کچھ نہ کچھ وسعتِ عمل اور عمومیت کا عنصر ضروری ہے۔ کتا پہلے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ ہاتھ ملانے کے عام حرکات و سکنات میں کس خاص انداز کی حرکتیں اختیار کی جائیں، اس کے بعد ہی وہ حکم کی تعمیل کر سکے گا۔ یہی کتا جب پُوری طرح تربیت یافتہ ہو جاتا ہے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ کس خاص طریقے کا مصافحہ کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اکثر یہ بھی ہو گا کہ وہ امکانی حکم کے پیش نظر، وقت سے پہلے ہی اپنے پنجے کو اُوپر اُٹھانے کے لئے آمادہ نظر آئے گا۔ انسانی عمل میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے اور جب حکم دینے کے مجاز لوگ عام قواعد و ضوابط نافذ کرنا نہیں چاہتے تو بھی یہ عمومیت کارفرما رہتی ہے۔ لیکن اگر اس عمومیت کے اصول کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا

نتیجہ یہی ہو گا کہ بہت سے نظامِ قانون اس اصول کی عمومیت کی نعمت سے محروم ہو جائیں گے جیسا ہم آجکل بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اصول قانون کی کتابوں میں اس عمومیت کے مسئلے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ آسٹن نے درست کہا تھا کہ نظام قانون سیاسی اقتدار کے حکمناموں کا بے رنگ مجموعہ نہیں بلکہ اس سے بڑھکر ہوتا ہے۔ لیکن خود اس کے عام اور خاص احکام میں امتیاز قائم کرنے کی جو کوششیں کیں وہ انتہائی گمراہ کن اور اس کے نظام سے قطعی غیر متعلق تھیں اور اس کا اثر اینگلو امریکی قانونی ادب پر بہت ہی گہرا پڑا اور اس غلط نقشِ اول کے اثرات کو اب تک مٹایا نہیں جا سکا۔

غالباً آسٹن کے تجزئے کا بنیادی نقص یہ تھا کہ وہ دو سوالوں میں حدِ امتیاز قائم کرنے میں ناکام رہا اور وہ سوالات یہ ہیں:۔

(۱) قانونی ضابطوں کے ایک مؤثر نظام کے لئے بنیادی شرطیں کیا ہیں؟

(۲) ہم "قانون" کس چیز کو کہیں گے؟

ہم نے اب تک جو بحث کی ہے اور عمومیت کی جو ضرورت بتائی ہے اس کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ انسانی عمل کو ضابطوں کے تحت لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام ضابطے موجود ہوں۔ اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ حکومت کے ہر اقدام کو، جو قانون کی قوت رکھتا ہو، (مثلاً کسی خاص مدعا علیہ کے خلاف عدالت کی ڈگری) ایک عمومی اصول مان لیا جائے، نہ اس بات ہی کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اگر کسی شہر میں محصول وصول کرنے کے لئے دفتر قائم کرنے کی غرض سے کوئی حکم جاری کیا جائے تو اسے قانون کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ تو لفظی ہیر پھیر ہوا۔

نفاذ

اب یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ قوانین کا نفاذ کس طرح ہو، یہ بہت پرانا مسئلہ ہے اور آج تک قائم ہے۔ روم میں پلیبس (Plebs) کی علیحدگی کے زمانے سے یہ مسئلہ درپیش ہے اور شاید اس سے بھی پرانا ہو۔[1] یہ مسئلہ اہم اور فوری اہمیت کا حامل ہے اور ایک بات تو واضح ہے کہ اس میں بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کی بھلائی کا اصول ہی کارفرما ہے۔ یہ کوشش تو بے سود اور احمقانہ ہوگی کہ ہر شہری کو ہر قانون کی تفصیلات اور اس کے مضمرات سے آگاہ کیا جائے، اور یہ بتایا جائے کہ کون کون سے قوانین کا اطلاق اس پر ہو سکتا ہے یعنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ان سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ اگرچہ بنتھم (Bentham) کا یہ نظریہ کچھ اس قسم کا تھا کہ سب لوگوں کو قانون سے پوری طرح واقف کرانا چاہیے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں۔

اس قسم کی تفہیم کی ضرورت کا انحصار اس پر ہے کہ عام طور پر لوگوں کے ذہن میں صحیح اور غلط، حق اور باطل کا جو تصور ہے اس میں اور قانون کے تقاضوں میں کس قدر اختلاف ہے۔ قانون سازوں نے تاریخ کے ہر دور میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے کہ عوام کے خیالات کیا ہیں اور قانون کے بارے میں ان کا اپنا معیار کیا ہوگا۔ اگر قانونی اور اخلاقی تقاضوں میں ہم آہنگی ہو تو یہ اعتراض بے وزن ہو جاتا ہے کہ قانون کسی ضابطۂ اخلاق کی نفی کرتا ہے اس لئے اس کی تعمیل مشکل ہے۔

نفاذ کا مسئلہ اس سوال سے اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ "ہم دراصل کس

---

[1] مشہور انگریز مقنن آسٹن نے 'بلا چون و چرا' یہ کسی قدر نامناسب نظریہ جس کا انگلستان میں رواج ہے قبول کر لیا ہے کہ پارلیمنٹ کا منظور شدہ قانون نافذ اور مشتہر سمجھا جائے گا۔

چیز کو قانونًا "نفاذ" قرار دیں گے"؟ فیصلے صادر کرنے والے ادارے، خصوصاً انتظامی نوعیت کے ٹریبونل یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اختلافی معاملوں میں وہ جن قاعدوں کا اطلاق کرتے ہیں انھیں شائع کر دینا چاہیے۔ لیکن داخلی ضابطۂ کار کے قاعدوں اور ضابطوں کے سلسلے میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال تجربے کار وکیل جانتے ہیں کہ مقدمات کے نتائج کے بارے میں پیش گوئی کے لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف قانونی ضابطوں کا علم ہو بلکہ یہ جاننا بھی لازم ہے کہ ان ضابطوں کے اطلاق کے لئے کیا راہِ عمل اختیار کی جاتی ہے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ اور میکسیکو میں بعض عدالتوں کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ عدالتی کارروائی کے علاوہ آخری رائے قائم اور تحریر کرنے کے مدارج عوام کے سامنے طے کریں۔

تھرمن آرنالڈ (Thurman Arnold) نے جس فرد کو "حقیقت پسند" کے نام سے یاد کیا ہے ممکن ہے وہ قانون کے نفاذ کے بارے میں یہ کہہ بیٹھے "قانون کا کیا ہے" ہزارہا قوانین ہیں اور عام شہری ان میں سے چند ہی قوانین سے واقفیت رکھتا ہے۔ آخر تمام قوانین کو مشتہر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ضابطۂ فوجداری کا مطالعہ کئے بغیر بھی لوگوں کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قتل کرنا اور چوری کرنا جرم ہے۔ جہاں تک دیگر پیچیدہ قوانین کا تعلق ہے اُن کا مکمل مسودہ چھپوا کر ہر چوراہے پر تمام راہگیروں کو تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے ایک فی صد آدمی بھی انھیں پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے۔" اب اسی ایک سوال کے کئی جوابات دئے جا سکتے ہیں۔ اگر سو میں سے ایک آدمی بھی یہ زحمت گوارا کرتا ہے کہ اُسے اپنے شعبۂ زندگی کے متعلقہ قوانین سے واقفیت ہو جائے تو پھر قوانین کو عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر لوگ قوانین کی جو پابندی کرتے ہیں اُس کا سبب یہ نہیں کہ وہ براہِ راست قانون سے واقف

ہوتے ہیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ باخبر لوگوں کی سرگرمیوں اور طرزِ عمل کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور خود بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح قانون کا براہ راست علم تو صرف چند افراد کو ہوتا ہے لیکن بالواسطہ طور پر بہت سے لوگوں کے عمل پر اس کا اثر پڑتا ہے اور وہ قانون کے دائرے کے اندر رہ کر ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قوانین کی اچھی طرح تشہیر ہونی چاہیے تاکہ لوگ اگر چاہیں تو ان پر تنقید بھی کر سکیں اور یہ بھی بتا سکیں کہ ایسے قوانین کے لئے یہ ضروری ہے کہ جن کے بارے میں یہ قوانین ہیں انھیں ان کی تفصیلات سے واقف کرانا لازم ہے ورنہ ان پر عمل درآمد نہ ہو سکے گا۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ قانون پر عمل اور اس کا نفاذ کرانے والے بھی خلاف قانون طرزِ عمل اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کی روک تھام کے لئے بھی ضروری ہے کہ قوانین آسانی سے دستیاب ہوں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔ آخری بات یہ کہ جدید زمانے کے بیشتر قوانین ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص شعبے یا کاروبار سے متعلق ہوتے ہیں، اس لئے اگر عام شہری ان سے واقف نہ ہوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ثابت یہ ہوا کہ قوانین کی اشاعت تو ضروری ہے مگر یہ توقع کرنا بھی زیادتی ہے کہ جب بھی قوانین شائع ہوں گے تو ہر شہری انھیں پڑھنے کی زحمت اُٹھائے گا۔ ظاہر ہے اس قسم کی اُمید رکھنا محض نادانی ہے۔

سابق الاثر یا سابق العمل قوانین

امریکی آئین میں سابق العمل قوانین پر خاصی بحث کی گئی ہے[1]، اور بعض ریاستوں کے دستور میں بھی اس پر روشنی ڈالی گئی ہے[2]۔ ان کھلی ہوئی ممانعتوں کا جو قانونی اثر ہے اس کے علاوہ سابق العمل یا سابق الاثر قوانین کے جواز کا

---

[1] مثلاً آئین امریکہ آرٹیکل ۱ دفعات ۹ اور ۱۰۔

[2] مثلاً نیو ہیمپشائر کے دستور کا حصہ اول دفعہ ۲۳۔

مسئلہ اس لحاظ سے طے ہوتا ہے کہ ایسا قانون، قانون سازی کے معروف ضابطے کی پابندی کر کے بنایا گیا ہے یا نہیں۔ میں آئینی قانون کی اس شق کی موشگافیوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس کے بجائے میں بعض ان مسائل سے بحث کروں گا جن کا سابق العمل قوانین اور قانون کے دیگر عناصر سے تعلق ہے۔

کسی بھی نظام قانون میں اگر اور باتوں سے قطع نظر "محض قوانین کے بنانے اور نافذ کرنے کے معروف طریقوں کا لحاظ ہو تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ سابق العمل قوانین نہایت عجیب اور خطرناک چیز ہیں۔ قانون کا کام یہ ہے کہ انسانی عمل کو ضابطوں کا پابند بنائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آج کے عمل کا فیصلہ اُن قوانین کے مطابق ہوگا جو آئندہ نافذ کئے جائیں گے، یہ تو سراسر بے تکی بات ہے۔ اگر کسی نظام قانون میں محض سابق العمل قوانین ہی ہوں تو پھر وہ نظام محض قیاسی بن جائے گا" اور یہ ایسی مہمل بات ہوگی کہ کسی سے یہ پوچھا جائے کہ مکمل خلا میں ہوا کا دباؤ کتنا ہوگا۔

اور اگر اس قسم کے قوانین دانشمندی کے ساتھ نافذ کرنے ہوں تو پھر انھیں کسی ضابطے کا پابند اور کسی متوازن نظام قانون کا جزو ہونا چاہیے تاکہ اس کے بارے میں مناسب طور پر واقفیت رہے۔ بعض حالات ایسے بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ قوانین کا سابق تاریخوں سے نفاذ خاصا معقول اور مناسب عمل معلوم ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہو۔

ہر انسانی عمل میں کچھ خامیاں اور خرابیاں ہوتی ہیں اس لئے ممکن ہے کہ قانون کے داخلی اخلاق کے تقاضے، جو خاصے پیچیدہ ہوتے ہیں، پورے کرنے کی کوششیں کامیاب نہ ہوں، اور ان میں رکاوٹیں پڑیں۔ عام طور پر جب حالات بگڑ جاتے ہیں تو معاملے کو سدھارنے کے لئے سابق العمل قوانین کا سہارا

لیا جاتا ہے۔ حالانکہ قانون ہمیشہ وقت کے ساتھ قدم بڑھاتا رہتا ہے لیکن بعض اوقات یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہم ایک جگہ ٹھہریں، پیچھے مڑ کر دیکھیں اور ماضی کا حال سے تسلسل قائم کریں۔ فرض کیجیے کہ ایک قانون یہ جاری ہوتا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ کے بعد شادی کے سرٹیفکیٹ پر قاضی کے دفتر سے ایک خاص قسم کا سرکاری ٹکٹ چسپاں نہ کیا گیا تو شادی غیر قانونی ہوگی۔ جب قانون نافذ ہوا تو سرکاری چھاپے خانے میں کوئی خرابی ہوگئی اور مطلوبہ ٹکٹ دستیاب نہ ہوسکے۔ اب صورت حال یہ ہوئی کہ قانون تو نافذ ہوگیا لیکن اس کی اچھی طرح تشہیر نہیں کی گئی اور شادی کرنے والوں تک اور بعض قاضیوں تک اس کی اطلاع نہیں پہنچی اور ٹکٹ بھی دستیاب نہیں تھے کہ اُسے دیکھ کر لوگ جانیں اور ایک دوسرے کو بتا دیں۔ بہت سی شادیاں ہوگئیں اور ان کو قانون کی خبر بھی نہ ہوئی۔ بعض ناواقف قاضیوں نے نکاح پڑھائے اور وہ بھی ٹکٹ لگانے کے لزوم سے بے خبر ہی رہے۔ مجلس قانون ساز کا اجلاس بھی ختم ہوچکا ہے۔ پھر جب دوبارہ اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس نے ایک قانون منظور کیا جس میں اُن تمام شادیوں کو جائز قرار دے دیا جو سابقہ قانون کے تحت ناجائز ہوچکی تھیں۔ اب اس معاملے کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ دوسرے قانون کا سابق العمل ہونا قانون کے اُصول کو تو مجروح کرتا ہے لیکن اس طرح دو سابق قانونی غلطیوں کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے، کیونکہ پہلے قانون کے نفاذ کے وقت قانون سازی کے ان دو تقاضوں کو نظرانداز کردیا گیا تھا کہ جن لوگوں پر قانون کا اثر پڑتا ہو اُنھیں اس سے آگاہ کرنا چاہیے، اور قانون ایسے بنائے جائیں جو قابلِ عمل ہوں۔ عام طور سے قوانین کا مسودہ مرتب کرنے والے سابق الاثر قوانین کے نفاذ سے اس قدر خوف محسوس کرتے ہیں کہ وہ مسودے میں ایسی "اصلاحی" قانون سازی کی جیسی اوپر بیان کی گئی ہے گنجائش ہی نہیں رکھتے۔ ایسے مواقع پر عدالتوں کو اپنی تعبیر میں گنجائش پیدا کرنی

پڑتی ہے۔

اس مثال سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ سابق العمل قوانین کا ہمیشہ جواز ہوتا ہے یا کم از کم وہ بے ضرر ہوتے ہیں، اگر وہ سابقہ خامیوں کی تلافی ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہم یہاں روئم (Roehm) اور اس کے طرفداروں کے قتل عام کا جو حکم ۱۹۳۴ء میں ہٹلر نے نافذ کیا تھا اس کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہٹلر نے یہ دیکھا کہ روئم کے ساتھ نازی پارٹی کے کچھ ایسے عناصر جمع ہو گئے ہیں جو اس کی حکومت کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ ایک مطلق العنان کی حیثیت سے، ہٹلر کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ فرضی مقدمہ چلا کر انھیں مجرم گردانتا اور پھر پھانسی پر چڑھا دیتا۔ لیکن ہٹلر کے پاس اتنا وقت نہیں تھا اس لئے ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے یہ آسان نسخہ استعمال کیا کہ ایک ہی رات میں کوئی ایک سو مخالفوں کو گولی مار دی۔

برلن واپس پہنچتے ہی ہٹلر نے ایک قانون منظور کرایا جو سابقہ تاریخوں سے نافذ العمل قرار دیا گیا۔ اس طرح اپنے مخالفوں کے قتل عام کو جائز قرار دلوایا۔ اس کے بعد ہٹلر نے اعلان کیا کہ "روئم اور اس کے ساتھیوں کے مقدمے میں عوامی جرمن عدالت اعلیٰ کے فرائض خود میں نے انجام دئے۔" ہٹلر کا صاف مطلب و منشا یہ تھا کہ وہ عوام کو یہ باور کرائے کہ پورے معاملے میں صرف ذرا سی بے ضابطگی ہوئی، یعنی حاکم عدالت اعلیٰ کے ہاتھ میں قلم کی جگہ مستول تھا۔ ہٹلر نے اپنے ظلم اور لاقانونیت کو اس سطح پر لانے کی کوشش کی جہاں بطور جائز ہمارے سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں میں ایسی عبارتیں مل جائیں گی (مثلاً گرہیم بنام گوڈسل ۲۸۲ .U.S صہ۴۰۹ وصہ۴۲۹ ۱۹۳۰ء)۔ "یہ قانون ایک تعمیری اور انسدادی قانون ہے اور حکومت کے نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کرتا ہے۔"

سابق العمل قوانین کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ قانون کے داخلی اخلاق سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا بلکہ بعض اوقات جج کے منصب سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب باضابطہ نظام قانون موجود ہو تو قوانین کے معنی و مفہوم میں اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے کسی عدالت یا ادارے کی ضرورت ناگزیر نہیں۔ چھوٹے اور سیدھے سادے معاشرے ہیں جہاں سادہ قوانین نافذ ہوتے ہیں، اس قسم کے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر پیدا بھی ہوتے ہیں تو فریقین باہمی طور پر صلح و صفائی کر لیتے ہیں۔ اگر بعض چھوٹے چھوٹے اختلافات ختم نہ ہو سکیں اور کسی قدر باقی رہیں تو پورا نظام قانون کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔

میں اس بات پر زیادہ زور اس لئے دے رہا ہوں کہ عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ عدالتیں قانون کے بنیادی مقصد کی عکاسی کرتی ہیں اور وہ یہ کہ تنازعات کے تصفئے کرتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قاعدوں اور ضابطوں کی ضرورت محض اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ انسانی فطرت میں فساد ہے، انسان خود غرض اور جھگڑالو ہے۔ اگر معاشرے میں سب فرشتے رہتے ہوں تو پھر قاعدے قانون کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

بہر حال فرشتوں کا معاملہ تو آپ فرشتوں پر چھوڑیئے۔ اگر وہ اجتماعی زندگی بسر کر سکتے ہیں اور کسی قسم کے قاعدے قانون کے بغیر ہی اچھے کام اور کارنامے انجام دے سکتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ انھیں کسی قانون کی حاجت نہیں۔ اگر ایسے قاعدوں کے تحت کام کرتے ہیں جو جامد غیر رسمی اور وجدانی ہیں تو ایسی صورت میں بھی وہ قانون کی ضرورت سے بالاتر ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے ملکوتی فرائض مؤثر طور پر ادا کرنا چاہتے ہیں تو پھر انھیں "تشکیل شدہ" قوانین درکار ہوں گے۔ ایسے ضابطے درکار ہوں گے جو کسی واضح فیصلے کے تحت مرتب کئے گئے ہوں اور پھر انھیں ایسے ہی قوانین کی حاجت ہوگی

جن سے اس وقت بحث کی جا رہی ہے۔

اگر کسی بادشاہ کو ان کا حاکم بنا دیا جائے اور ان کے ضابطے مرتب کرنے کا کام اس کے سپرد کیا جائے تو اُسے بھی اُن عواقب سے بچنا ہوگا اور ان اُصولوں کا خیال رکھنا ہوگا جو قانون سازی کے لئے ضروری ہیں، خواہ پابندی کرنے والے سب فرشتے ہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات یہ دلیل پیش کریں کہ اس حالت میں کم از کم یہ صورت تو پیدا نہ ہوگی کہ سرکاری کارروائی اور نافذ العمل قوانین کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں، ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو اپنی فرشتہ رعایا سے یہ کہنے کی ضرورت پیش آجائے کہ اُس نے اُن کے طرزِ عمل کے لئے جو ضابطے مرتب کئے تھے اُن کے قطع نظر کوئی کام انجام دیں۔ اس صورت میں اُلجھاؤ پیدا ہو سکتا ہے اور عام قاعدوں کا اثر زائل ہو جائے گا۔

سیاسی اور معاشرتی دنیا میں ہزار جھگڑے ہوتے ہیں اور یہاں عدالتیں ایک اہم فرض انجام دیتی ہیں۔ کوئی بھی نظامِ قانون حرفِ آخر نہیں کہلا سکتا، خواہ ان قوانین کو جج اپنے فیصلوں سے مرتب کرے یا مجلس قانون ساز نافذ کرے، اس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی۔ جب کسی قانون کے معنی و مفہوم کے بارے میں تنازعہ کھڑا ہوتا ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس کے حل اور تصفئے کی صورت بھی رکھی جائے۔ عدالتی کارروائیاں اور ضابطہ کار اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

اب فرض کیجئے کہ ایک قانون کے مفہوم کے بارے میں زید اور بکر میں جھگڑا ہے۔ اور قانون کا تعلق دونوں کے حقوق سے ہے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جج دونوں فریقوں کے دلائل سُننے کے بعد اندازہ لگاتا ہے کہ ان

میں برابر کا وزن ہے۔ اب قانون کے اندر جج کو فیصلہ کرنے کا کوئی معیار دستیاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں کے دلائل یکساں طور پر وزنی ہیں۔ پھر بھی ہر قانون میں ایسے اُصول ضرور پوشیدہ ہوتے ہیں جو فیصلے پر پہنچنے میں معاون بنتے ہیں اور ان اُصولوں کے بارے میں نوے فی صد صورتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اگر جج کوئی فیصلہ نہیں کرتا تو وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکام رہے گا، گویا وہ قانون کے دائرے میں رہ کر تنازعات کا تصفیہ ہی نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسے مقدمے کا فیصلہ سنا دیتا ہے تو لازماً وہ اُصول قانون کی پابندی کرتے ہوئے ایک نئی تعبیر کرتا ہے جو سابقہ عمل اور معاملت کے متعلق ہوگی، گویا جج سابق الاثر یا سابق العمل قانون سازی کرنے لگتا ہے۔

بہر حال جج کو مقدمے کا فیصلہ تو کرنا ہی ہوتا ہے، اگر ہر مرتبہ کسی قانون کے معنی و مفہوم پر شبہات ظاہر کئے جائیں، بہ الفاظ دیگر جج کو اعلان کرنا پڑے کہ قانونی خلا پایا جاتا ہے تو اس صورت میں پورے نظام قانون کی عمارت ہل جائے گی۔ قانون پر اعتماد کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے لئے لوگوں کو نہ صرف یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ قوانین کو سمجھیں بلکہ انھیں اس بات کا یقین بھی ہونا چاہئیے کہ اگر قانون کے مفہوم کے متعلق کوئی تنازعہ پیدا ہو تو اس تنازعے کو حل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہے۔

متذکرہ بالا مفروضہ مقدمے میں سابق العمل قوانین کا نہایت معقول جواز موجود ہے لیکن ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا۔ اب دوسری مثال لیجئے۔ فرض کیجئے اُسی مقدمے میں، عدالت کسی قانون کے متعلق شکوک کی وضاحت نہیں کرتی بلکہ خود اپنی ہی کسی سابقہ فیصلے کو رد کر دیتی ہے۔ زید اور بکر کے مقدمے کی مثال اوپر دی جا چکی ہے، اب فرض کیجئے کہ عمرو اور خالد میں بھی یہی جھگڑا ہے

اور عمرو اس پر آمادہ نہیں ہے کہ زید اور بکر کے مقدمے کے فیصلے کی بنیاد پر اس کا جھگڑا بھی طے کیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنا مقدمہ عدالت میں لے جاتا ہے اور عدالت کو اس بات کا قائل کرتا ہے کہ زید اور بکر کے مقدمے میں عدالت کا فیصلہ غلط تھا اور اسے رد کر دینا چاہیئے۔ اب دوسرا فیصلہ سابق العمل ہے کیونکہ عمل سابقہ کے متعلق اس کا نفاذ کیا جاتا ہے اور لازماً خالد مقدمہ ہار جاتا ہے کیونکہ اس نے تو سابقہ فیصلے کی نظیر اپنے سامنے رکھی تھی جو واضح طور پر اس کے حق میں تھی۔ دوسری طرف، اگر زید اور بکر کے مقدمے کا فیصلہ غلط تھا اور مسترد ہو جانا چاہیئے تو عمرو نے ایک عوامی خدمت سرانجام دی کیونکہ اس نے غلط فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کیا اور عدالت کو مجبور کیا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ نئے فیصلے کا اطلاق عمرو اور خالد کے مقدمہ کے بعد ہو گا تو پھر یہ عمرو کے ساتھ صریحاً زیادتی ہو گی اور اسے اپنی خدمت کا یہ صلہ تو نہیں ملنا چاہیئے۔ اگر عدالت یہ فیصلہ کرے کہ سابقہ فیصلہ رد کیا جاتا ہے لیکن اب اس فیصلے کے بعد آنے والے مقدمات پر اس کا اطلاق ہو گا تو پھر کوئی شخص اس بات پر مائل نہ ہو گا کہ کسی سابقہ غلط فیصلے کو مسترد کرانے کی زحمت کرے۔ اور حالات واقعی بالکل بدل جانے کے باوصف بھی سابقہ فیصلے جوں کے توں قائم رہیں گے۔ یہاں پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اداروں کے مقدمات میں نظائر کے استرداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً لیبر یونین یا تجارتی انجمنوں کے معاملے میں کیونکہ قانون میں ترمیم و تنسیخ ترقی پذیر اداروں کیلئے مفید اور ضروری ہوتی ہے لیکن نجی افراد کے معاملات میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ قانون اور مقدمات سے ان کا تعلق مستقل اور مسلسل نہیں ہوتا۔

یہ بحث تو دیوانی مقدمات کی ہے لیکن فوجداری کے مقدمات میں اصول

اور صورتِ حال بالکل مختلف ہوتی ہے، اور اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ عدالت کسی مقدمے میں کسی خاص قانون یا اس کی دفعات کا اطلاق کرے اور بعد میں اپنا خیال بدل دے اور قانون کی تشریح دوسرے انداز سے کرے فوجداری فیصلوں کو سابق تاریخوں سے نافذ العمل قرار دیا جائے تو قباحت اور زیادتی ہو گی کہ کسی پرانے مقدمے میں جو شخص بری ہو گیا تھا وہ نئے فیصلے کی رُو سے مجرم قرار پائے گا کیونکہ سابقہ فیصلوں پر بھروسہ کر کے اس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اُسے نئے فیصلے کے تحت مجرمانہ قرار دیا جا چکا ہے۔

یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ فوجداری کے قانون کے اطلاق کے معاملے میں جب عدالت کو بعض پرانے تصفیہ طلب اختلافی امور کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے تو دیوانی مقدمات کی طرح طے کرنا چاہیئے، جیسا کہ زید اور بکر کے معاملے میں زیرِ بحث آ چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے، یہ تو درست ہے کہ پہلے جو بات جرم نہ ہو اب اس کو جرم بنانے کے لئے خلاف عام اصول میں احتیاط کی جاتی ہے جیسے مجموعی طور پر کوئی قانون فوجداری ایسا ہو کہ اس کا نفاذ اور اطلاق غیر یقینی ہو تو اسی صورت میں یہ طے کر دیا جاتا ہے کہ متعلقہ قانون خلافِ آئین ہے اور مبہم ہے۔ اس کے علاوہ تشریح و تفسیر کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ فوجداری کا قانون نہایت مربوط اور ٹھوس ہونا چاہئے تاکہ اس کی دفعات کے دائرے سے باہر کے افعال کو محض اس لئے مجرمانہ قرار نہ دے دیا جائے کہ ان میں بھی وہی خدشات اور خطرات پنہاں ہیں جن کی تشریح دفعات میں کی گئی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ قانون فوجداری اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس کے معنی و مفہوم عام طور پر بالکل واضح ہوں اور دس میں نو صورتوں میں کوئی اختلاف کی گنجائش نہ ہو اور دسویں صورت میں جبکہ کوئی غیر معمولی کیفیت رونما ہو، قانون اس قدر مبہم ہو کہ موجودہ ملزم کو یہ

اندیشہ ہی پیدا نہ ہو کہ وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ مجرمانہ عمل ہے۔ ایسی صورتوں میں، جہاں اقتصادی ضابطوں کا اطلاق ہوتا ہو، اس کا زیادہ امکان ہے۔ عدالتوں نے عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسی صورتوں میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ شکوک رفع کئے جائیں اور اس طرح سابق العمل قانون فوجداری تشکیل دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس معاملے کو بالکل اس طرح سمجھا گیا ہے گویا یہ بھی دیوانی کا مقدمہ ہو۔ لیکن غور کیجیے فوجداری کے مقدمے میں حالات مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً مفروضہ بالا مقدمے میں جب کسی مجرم کو رہا کرنے کے بعد واقعہ قانون سازی کی قباحت پیدا نہیں ہوتی اور بر اُت کا مفہوم اور مطلب اِسی قدر ہوتا ہے کہ مدعا علیہ کو چھوڑ دیا گیا۔

میری رائے یہ ہے کہ ایک ایسا اصول طے کرنا چاہیے کہ اگر کسی خاص معاملے کی منفرد نوعیت کے سبب، قانون کا اطلاق واضح نہ ہو اور اُسی قدر مبہم ہو کہ اگر دوسرے معاملوں پر اطلاق کی صورت میں مبہم رہنے اور غیر یقینی ہونے کے تحت کالعدم قرار پائے تو پھر مدعا علیہ کو مجرم قرار نہیں دینا چاہیے۔ اس اصول پر عمل کرنے سے دیوانی مقدمات سے غلط مشابہت کا اندیشہ نہ رہے گا، اور فوجداری قوانین سے متعلق عام اُصول کے مطابق طے کیا جائے گا کہ ابہام اور غیر یقینی کیفیت خواہ عام ہو یا مخصوص شکل میں قانون فوجداری کو کالعدم قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

اب سب سے مشکل سوال کا جائزہ لینا ہے، اور وہ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی صورتیں ہیں جب قانون کو سابق العمل یا سابق الاثر تصور کیا جائے۔ سب سے آسان مثال اُس قانون کی ہے جس میں کسی ایسے فعل کو مجرمانہ قرار دیا جائے جو

ارتکاب کے وقت بالکل قانونی تھا۔ دستوری دفعات میں اس قسم کے قوانین کی ممانعت کی گئی ہے، اور تمام مہذب قومیں اسی اصول کا احترام کرتی ہیں کہ معاملات کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے تحت ہو نہ نیا قانون بنا کر سابقہ اعمال کو قابل سزا بنایا جائے۔ سابقہ تاریخوں سے قانون کا اطلاق اور نفاذ ساری دنیا میں ناپسندیدہ عمل ہے اور ایسے قانون کی ہر جگہ مذمت کی گئی ہے، جس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ فوجداری مقدمات میں اس انداز سے کارروائی کرنے پر بڑے سنگین نتائج نکلتے ہیں یعنی کل کا بے گناہ آج مجرم اور قابل سزا قرار پا سکتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ سارے نظام قانون میں، فوجداری کے قوانین ہی ایسے ہوتے ہیں جن کا براہ راست اور قریبی تعلق انسانی اعمال و حرکات سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ تو نہایت احمقانہ عمل ہوگا کہ کسی آدمی کو آج یہ حکم دیا جائے کہ اس نے زمانہ ماسبق میں ایسا کیا یا نہ کیا ہوتا یہ تو انصاف کا مضحکہ اڑانا ہوا۔

اب ایک دوسری مثال لیجئے۔ ۱۹۶۳ء میں ٹیکس کا ایک قانون نافذ ہوا جس میں ۱۹۶۰ء کے منافع پر ٹیکس عائد کر دیا گیا، حالانکہ ۱۹۶۰ء میں اس رقم پر ٹیکس واجب نہیں تھا، اس طرح کے قوانین کھلم کھلا غیر منصفانہ ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا نفاذ سابق تاریخوں سے کیا گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں ٹیکس کی رقم کا تعین ایسے معاملے پر کیا گیا ہے جو ماضی میں واقع ہوا تھا۔ لیکن متعلقہ افراد سے صرف یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ٹیکس کی رقم اب ادا کر دیں۔ اس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے۔ ہم آج ایسے قوانین نہیں بنا رہے ہیں جس میں کسی کو حکم ہو کہ اُسے ٹیکس کل ادا کر دینا چاہیے تھا۔ گو ہم ایسے قوانین منظور کر رہے ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ماضی کے واقعات کی بنیاد پر ٹیکس عاید کیا جاتا ہے، اور آئندہ دیا جائے۔

یہ دلیل کچھ ایسی ہے کہ عام آدمی کو محض الفاظ کا گورکھ دھندا معلوم ہو گی۔ ظاہر ہے کہ وہ تو یہی کہے گا کہ ضابطہ فوجداری کے موجودہ قوانین کے تحت اگر کوئی عمل قابل گرفت نہیں ہے تو انسان بے تکلف وہ عمل کرے گا۔ اسی طرح کاروبار میں بھی، جب کسی کو معلوم ہو کہ موجودہ قوانین میں اس قدر رقم یا آمدنی پر ٹیکس عائد نہیں ہوتا تو پھر وہ اس حد تک منافع کمانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ اگر قوانین فوجداری میں کسی کے گذشتہ اعمال کو اب نئے قانون سے جرم قرار دے کر کوئی سزا دینا ظلم اور ناانصافی ہے تو پھر یہ بھی انصاف کے خلاف ہے کہ کسی تاجر سے اُس کاروبار اور منافع پر ٹیکس وصول کیا جائے جو اس کاروبار اور منافع کے وقت ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔

اس دلیل کا جواب دیتے وقت ہمیں اُن نتائج پر توجہ مرکوز کرنی ہو گی جو اس اصول کو پوری طرح تسلیم کرنے سے پیدا ہوں گے، نہ صرف ٹیکس کے قوانین بلکہ ہر قسم کے قوانین کا اثر انسان کے فیصلوں اور پروگرام پر پڑتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی کوئی خاص پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔ شادی کرنے کا فیصلہ کرے اپنے خاندان کو بڑھانے یا محدود رکھنے کا فیصلہ کرے یا اپنی جائداد کو فروخت کر دینے کا فیصلہ کرے اور ان تمام فیصلوں میں وہ مروّجہ اور موجودہ نظام قانون کو پیش نظر رکھے۔ اِن فیصلوں کا تعلق نہ صرف ٹیکس کے قوانین بلکہ جائداد اور معاہدوں کے قوانین بلکہ انتخابی قوانین سے بھی ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں سیاسی اقتدار کی تقسیم نو عمل میں آتی ہے۔ اگر انسان ہر مرتبہ اپنے معاملات میں مروّجہ قوانین کی پابندی پر ہی انحصار کرے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قانونی ضابطوں میں تبدیلیوں کے تصور سے ہی بے پروا ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تو قانون کا سارا نظام جامد اور ساکت ہو کر رہ جائے گا۔ اور کبھی قانون کو ترقی پذیر نہیں بنایا جا سکے گا۔

پھر آدمی یہ سمجھے گا کہ چلو موجودہ قانون کا لحاظ رکھتے ہوئے بدعملی کے دوسرے طریقے اختیار کر لو۔

اِس دلیل کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ ٹیکس کے قوانین دیگر قوانین سے مختلف ہوتے ہیں۔ انسان اپنے معاملات اور مسائل کے تجزیے میں ان کا زیادہ خیال رکھتا ہے کیونکہ یہ اُن پر براہ راست اثر ڈالتے ہیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ٹیکس کے قوانین کا اکثر صورتوں میں یہی مقصد نہیں ہوتا کہ رقم وصول کی جائے بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی عمل اور کردار کو ایک ایسی صحیح راہ پر ڈالا جائے جو قانون ساز کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اِس اعتبار سے یہ قوانین، ضابطہ، فوجداری سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ جائداد اور معاہدوں سے متعلق قوانین شخصی کردار اور ذاتی عمل کی کوئی خاص راہ متعین یا تجویز نہیں کرتے، ان کا مقصد تو صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ لین دین اور خرید و فروخت کو قانون کے دائرے میں لایا جائے اور کسی قسم کی بدعنوانی نہ ہو۔ اس کے برعکس ٹیکس کے قوانین انسان کو بعض طرح کے طرزِ عمل پر مائل کرتے ہیں اور بعض اقدامات سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں، اس طرح وہ انسان کی راہِ عمل متعین کرتے ہیں اور یہی اُن کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب وہ قوانین فوجداری سے مشابہ ہو جاتے ہیں تو پھر پہلے کی طرح سے بے ضرر نہیں رہ جاتے۔ اِس سے پہلے ہم ایک مثال کے ذریعے بتا چکے ہیں کہ جب ایک مرحلے پر قانون کے تحت ایک خاص حد تک منافع پر انکم ٹیکس معاف تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ قانون منافع کمانے کی جانب لوگوں کو مائل کر رہا ہے۔ پھر جب اِسی قسم کے کاروبار اور منافع پر ٹیکس لگا دیا تو دوسرے لفظوں میں یہی بات ہوئی کہ لوگوں کو اس کام کی سزا دی گئی جس کی پہلے خود قانون ہی نے ترغیب دی تھی۔ گویا کردار سازی اور راہِ عمل کے تعین کی،

تلخ سہی، مگر ایک شکل پیدا ہو گئی۔

اب بحث اس مرحلے پر پہنچی ہے کہ ہر قسم کے قوانین، عوام کو کسی خاص قسم کے طرزِ عمل سے روکتے ہیں یا اس کی تلقین کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قوانین معاہدہ کا مقصد یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ نجی کاروبار اور لین دین کے ذریعہ اور اصول پر اپنے معاملات سلجھا لیا کریں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر تجارت کے سارے سودے اور معاہدے مروجہ قوانین کی روشنی میں کر لئے جائیں تو کیا ضروری ہے کہ قوانین کل بدل نہیں جائیں۔ فرض کیا ایک ان پڑھ شخص دلالی کا کاروبار اس وقت شروع کر دیتا ہے جب زبانی سودے اور معاہدے قابل قبول ہوں، پھر بعد میں اگر یہ قانون رائج ہو جائے کہ ایسے تمام معاہدے تحریری ہونے چاہئیں اور ان پر سب کے دستخط ہونے چاہئیں تو ضروری نہیں کہ اس ان پڑھ دلال کی قانون آئندہ بھی حفاظت کرتا چلا جائے۔ بظاہر تو ٹیکس کے قوانین کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ لوگوں کو بعض قسم کے طرزِ عمل مائل کیا جائے اور بعض کاموں سے روکا جائے لیکن ہر صورت میں ٹیکس کے قوانین کا مشترکہ مقصد ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رقم وصول کی جائے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ایک قانون ساز نے کسی اور بنا پر ٹیکس کی حمایت کی ہو اور دوسرے نے اس سے مختلف وجود پیش نظر رکھی ہوں۔ شراب پر جو ٹیکس لگائے جاتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو شراب نوشی سے باز رکھا جائے یا یہ کہ جن لوگوں کو شراب کی عادت ہے ان سے حکومت کے اخراجات کے لئے رقم وصول کی جائے۔ اس قسم کے سوالات کے جواب معین کر کے نہیں دئے جا سکتے۔ اس لئے اس بحث کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں اور کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتے۔ اس تشریح کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ سابقہ تاریخوں سے قانون کو نافذ کرنے کی راہ

میں جو بعض دشواریاں ہیں ان کی نشان دہی کی جائے۔ اور یہ دشواریاں ایسی ہیں جو صرف ٹیکس کے قوانین تک محدود نہیں ہیں۔ ان مشکلات کا حل تلاش کرتے وقت عدالتوں نے اکثر حکومت اور شہریوں کے درمیان معاہدے کا سا معاملہ پیش نظر رکھا ہے۔ اگر حکومت نے بعض سرگرمیوں کے سلسلے میں ٹیکس کی چھوٹ دے رکھی تھی اور بعد میں گذرے زمانے کے لئے چھوٹ کا قاعدہ منسوخ کر دیا تو اکثر عدالتی تصفیہ یوں کیا جاتا ہے کہ کیا حکومت نے تصور دے رکھا تھا یا کوئی ذمہ لے رکھا تھا کہ ٹیکس کی چھوٹ برقرار رکھی جائے گی اور کوئی اور فائدہ اُٹھا لیا تھا۔

یہ بات رکھنی چاہیے کہ شہری اور حکومت کے درمیان معاہدے کا تصور ایک وسیع تصور ہے۔ جارج ہمل (George Simmel) لکھا ہے اور درست لکھا ہے کہ حکومت کو بالادستی حاصل ہونے کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ رعایا کی مرضی اس بالادستی میں شامل ہے۔ اس تصور کی وضاحت کی جائے تو قانون سازی کے آٹھویں اُصولوں تک بالادستی کے اس نظریے کا دائرہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر مفروضہ بادشاہ سلامت کو حکومت وراثت میں نہ ملتی اور انھیں عوام نے اس وعدے پر منتخب کیا ہوتا کہ وہ نظام قانون کی اصلاح مکمل کریں گے تو ناکامی کی صورت میں عوام یہ محسوس کرنے میں حق بجانب ہوتے کہ بادشاہ کو معزول کر دینا چاہیے۔ یہ نظریہ کہ اگر حکومت خوش انتظامی کے معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو انقلاب کا جواز ہے، بہت پرانا نظریہ ہے اور عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تصور عام قانونی استدلال کی مروجہ حدود سے خارج ہے لیکن اگر سابقہ مدت سے قانون کا نفاذ محض اس بات پر منحصر ہو کہ حکومت خود اپنے اور شہریوں کے درمیان معاہدے کا کتنا پاس کرنا چاہتی ہے ایسی حالت میں انقلاب اور بغاوت کے قانونی جواز کی ادنیٰ سی شکل

صورت پذیر ہو جاتی ہے۔

سابق العمل قوانین کی اس بحث میں معنوی معاہدے کی بنیاد اختیار کرنے میں دقت یہ ہے کہ ایسے تجزیے میں بڑی دشواریاں ہیں لیکن میں اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کا ہر پہلو الجھا ہوا اور مبہم نہیں ہے۔ قانون کے داخلی اخلاق کی تشکیل میں ہر جگہ دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور مثالی قانون ہمیشہ ایک خواب ہی بنا رہتا ہے یعنی کسی بھی قانون کو ہر لحاظ سے کامل اور حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ان باتوں کے باوجود حق و باطل میں بہر حال امتیاز کیا جا سکتا ہے اور نامعقول باتوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ برے قانون کی مثالیں پیش کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ ہم جرمنی کے ہٹلر یا روس کے اسٹالن ہی کو پیشِ نظر رکھیں، خود ہمارے یہاں ایسے قانون ساز نظر آ جائیں گے جن کے عقیدے اور رویّے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ بھی اسی نظریے کے قائل ہیں کہ کسی کام کا نتیجہ، اس کے ذرائع کا جواز مہیا کرتا ہے یعنی مقصد کے حصول کے لئے کوئی بھی طریقۂ کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس وفاقی قانون کو لیجیے جو ۱۹۳۸ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس میں وضاحت کی گئی تھی کہ "جو شخص کسی تشدد کے جرم میں سزا یافتہ ہو وہ کوئی ایسا اسلحہ حاصل نہیں کر سکتا جو امریکی ریاستوں کے مابین تجارت یا بیرونی تجارت کے ذریعے جہاز یا ریل گاڑی وغیرہ سے منگوایا گیا ہو"۔۔۔۔

قانون سازوں کو بجا طور پر یہ خیال تھا کہ اس قانون کی زد میں عام طور پر وہ لوگ نہیں آتے جنھوں نے مقامی بازار میں اور انتہائی معتبر اور ذمے دار طریقے پر اسلحہ خریدا ہو۔ قانون ساز یہ بھی چاہتے تھے کہ ضرورت کے وقت اس قانون کا نفاذ تاریخ گذشتہ سے کیا جا سکے لیکن ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انھوں

نے دوسری بہترین راہِ عمل اختیار کی، اور وہ اس طرح کہ انھوں نے قانون کی دفعات میں یہ جملہ بھی بڑھا دیا کہ اگر اس قسم کا اسلحہ جو دوسری ریاست یا باہر کا بنا ہوا کسی ایسے شخص کے پاس آیا ہو جو مذکورہ قانون کی شرائط پوری کرتا ہے تو ایسی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ اسلحہ کی وصولیابی قانون کے نفاذ کی تاریخ کے بعد عمل میں آئی ہے۔ قانون کے اس ٹکڑے کو، جسے قانون سازوں نے نہایت چالاکی سے شامل کر رکھا تھا، آخر کار سپریم کورٹ نے ایک مقدمے میں کالعدم قرار دے دیا۔[1]

قوانین کی وضاحت

قانون سازی کا ایک نہایت اہم نکتہ یہ ہے کہ جو قوانین مرتب کیے جائیں وہ بالکل واضح اور صاف ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن میرا خیال ہے کہ اس ضرورت اور تقاضے کو پورا کرنے کی جو ذمے داریاں ہیں اُن کا شعور بہت عام نہیں ہے۔[2]

---

[1] اسی کے ساتھ ایک اور قیاس یہ بھی ہے کہ اگر کسی سزا یافتہ کے قبضے میں کوئی اسلحہ ہو تو فرض کیا جائے گا کہ ریاست یا ملک کے باہر سے آیا ہے۔ سپریم کورٹ نے اس کو بھی کالعدم قرار دیا۔ ٹاٹ بنام ریاستہائے متحدہ۔ ۳۱۹۔ یو۔ ایس (۱۹۴۲) ص ۴۶۳

[2] اصول قانون کی عام کتابوں میں اس پر بہت کم بحث ملے گی۔ مثلاً بنتھم کی آخری کتاب "دی لمٹس آف جورس پروڈنس" میں صرف مختلف قسم کے ابہامات کے نام تجویز کیے گئے ہیں۔ آسٹن نے "احکام جو قانون نہیں" کی بحث میں مبہم اور غیر واضح قانون کا ذکر تک نہیں کیا۔ متقنن اس بحث سے یوں بچنے کی ابہام کی صورت میں قانون کی تاثیر بھی کم ہو جاتی ہے اور کسی حکم کے غیر مؤثر ہونے کا متقنن تصور نہیں کر سکتے۔ امریکہ میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ عدالتوں کو بالکل مبہم قوانین کے تسلیم کرنے سے انکار کرنا چاہیے۔ نظائر کا جہاں تک تعلق ہے صرف فوجداری مقدمات میں دستور کی متابعت کی دلیل دے کر مبہم قوانین کالعدم قرار دیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ۲۱۔ مشی گن لاریویو ص ۸۳۱ (۱۹۲۲ء) اور ۱۰۹۔ یونیورسٹی آف پنسلونیا لاریویو ص ۶۷ (۱۹۶۰ء)

آج کل قانون کے بارے میں جو رجحان پایا جاتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ یہ انسانی طرزِ عمل اور اخلاقیات کے لئے ایک ضابطہ ہے بلکہ قانون کو عام طور پر ایک حکم اور حاکمانہ قوت کا مظہر سمجھا جاتا ہے اسی وجہ سے قانون کی پابندی اور مُسلّمہ حکومت کی فرماں برداری کو باہم خلط ملط کر دیا جاتا ہے، جس کا منطقی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جج صاحبان، پولیس، اور وکلاء قانون کی خلاف ورزی اور تعبیر میں غلطی کر بھی سکتے ہیں لیکن مجلس قانون ساز ہرگز ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ مجلس قانون ساز بہر حال آئین کے عطا کردہ عام اختیارات کے اندر رہتے ہوئے جو قوانین چاہے خود بنالے بشرطیکہ وہ قوانین آئین کی خلاف ورزی نہ کریں۔ لیکن قانون سازی کے بھی چند اصول ہوتے ہیں اور مجلس قانون ساز کے لئے بھی یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ غیر مربوط اور مبہم قوانین سے حق و انصاف کے تقاضے پُورے نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر قانون میں جھول ہو گا تو کوئی بھی بچنے کی راہ نکال لے گا۔ اور اپنی مرضی کے مطابق اس کی تفسیر و توضیح کرے گا اور یہ باتیں قانون کی حیثیت کو مجروح کرتی ہیں مثلاً اگر کسی گندے چشمے کے پانی کو صاف کرنا ہو تو وہ صاف تو ضرور ہو جائے گا لیکن اس کی صورت کسی نہ کسی قدر بدل جائے گی۔ مجلس قانون ساز کا رتبہ بہت بلند ہوتا ہے لیکن اس کے لئے بھی لازم ہے کہ قانون کا احترام کرے اور قانون کے داخلی اخلاق کے تقاضوں کا لحاظ رکھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجلس قانون ساز کو اس قانونی احترام کی ذمہ داری زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرنی چاہیئے۔

قانون کے واضح ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معروف اصول "نیک نیتی" اور "مناسب احتیاط" اور عوام کی شرافتِ نفس کا سہارا نہ لیا جائے کیونکہ آخر کار قانون کے احترام اور پابندی کا انحصار ان ہی انسانی خصوصیات پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات واضح قوانین مرتب کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے عام

شعور اور انسانی عمل کے عام معیار کو پیشِ نظر رکھ کر ضابطے مرتب کئے جائیں کیونکہ قوانین کی پابندی کے بغیر بھی انسان، اپنی روزمرہ کی زندگی میں کچھ ضابطوں کی بہر حال پابندی کرتا ہے اور اس کے اس شعور کو ملحوظ رکھنا چاہیے بالکل اسی طرح جیسے قانون کا مفہوم اور مقصد لوگوں تک پہنچانے کے لئے روزمرہ کی عوامی زبان ہی تو استعمال کی جاتی ہے۔ قانون سازی میں بھی اس نکتے کو ذہن میں رکھنا چاہیے دیکھئے ارسطو نے بہت پہلے یہ بات کہی تھی کہ موضوع کی نوعیت میں جو صداقت اور قطعیت ہوتی ہے اتنی الفاظ میں کہاں پیدا کی جاسکتی ہے۔ قانون کا واضح ہونا یقیناً ضروری ہے لیکن اگر اس سے قانون کا منشا پورا نہ ہوتا ہو تو اس سے بہتر یہی ہے کہ قانون کسی قدر مبہم رہے لیکن اس میں صداقت اور نیک نیتی کارفرما ہو۔

دوسری طرف یہ سمجھنا بھی سنگین غلطی ہے اور یہ غلطی مسلسل دہرائی جاتی ہے کہ ہاں قانون مرتب کرنے والے اپنے مقاصد کو صاف اور واضح الفاظ کے قالب میں نہیں ڈھال سکتے لیکن بہر نوع اس کی توضیح و تشریح کا فرض عدالتوں پر عائد ہوتا ہے، اور بڑی آسانی سے ان پر چھوڑا جاسکتا ہے لیکن یہ بات دراصل منحصر ہے اس خاص مسئلے کی نوعیت پر، جو زیرِ غور ہو، مثال کے طور پر اگر کوئی تجارتی قانون ہے تو انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اس کی تشریح اس طرح کی جائیگی جو تجارتی روایات اور رواج کے مطابق ہو اور ان اصولوں کو سامنے رکھا جائے گا جنھیں تاجر طبقے کے لوگ تسلیم اور قبول کرتے ہوں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ عام انسانی تنازعات کا حل صرف معیارِ انصاف کے عام اصولوں کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہر معاملہ اور مقدمہ الگ نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کے لئے قانون کی تشریح و توضیح محض رواج یا چند اشخاص کے عمل کی بنیاد پر نہیں کی جاسکتی۔

چنانچہ ہائیکس (Hayesk) نے اصطلاحات "منصفانہ" اور "معقول" کو جو بعض قوانین میں بطور شرط استعمال ہوتی ہیں مبہم کہہ کر یک لخت مسترد کر دیا ہے۔ ہمیں بلحاظ موضوع اور نوعیتِ قانون ان شرائط کی مناسبت یا نامناسب ہونے کا تصفیہ کرنا چاہیے۔

ہائیکس کا کہنا ہے کہ :-

"قانون کی بالادستی کے انحطاط پر اگر کوئی شخص چاہے تو پوری کتاب لکھ سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ ان بظاہر مبہم اصطلاحوں کو کس طرح انصاف اور قانون میں جگہ دی گئی ہے، جس کی وجہ سے قانون غیر یقینی بنتا گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون اور انصاف کا احترام گھٹتا گیا۔"[۱]

ظاہر ہے کہ یہ رائے اتنی وسیع ہے کہ بیشتر صورتوں میں صحیح نہیں ہو سکتی۔

اُصولِ قانون سازی کے بارے میں ایک باب لکھنے کی ضرورت باقی ہے، اس باب میں یہ وضاحت کی جائے گی کہ وہ کون سے حالات ہیں جن میں سرکاری اداروں کے دستور العمل سے پیدا ہونے والے مسائل عدالتی تصفیے کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں، اور یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ مختلف اختلافی امور کا الگ الگ جائزہ لینے کے بعد فیصلوں کا ایک منصفانہ معیار قائم کیا جا سکے گا۔ اس طرح کے بنیادی نوعیت کے مسائل سے نمٹتے وقت، یہ اصول پیش نظر رکھنے ہوں گے، محض ٹالنے یا طرح طرح کے تجربے کرنے سے کام نہیں چل سکتا۔

---

[۱] دی روڈ ٹو سرف ڈم از ہائیک (۱۹۴۳ء) ص ۷۸

قوانین میں تضاد

قانون ساز کے لئے یہ بھی نہایت اہم ہے کہ وہ قوانین اس طور پر مرتب کرے کہ ان میں تضاد اور ٹکراؤ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت مشکل اور محنت طلب کام ہے جو قانون سازوں کو کرنا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ پتہ کیسے چلایا جائے کہ تضاد کب واقع ہوگیا اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ بعض وقت اس تضاد کی کیفیت انتہائی مبہم ہوا کرتی ہے یعنی واضح نہیں ہوتی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سیدھا سادہ منطقی سوال ہے، تضاد وہ صورت ہے جس سے دو معاملات کی مطابقت ناممکن ہو جاتی ہے اور ان کا مفہوم ایک نہیں رہتا —— لیکن منطقی اور قانونی تضاد میں فرق ہوتا ہے[1]۔ مثال کے طور پر ہم کوئی ایسا واقعہ لیں جس میں تضاد منطقی مفہوم میں پایا جاتا ہو۔ فرض کیجیے ایک ہی قانون میں دو دفعات ہیں۔ ایک دفعہ کی رو سے یکم جنوری کو کاروں میں لائسنس کی نئی تختیاں لگ جانی چاہئیں، جبکہ دوسری دفعہ کے تحت اس تاریخ کو اجرت پر کوئی کام کرنا یا کرانا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قانونی تضاد موجود ہے کیونکہ یہ کہاں کا قانون ہے کہ ایک طرف تو حکم دیا جاتا ہے کہ یہ کرو، دوسری طرف تاکید کی جاتی ہے کہ یہ ہرگز نہ کرو۔ اگر کسی کام کے لئے آدمی

---

[1] کلسن اور بنتھم نے علی الترتیب جنرل تھیوری آف لا اینڈ اسٹیٹ (۱۹۴۵) ص ۲۷۴ اور لمٹس آف جورس پروڈنس (۱۹۴۵) ص ۱۹۵ میں قانونی تضاد اور تنافر پر کچھ بحث کی ہے مگر یہ مباحث تشنہ ہیں اور مقنن اور منصف دونوں کی کوئی خاص مدد نہیں کرتے۔

کو حکم دیا جائے اور پھر اسی کام کے کرنے کی اُسے سزا دی جائے تو یہ عمل قانونی تضاد کہلائے گا، مگر بلحاظ منطق ناممکن نہیں۔ ہم ضرور کہیں گے یہ بالکل بے تکی بات ہے، لیکن یہ فیصلہ تو ہم اُس وقت دیں گے جب ہم نے اپنے ذہن میں قانون کا یہ مقصد رکھا ہو کہ وہ انسانی افعال و اعمال کی راہیں متعین کرتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو ایک کام کا حکم دیا جائے اور پھر اُس کام کے کرنے پر سزا دی جائے تو ظاہر ہے کہ آئندہ ہر قسم کے احکامات اور قوانین کی پابندی اُس کے لئے ناممکن ہو جائیگی۔ اور وہ اُن سے بچنے کی کوشش کرے گا اگر یہ مقصد ہو کہ اس طرح ہم اُس کے کردار اور اعمال کو ضابطے میں ڈھالنے کے لئے کچھ اُصول مرتب کرلیں گے تو ہماری یہ کوشش کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ لیکن اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ وہ قانون کی اِس "چہ کنم" کا شکار ہو کر اعصابی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو یہ مقصد ضرور پُورا ہو جائے گا۔ لیکن دونوں صورتوں میں منطق کی خلاف ورزی نہ ہوگی۔

اگر قانون میں تضاد بیانی پائی جاتی ہو تو اُسے دُور کرنے کا ایک مُسلّمہ اُصول یہ ہے کہ بظاہر متضاد دفعات میں مصالحت کی راہ تلاش کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس اُصول پر کاربند رہتے ہوئے عدالت اُس شخص کو جس نے سال نو کے دن تختیاں لگائی تھیں، ایک جرم کا مرتکب قرار دے اور پھر اسے سزا سے بری کر دے۔ کیونکہ اس نے ایک قانونی دفعہ کے تحت یہ کام کیا تھا۔ یہ حل خاصا دقت طلب ہے لیکن قانون کی تاریخ میں اس سے کہیں عجیب و غریب طریقۂ کار اختیار کئے جاتے رہے ہیں۔

ایک زمانے میں کلیسائی قانون کا اصول یہ تھا کہ قسم کھا کر جو معاہدے کئے جائیں گے وہ پُورے کرنے ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی دوسرا اُصول یہ بھی تھا کہ دھونس اور زبردستی، یا گراں سود کے وعدوں کی پابندی لازم نہیں۔ ظاہر ہے

ایسی صورت میں عدالت کے لئے فیصلہ بہت مشکل ہوجاتا ہے جب گراں سُود کا وعدہ حلفی ہو۔ عدالت تو یہی حکم دیتی تھی کہ پہلے قانون کے تحت وعدہ پُورا کرنا ہوگا، اور اگر رقم قرض لی ہے تو پوری واپس کرنی ہوگی، لیکن دوسرے قانون کے تحت اس وجہ سے کہ سود المضاعف تھا" دوبارہ رقم اُسی کو واپس کرائی جاتی جس سے دلائی گئی تھی۔ اِس عجیب وغریب طریقہ کار میں ایک سبق بھی پوشیدہ ہے" یعنی عدالت نے پہلے تو پابندی عائد کرکے یہ اُصول پیشِ نظر رکھا کہ حلفیہ وعدے اور سمجھوتے ضرور پُورے ہوں" اور پھر اسی فیصلے کو رد کرکے عدالت نے وعدہ کرنے والے کو یہ بتادیا کہ اُس کی حرکتوں کا کیا خمیازہ بھگتنا ہوگا" اور جبری اور گراں سُود کے معاملے جائز نہیں۔ یہ بظاہر بالکل مہمل عمل ہے مگر وعدوں کی پابندی اور ناجائز معاہدوں کی بے اثری کا بڑا ڈرامائی مظاہرہ ہے۔ فرض کیجیے کہ عدالت یہ طے کرتی ہے کہ ایک بار سزا دینے اور پھر اُسی سزا کو معاف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو پھر وہ لائسنس، پلیٹ والے متضاد احکام قانون کی تشریح اس طرح کرسکے گی۔

(۱) قانون کی جس دفعہ میں سالِ نو کے دن کام کرنے کی ممانعت کی گئی ہے وہ لائسنس پلیٹوں کے لگانے کی دفعہ پر غالب آجاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ گاڑیوں کے مالک قانوناً لائسنس کی تختیاں لگانے کا کام دوسری تاریخ تک ملتوی کرسکتے ہیں۔ یا

(۲) قانون کی وہ دفعہ جو لائسنس پلیٹ کے متعلق کام کرنے کی ممانعت کی دفعہ پر غالب آجاتی ہے اور اُسے رد کردیتی ہے" اِس لئے گاڑی والوں کو لازم ہے کہ وہ پہلی جنوری کو ضرور تختیاں لگالیں اور ایسا کرنا کوئی جرم شمار نہ ہوگا۔ اس قانونی تضاد کے لئے اور بہتر فیصلہ بھی کیا جاسکتا ہے اور وہ مستحسن بھی ہوگا" یعنی ان دونوں تشریحات کو ملاکر مفہوم نکالا جائے اور اس طرح کہ پہلی اور دوسری جنوری کو لائسنس

کی تختیاں لگانے والے اور نہ لگانے والے دونوں ہی کے متعلق طے کر دیا جائے کہ وہ گویا دائرہ احکام سے خارج نہیں ہوئے اور یہ فرض کر لیا جائے گا کہ قانون کے دونوں احکام کی پابندی ہو گئی۔ قانون کی اس طور پر تشریح کا مقصد یہ بتانا ہوگا کہ قانون نے شہریوں کو الجھی ہوئی ہدایت دے کر الجھن میں ڈال دیا ہے اس لئے شہریوں کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اس الجھن کو خود اپنی مرضی کے مطابق دور کریں اور قانونی سزا کی زد میں نہ آئیں۔

اب ہم متضاد قانون کی ایک اور مثال لیتے ہیں۔ اس دفعہ یہ تضاد عدالت کے فیصلے میں پایا جاتا ہے۔ یہ مقدمہ وفاقی حکومت بنام کارڈف ہے[1] جس میں غذائی اشیاء تیار کرنے والی ایک کمپنی کے پریسیڈنٹ کو اس جرم میں سزا دی گئی تھی کہ اس نے وفاقی قانون کے تحت غذاؤں اور مصنوعات کے معیار کی جانچ کرنے والے ایک انسپکٹر کو اپنے کارخانے کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اس قانون کی دفعہ ۷۰۴ میں بتایا گیا ہے کہ کن حالات کے تحت انسپکٹر کارخانے میں داخل ہو سکتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مالک سے اجازت طلب کرے۔ دفعہ ۳۳۱ میں کہا گیا ہے کہ دفعہ ۷۰۴ کے تحت انسپکٹر کو کارخانے میں داخل ہونے اور معائنہ کرنے کی اجازت نہ دینا ایک جرم ہے، بظاہر قانون یہ کہتا ہے کہ انسپکٹر کو داخل ہونے کا اختیار حاصل ہے لیکن مالک کو بھی داخلے کی اجازت نہ دینے کا اختیار حاصل ہے۔ اب اس تضاد کو دور کرنے کا ایک نہایت سادہ اور آسان طریقہ ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کے لئے قانون کی تشریح اس طور پر کرنی ہوگی کہ اگر مالک انسپکٹر کو داخلے کی اجازت دینے کے بعد عملاً اندر جانے نہ دے تو یہ قانون کی خلاف ورزی

---

[1] ۳۴۴ یونائیٹڈ اسٹیٹس ص۱۷۴ (1952)

ہو گی یعنی اس کے لئے اجازت اور وعدہ ضروری نہیں ہے لیکن اجازت دے کر یا وعدہ کر کے پھر اُسے پُورا کرنے کی ذمے داری وہ خود اپنے اوپر عائد کر لیتا ہے۔

سپریم کورٹ نے اس وضاحت پر غور کیا لیکن اُسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اِس میں قباحت یہ نہیں ہے کہ یہ غیر منطقی ہے بلکہ یہ کہ یہ قانون سازی کے کِسی معقول مقصد کے مطابق نہیں ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کانگریس کا مقصد شاید یہ ہو کہ مالک کے احتجاج کے باوجود انسپکٹر کو داخل ہونے کا اختیار دیا جائے لیکن یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ انسپکٹر کے اس حق کو محدود کر دیا جائے کہ کوئی سنکی مالک پہلے تو اُسے آنے کی اجازت دے اور پھر دروازے بند کر لے اور انسپکٹر داخل نہ ہو سکے۔ اس کا تصفیہ اس طرح ہو سکتا تھا کہ انسپکٹر رواجی اخلاق کے مطابق مالک سے اجازت لے یعنی مناسب دن، تاریخ اور وقت کا تعین کرے۔ گو اس تعبیر میں قانون کے الفاظ اور معانی میں کھینچ تان کرنی پڑتی۔ مگر سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ دونوں دفعات میں تصادم کی وجہ سے بڑی مبہم صورتِ حال سامنے آتی ہے اور جرم کی نوعیت کا صحیح طور پر یقین کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ سپریم کورٹ نے یہ مقدمہ خارج کر دیا۔

ابھی تک ہماری بحث کا تعلق اُن تضاد بیانیوں سے رہا ہے جو کسی ایک قانون کی دفعات میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن زیادہ مشکل صورتِ حال اُس وقت پیش آتی ہے کہ جب مثلاً ۱۹۶۳ء کا کوئی قانون ۱۹۵۳ء کے کسی قانون سے متصادم ہوتا ہے اور اس کی تردید یا تکذیب کرتا ہے۔ اس صورت میں مسلّمہ اصول تو یہی ہے کہ بعد کے قانون کے اثر سے ضمناً سابقہ قانون کو مسترد اور کالعدم تصور کر لیا جاتا ہے۔ مسلّمہ اُصولِ قانون سازی یہ ہے کہ قانونِ مابعد اپنے سے متضاد قانون

ماقبل کو مسترد کردیتے ہیں[۱]۔ لیکن بعض حالات میں دوسری صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے اور وہ وہی ہوگی جو کسی ایک قانون کی ذیلی دفعات میں تضاد کی صورت میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ اور اس حالت میں دونوں قوانین یا دفعات میں مفاہمت پیدا کرلی جاتی ہے۔ ایک کی روشنی میں دوسرے کی تشریح اور مطابقت اور عملاً مفاہمت ناممکن نہیں ہوا کرتی۔ اس طرح جو حل نکلتا ہے وہ بذاتِ خود مشکلات اور اُلجھنوں سے بری نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ طریقہ زیادہ طویل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر یہ سارا کام عدالتوں کی تشریح اور تاویل پر چھوڑ دیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ عدالتیں مروجہ قوانین کو ایک مربوط نظام کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اس کی ازسرِنو تشکیل کا کام سنبھال لیں، جو بہرحال عدالت کا منصب نہیں ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ موجودہ قوانین کی روشنی میں پرانے قوانین کی تشریح کرنے کی کوشش کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ سابق الاثر قوانین کا سلسلہ شروع ہوجائے اور سابق الاثر قوانین کا مسئلہ جو خود خاصا اُلجھا ہوا ہے اور بھی اُلجھ کر رہ جائے۔ یہ صورتِ حال خاصی پریشان کن ہوگی اور میں یہاں ان مسئلوں کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس موضوع پر خاصی طویل بحث ہوچکی ہے اور اس سے یہ نتیجہ سامنے آچکا ہے کہ بے توجہی سے ایک دوسرے کے متصادم اور متضاد قوانین کا نفاذ "قانون" اور قانون پسندی کے حق میں بہت بُرا ہوتا ہے" اور کوئی ایسا آسان اُصول نہیں ہے جس کی مدد سے اس بُرائی کو دُور کیا جاسکے اور اس نقصان کی تلافی کی جاسکے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو "اے ڈس کورس اپان دی اسٹیچوٹس" مصنفہ تھارن (۱۹۴۲) ص ۱۳۲ تضاد قانون کی ضمن میں لارڈ ایلس مبر نے یہ عجیب حل پیش کیا تھا کہ ایک ہی قانون کے دو متضاد احکام میں سے جو پہلے ہو وہ بعد کی دفعہ کو منسوخ کرتا ہے۔ یہ خیر بحیثیت اصول تسلیم نہیں کی گئی۔

ایک تجویز یہ بھی ہے کہ قانونی اور اخلاقی دلائل میں ہمیں تضاد (Contradictions) کے بجائے "عدم مطابقت" (Incompatibilities) کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے۔ یعنی وہ باتیں یا دفعات جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں، یا جن میں خوشگوار مطابقت کا فقدان ہے۔ قانون کی کتابوں اور بحثوں میں مدت سے ایک اور اصطلاح بہت عام رہی ہے اور اچھی بھی ہے، اور وہ ہے "منافی ہونا" (Repugnant)۔ کیونکہ ہم جس چیز کو عدم مطابقت کہتے ہیں وہ دراصل ایک طرح کا باہمی ٹکراؤ اور اختلاف ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسے متصادم قوانین ایک دوسرے کو ختم کردیں، لیکن برسرِپیکار ضرور رہتے ہیں۔ ایک اور اصطلاح بھی اچھی تھی یعنی (Inconvenient) "دقت طلب" یا "لاینحل"۔ اب یہ اصطلاحیں ترک ہو چکی ہیں۔ "دقت طلب" قوانین وہ ہوتے ہیں جو دوسرے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتے اور ان میں مطابقت اور مفاہمت کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اس بحث اور تجزیے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب انسانی عمل سے متعلق دو ضابطوں میں عدم مطابقت کے تعین اور تصفیے کے لیے ہمیں بے شمار ایسی باتوں کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے جن کی نشاندہی قانونی دفعات کے الفاظ میں نہیں ہوتی۔ اِنسانی تاریخ کے کسی دور میں اس حکم میں کھلا تضاد اور ٹکراؤ موجود تھا کہ "دریا پار کرو لیکن کپڑے نہ بھیگیں" لیکن پُلوں اور کشتیوں کے وجود میں آجانے کے بعد یہ تضاد غائب ہوگیا۔ اگر آج میں کسی کو یہ حکم دوں کہ "ہوا میں چھلانگ لگاؤ لیکن پاؤں زمین پر جمے رہیں"، تو میرے اس حکم میں داخلی تضاد موجود ہے کیونکہ ہم نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ چھلانگ لگانے کے دوران کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ پاؤں زمین پر ٹکے رہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے،

کہ عدم مطابقت کے سوال کا فیصلہ کرتے وقت ہمیں جن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے وہ محض اور سراسر فنی اور قانونی نہیں ہو سکتیں، کیونکہ اس مسئلے اور ہر انسانی معاملے سے پورا نظامِ حیات ہی متعلق ہوتا ہے جس میں قانونی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور عمرانی پہلو ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں سالِ نو کے دن کے ایسے قانون کا جائزہ لیں جس کی ایک دفعہ میں تو یہ کہا گیا ہے کہ یکم جنوری کو لائسنس کی تختیاں لگ جانی چاہئیں لیکن دوسری دفعہ یہ کہتی ہے کہ اُس دِن جو شخص کام کرے گا اس پر ایک ڈالر آبکاری ٹیکس عائد کر دیا جائے گا۔ اب ظاہر ہے کہ آدمی اس عدم مطابقت کا علاج کیونکر کرے گا، یہ یقینی امر ہے کہ یہ قانون کسی قدر ناقص ہے، مگر یہ نقص نہ بنیادی ہے نہ احکام کی مطابقت دشوار۔

ناممکن العمل قوانین

اگر آپ کو بتایا جائے کہ بعض قوانین ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں ناممکنات کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو آپ یہی کہیں گے کہ قانون بنانے والے لوگ پاگل ہوں گے ورنہ ایسے قوانین بنانے کا مقصد اور فائدہ ہی کیا جن پر عمل ہی نہ کیا جا سکے۔ انتہائی بدمعاش ڈکٹیٹر بھی اگر قوانین بنانے کی ضرورت محسوس کرے گا تو اتنا ضرور خیال رکھے گا کہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہو —— آپ کا یہ خیال درست سہی لیکن زندگی کے حقائق اس خیال کی تردید کرتے ہیں، اور دنیا میں واقعی ایسے قوانین بنائے گئے ہیں جن پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ للبرن (Lilburn) نے لکھا ہے کہ اس قسم کے قوانین کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ حکمران کو غیر قانونی طور پر غیر محدود اختیار حاصل رہے۔" یہ قوانین اس قدر لغو اور دھاندلی کے ہوتے ہیں کہ وہ رعایا سے کسی وقت بھی کسی چیز کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ گویا انسان کو ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر رکھنی چاہیے، کون جانے کب پھانسی کا پھندا اس کے

گلے میں ڈال دیا جائے۔ داد فریاد سے بے نیاز ہو کر اسے سرِ تسلیم خم کر دینے کو تیار رہنا چاہیئے۔[1]

ضروری نہیں کہ ناممکنات کا مطالبہ بُری نیّت سے کیا جائے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مطالبہ نیک نیتی سے اور فائدے کے لئے کیا جائے، لیکن آخر کار نقصان دہ ثابت ہو۔ مثلاً جو اچھے اساتذہ ہوتے ہیں وہ اکثر یہی مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے شاگردوں میں جتنی صلاحیت ہے اُس سے زیادہ صلاحیت کا مظاہرہ کریں ظاہر ہے اساتذہ کی نیت یہی ہوتی ہے کہ طلباء کی صلاحیتیں اور زیادہ اجاگر ہوں، لیکن بدقسمتی سے ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔

کیونکہ ہر چیز کی حدود ہوتی ہیں، انسان کے اندر بھی صلاحیتوں اور قوتِ برداشت کی حدود ہیں اور یہ معلوم کرنا محال ہے کہ انسانی صلاحیت اور اُس پر عائد کردہ ذمّے داریوں میں کتنا توازن ہے۔ اکثر قانون ساز بھی اِن ہی اساتذہ کی مانند ہوتے ہیں اور ان کے قوانین پر عمل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ پھر اساتذہ کی بات ہی اور ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُستاد یہ ضرور چاہتا ہے کہ طلباء زیادہ سے زیادہ صلاحیت کا مظاہرہ کریں لیکن اگر وہ اس مطلوبہ حد تک

---

[1] قانون کے داخلی اخلاق کے اور تقاضے بھی "بیرونِ امکان" کی تعریف میں آسکتے ہیں، مثلاً "اِبہام۔ اگر قانون سمجھ ہی میں نہ آئے تو تعمیل کا کیا امکان ہوگا۔ مگر ہم اس موجودہ عنوان کے تحت ایسے قانون کا ذکر کر رہے ہیں جو "ناممکنات" کا حکم دے۔ تضاد اور ابہام نہ ہوں، یہ ایک بات ہے اور قانون میں ناقابلِ تعمیل، ناممکن یا انسانی اعتبار سے باہر افعال کا تقاضا اور لزوم بالکل دوسری۔ ہم اس وقت اس دوسری دقت سے بحث کر رہے ہیں۔

مظاہرہ نہیں کر سکتے تو بھی استاد شکایت یا سزا کی بات نہیں کرتا بلکہ طلباء کے اُتنے ہی کام کی تعریف کر دیتا ہے جو پُوری سعی اور صلاحیت کے مظاہرے کے بعد اُن سے ممکن ہوا۔ سرکاری عملے کو بھی ایسی صورتِ حال کا سامنا ہوتا، اور حالات ایسے ہوتے ہیں کہ یا تو وہ صریحًا ناانصافی کرے، یا پھر خود ہی متعلقہ قانون کے تقاضوں میں رعایت برتے اور قانون کے الفاظ کی خلاف ورزی سے کسی حد تک چشم پوشی کرلے۔ قانون سازی کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ قانون کے تقاضے اور مطالبے ایسے ہرگز نہ ہوں جنھیں پُورا ہی نہ کیا جاسکے، کیونکہ اس اصول کو اگر منطقی استدلال کی آخری حد تک لے جایا جائے تو پھر خود قانون سازوں سے بھی یہ مطالبہ ہوا کہ قانون کسی بھی انسانی عمل کے خلاف نہ پڑے۔ گویا مقنن ناممکنات پر عمل کر کے دکھادیں ——— بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت تک قانونی ذمہ داری ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ہے جب تک کہ:-

(۱) کسی مضرت رساں اقدام کا ارادہ نہ ہو، یا

(۲) کسی غلطی یا لاپروائی اور غفلت کا ارتکاب نہ ہوا ہو ———

اگر کوئی ایسی دانستہ یا نادانستہ صورتِ حال پیدا ہو جائے جس کا واقعی قصور وار ایک شخص نہیں تو پھر اُس کی ذمہ داری اس پر ڈالنا، زیادتی ہے۔ کیونکہ آپ اس کے سر ایسے حالات کی ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں جو اس کے ارادے اور اختیار سے باہر تھی۔ بہ الفاظِ دیگر ایسی صورت میں آدمی کو مجرم اگر گردانا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ "ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے" تو ظاہر ہے کہ یہ 'ہرگز نہ ہونا' اُس کے بس کے باہر ہے، اور ایسی حالت میں اس حکم کی تعمیل نہیں کی جاسکتی، یہ قانون کی قباحت ہے اور ایسی ہے جو فطرتًا ناممکن حالات سے پیدا ہوتی ہے۔

ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ بظاہر نہایت مدلل اور معقول بحث کے بعد حاصل ہوا ہے لیکن بعض پیچیدگیاں بھی پیش نظر ہیں، مثلاً قانون کی خلاف ورزی کو جانچا کس معیار پر جائے؟ اہم سوال ہے۔ "ناممکن العمل" کا کیا معیار مقرر کیا جائے، یہ بھی کافی وسیع بحث ہے۔ کسی مدعا علیہ پر روایتی مفہوم میں معقول آدمی" کا اطلاق کر دیں تو ظاہر ہے کہ اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ ہم اس شخص سے ایسی باتوں کا تقاضہ یا مطالبہ کر رہے ہیں جن کی اس میں سکت اور اہلیت ہی نہیں ہے۔ مثلاً اس کی دیہی تعلیم و تربیت اس نہج پر ہوتی ہے کہ "معقولیت" کا جو معیار ہے وہ اس سے بالاتر ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ ہمارے سامنے جو شخص بیٹھا ہے ۔ وہ اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کی معقول رعایت کے باوصف اس معیار سے گرا ہوا ہے جس پر اسے پورا اُترنا چاہیے، تو ذمہ داری کا تعین ایک بڑا تحقیقی مسئلہ بن جائے گا اور معقول فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ اس تحقیق کے لئے ضروری یہ ہے کہ ہم اسی قسم کے حالات میں زندگی بسر کرنے والے کسی دوسرے شخص کی زندگی کو سامنے رکھیں، حالانکہ یہ بھی مشکل ہے کہ دو آدمیوں کے حالات اور واقعاتِ زندگی یکساں ہوں۔ رنگ، نسل، عمر، تہذیب اور مذہب کے فرق کے سبب یہ یکسانیت ختم ہو جاتی ہے، یا کم از کم اس میں فرق پڑ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حالات و واقعات سے قطع نظر کر کے، اگر خالص احکام کی پابندی کا مطالبہ اور انصاف کیا جائے تو نتیجہ بعض اوقات سخت اور جابرانہ ضرور ہو سکتا ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کیونکہ دوسرا راستہ بھی اتنا ہی ناہموار ہے یعنی اگر ہم کسی کی زندگی کے حالات اور واقعات اور ساری خامیوں، خوبیوں اور کوتاہیوں کو سامنے رکھیں تو بھی انصاف نہ ہو سکے گا کیونکہ اتنے عوامل کی تحقیق اور صحیح توازن ممکن نہیں ہے۔ اور قانون کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے جس کے گھماتے

ہی ہر تضاد اور عدم توازن آسان ہو جائے۔ اسی لئے درمیانی راہ اختیار کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے کیونکہ اس میں بعض مصلحتوں اور تقاضوں کے سبب "معقول آدمی" کا مفہوم اور معیار بھی مشروط کرنا ہوگا اور انسانی کمزوریوں کا لحاظ رکھنا ہوگا پھر ان کمزوریوں کی تعریف اور حدبندی لازم ہو جائے گی یہ کوئی آسان کام نہیں، اگرچہ عملاً ناگزیر ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی جن دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ خلاف ورزی، جرم یا غلطی کا تعین کرنا ایک اخلاقی فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اُس ارادے اور نیت کی نشان دہی کرنا جس کے لئے کوئی قدم اُٹھایا گیا ہے صرف واقعات کی چھان بین کا کام ہے۔ لیکن حقیقت پیچیدہ ہوتی ہے اور ہزار پردوں سے اُسے باہر لانا آسان کام نہیں —— اگر نیت اور ارادہ واقعی ایک حقیقت ہے تو وہ نجی حقیقت ہے جو خارجی عوامل سے اخذ کی جاتی ہے، بعض اوقات اس کی نشان دہی آسان ہوتی ہے۔ ہومز Holmes نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ٹھوکر لگنے اور لاتیں مارنے میں جو فرق ہے اُسے تو ایک کُتا بھی بآسانی سمجھ جاتا ہے لیکن بعض اوقات قانون کے تحت جس ارادے کا تعین کرنا ہوتا ہے وہ مخصوص نوعیت کا ہوتا ہے مثلاً ایسی صورت میں جب فوجداری کی سزاؤں کا انحصار اس ثبوت پر ہوتا ہے کہ مدعا علیہ نے دیدہ و دانستہ قانون کے خلاف حرکت کی ہے۔ نیت سے متعلق دفعات کبھی کبھی پیچیدہ اقتصادی ضابطوں میں پائی جاتی ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی آدمی کو کسی ایسی حرکت پر سزا نہ دے دی جائے جو بظاہر بے ضرر معلوم ہوتی ہے۔ خود میرا مشاہدہ یہ ہے کہ بعض مقدمات میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آیا اس معاملے میں علاج، مرض سے زیادہ بُرا تو نہیں ہوگا۔ جہاں تک

نیت اور ارادے کا معاملہ ہے تو اس میں ثبوت اور عدم ثبوت دونوں صورتوں میں حقیقت کا سُراغ لگانا مشکل ہوتا ہے، اور آخر کار معیار بھی ٹھیرتا ہے کہ "آیا یہ شخص ایسا نظر آتا ہے کہ قانون اور ضابطے کی پابندی کرے گا یا ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جو موقع پاتے ہی دھوکے اور فریب سے کام لے گا؟" بد قسمتی سے اس سوال کے بعد پھر ایک اور سوال یہ بھی ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کہیں یہ شخص ایسا ہی تو نہیں ہے جیسا کہ خود میں ہوں؟" [1]

غرض یہ کہ اس قسم کی بے شمار دُشواریاں ہیں جو اُس صورت میں پیدا ہوتی ہیں جب ہم چاہتے ہیں کہ قانون ایسا ہو کہ شہری اس کا احترام کریں اور اس کی پابندی کر سکیں، اور شہری پر ذمہ داری اُسی صورت میں عائد ہو جب اُس کی غلطی، جرم یا ناجائز ارادے کو ظاہر اور ثابت کیا جا سکے۔ لیکن ہمارے نظام قانون میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ ارادے اور نیت کو نظر انداز کر کے قانونی ذمہ داری عائد کر دی جاتی ہے۔

ایک اور ایسی ذمہ داری بھی ہوتی ہے جو قانون کی داخلی اخلاقیات کو تو مجروح نہیں کرتی لیکن قابلِ توجہ ضرور ہے۔ فرض کیجئے ایک دیوانہ آدمی میرا بٹوہ چُرا لیتا ہے، اس کی ذہنی حالت ایسی ہے کہ وہ نہ تو نجی املاک کے قوانین کو سمجھ

---

[1] اس سلسلہ میں بروک ایڈمس کا، جو چھٹے امریکی پریزیڈنٹ جان کوئنسی کے پوتے تھے، مضمون "نیت کا نیا تصور" دیکھنا چاہیے۔ یہ ۱۹۔ گرین بیگ ص ۱۲ (۱۹۰۶) میں شائع ہوا ہے۔ خیالات کچھ اشتراکی سے ہیں۔ مثلاً بروک کہتے ہیں کہ حاکم طبقے اپنے مفاد میں "نیت" کا مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔ یہی اعتراض ان کو نیت کی شہادت کے بارے میں ہے۔ ان آراء کے قطع نظر بروک ایڈمس نے "نیت" کے ثبوت کی مشکلات پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔

سکتا ہے اور نہ ان پر عمل کر سکتا ہے، ایسی حالت میں یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اسے جیل نہ بھیجا جائے، لیکن ایسی کوئی وجہ بہرحال نہیں ہے کہ میرا بٹوہ مجھے واپس نہ ملے اور اُسی کے پاس رہے۔ کیونکہ قانونی نقطۂ نظر سے اس پر یہ ذمے داری عائد ہے کہ وہ چُرایا ہوا بٹوہ واپس کرے۔ حالانکہ اُس نے چوری کرنے میں کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا، اور نہ اُس کی نیت ہی خراب تھی۔ اِسی اُصول کو ایک اور مثال سے سمجھیے۔ فرض کیجیے لین دین کے معاملے میں، ایک قرضدار اپنے قرضخواہ کو مطلوبہ رقم سے زیادہ ادائیگی کر دیتا ہے، غلطی دونوں سے ہوتی ہے اور اس غلطی میں دونوں شریک ہیں کہ کتنی رقم ملنی تھی اور کتنی دی گئی، ایسی صورت میں قرضخواہ سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ زائد رقم واپس کر دے حالانکہ اس نے پہلے جو زیادہ رقم وصول کر لی تھی وہ کوئی جرم نہ تھا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان نادانستہ طور پر غلطی یا غلط فہمی کے سبب، یا قانون سے عدم واقفیت کی بنا پر ایسے اقدامات کرتا ہے جن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو جاتا ہے چنانچہ اس طرح کی حق تلفیوں کا ازالہ کرنے کے لئے بہت سے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ ان میں بعض صورتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ اُن قاعدوں کے اندر جو "معاملات مثل معاہدہ" کے لئے قانون معاہدہ یا اور قوانین میں مُدوّن کئے جاتے ہیں، مگر معاہدات اور ٹارٹ کے عام قانون کے کچھ اثرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو واضح نہیں ہوتے لیکن محسوس کئے جاتے ہیں، ان قانونی اثرات کا مروجہ قوانین اور رومن قوانین دونوں تجزیہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کیونکہ بعض ایسی صورتوں میں جبکہ مدعا علیہ کی غلط کاری کے قطع نظر بعض دفعہ ایک فریق کے نقصان سے دوسرے کو فائدہ پہنچنے کے عمل کو روکنے کے لئے اِن قوانین کو بروئے کار لایا جاتا ہے جو اصل میں

ہرجانہ دلانے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔

جو قوانین نادانستہ غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں، ان سے یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ قانون کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو ان مضامین میں بیان کئے گئے ہیں کیونکہ ہم نے قانون کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ انسانی عمل اور طرزِ عمل کو ضابطوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب انسان سے غلطی یا غلط فہمی کے سبب کوئی حرکت سرزد ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا عمل اور طرزِ عمل قانون کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ کوئی بھی شخص معاملات مثل معاہدہ کے قوانین کا مطالعہ یہ جاننے کے لئے تو نہیں کرتا کہ اُسے ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے، جب اُسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ اس مشکل کا ایک حل موجود ہے۔ قانونی رشتوں کے نظام کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ کچھ ایسے ضمنی ضابطے اور قاعدے بھی موجود ہوں جن کے ذریعہ نادانستہ حق تلفی کے اثرات و نتائج کا ازالہ کیا جا سکے۔ یہاں بھی وہ صورت پیش آئے گی جو زمانہ ماضی سے نافذ ہونے والے قوانین کی صورت میں پیش آتی ہے اور اگر کوئی ایسا نظام قانون بنا دیا جائے جس میں صرف زمانہ سابق سے نافذ ہونے والے قوانین ہی موجود ہوں تو یہ ایک فریب اور ڈھونگ ہوگا جو لیوس کیرول (Lewis Carroll) اور فرانز کفکا (Franz Kafka) ہی کو زیب دیتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ مروجہ قوانین کے اثرات کے نقائص کو دور کرنے کے لئے سابق العمل قوانین کا سہارا لیا جائے۔ چنانچہ ضابطوں کا عمل یہ ہونا چاہیے کہ وہ نادانستہ غلطیوں کے اثرات کا ازالہ کریں۔ ہاں اگر یہ ناممکن سی شکل پیدا ہو جائے کہ ہر بات نادانستہ ہی سرزد ہونے لگے تو پھر یہ سمجھنا دشوار ہو جائے گا کہ اس کے تدارک کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے اس لئے عام قانون کے تحت ایسے قاعدے بھی

مرتّب کئے جاتے ہیں (وہ قانون ہی کا جزو ہوتے ہیں) اور قانونی جواز رکھتے ہیں جو قانون کا مقصد پورا کریں اور نادانستہ حق تلفیوں کی تلافی کے ڈھنگ بتلائیں یہ ذیلی قواعد تعداد میں کم ہوں گے کیونکہ نادانستگی عام مرض تو نہیں۔

یہ درست ہے کہ اگر نادانستہ طور پر کسی کو ناجائز فائدہ حاصل ہو جائے تو اس کی تلافی قانون کے تحت کی جا سکتی ہے، لیکن یہ کوئی ایسا اصول نہیں ہے جس کا ہر حالت میں اطلاق ہو سکے۔ بعض اوقات غلطی اور بدنیتی کے بغیر بھی بعض قانونی ذمّے داریاں عائد ہوتی رہتی ہیں، اور یہ پوری ہونی چاہئیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے بہت سارے قوانین موجود ہیں جن کا تعلق اس امر سے ہے کہ اگر کسی کی حرکات اور سرگرمیوں کے نتیجے میں نقصان پہنچے تو اس کی ذمّے داری متعلقہ شخص پر ڈالی جا سکے۔ مثلاً اگر آپ تجربے اور کسی اور مقصد کے لئے بہت بڑے دھماکے کریں اور اس سلسلے میں ضروری احتیاطی تدابیر بھی اختیار کریں۔ لیکن اگر اس سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو آپ اس کی ذمّہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ حالانکہ آپ کا ارادہ نقصان پہنچانے کا نہ تھا اور آپ نے احتیاطی تدابیر بھی اختیار کی تھیں۔ قانون تو ایسے معاملوں میں بہرحال یہی فیصلہ دے گا کہ انسان اپنے عمل کا ذمّہ دار اور جواب دِہ ہے[1]۔

اقتصادی اصولوں کی روشنی میں بھی دیکھیں تو اس ذمّہ داری کا جواز موجود ہے۔ کیونکہ جب کوئی صنعت اور کاروبار شروع کیا جائے اور اس کے مصارف اور نتائج کا اندازہ لگایا جائے تو یہ بھی لحاظ رکھا جائے کہ آئندہ معاشرے پر اس کے کیا اثرات ہوں گے اور اگر کسی فرد کو اس کاروبار یا عمل سے نقصان

---

[1] ملاحظہ ہو "ری اسٹیٹ منٹ آف ٹارٹس" امریکن لا انسٹی ٹیوٹ دفعہ ۵۱۹ زیر عنوان "غیر معمولی خطرناک عمل کے، باوصف احتیاط، پیدا کردہ نقصانات"۔

ہو جائے تو کیسے بجا ہوگی۔ دھماکے کی کارروائیوں میں بہت سارے ایسے خطرات پوشیدہ ہوتے ہیں جو احتیاطی تدابیر کے بعد بھی رونما ہو سکتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ بلا ارادہ کسی شخص یا املاک کو نقصان پہنچ جائے، اگر سڑک کا کوئی ٹھیکیدار پہاڑی کو کاٹ کر سڑک نکالنے کے لئے دھماکے کرتا ہے اور اُسے صرف اُن ہی غلطیوں کا ذمہ دار قرار دیا جائے جو بالکل واضح، مُسلّم اور نظر کے سامنے ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ٹھیکیداروں کو اس بات کی اجازت دے رہے ہیں کہ اُنھیں کھدائی اور کٹائی کے لئے اور زیادہ بے ضرر اور محفوظ ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ مروجہ طریقہ ہی کافی ہے کیونکہ اگر احتیاط کے باوجود کوئی نقصان ہو جائے تو بیچارے ٹھیکیدار کا کیا قصور، یہ تو محض اتفاقی امر ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوگا کہ اس کے اقتصادی اندازے غلط ہوں گے اور اس کے اس غلط تخمینے کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑے گا۔ اِس نقصان کے تدارک کے لئے ہم دھماکوں پر ایک اُصول کی شکل میں ایک ٹیکس عائد کرنا چاہتے ہیں اور وہ اُصول یہ ہے کہ ان دھماکوں سے جو بھی نقصان ہوگا ٹھیکیدار اُس کی ذمہ داری قبول کرے گا، چاہے یہ نقصان اُس کی غلطی یا غفلت کے سبب ہوا ہو یا کسی اور وجہ سے، ذمہ داری بہر حال اُسی پر ہوگی۔

اِس ذمہ داری اور قانون کی اخلاقی قدروں کا تعلق ثابت کرنے کے لئے ہم ایک اور ٹیکس کی مثال لیتے ہیں۔ بکری ٹیکس بہت عام چیز ہے، جس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہم اشیاء کی فروخت پر پابندی لگا رہے ہیں بلکہ فروخت کرنے کے عمل پر ایک محصول عائد کر رہے ہیں اور بس۔ اسی طرح دھماکوں کے عمل کا اُصول ہے جس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ٹھیکیدار کو یہ حکم دے رہے ہیں کہ وہ ایسا آتشگیر مادّہ استعمال کرے جس سے کسی طرح کا بھی کوئی نقصان ہی نہ پہنچ سکے۔

بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اس کے عمل اور طرزِ عمل پر ایک خاص قسم کی ذمہ داری امکانی نقصان کی تلافی کے لئے ڈالنا چاہتے ہیں۔ قانون کا داخلی اخلاق بھی یہ نہیں کہتا کہ انسان پر ایسی کڑی ذمہ داری مثلاً دھماکے کاموں پر لگا دی جائے کہ وہ اُسے پُوری ہی نہ کر سکیں۔ قانون کبھی ناممکنات کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ ان اعمال و حرکات کی واضح طور پر نشان دہی کر دی جائے جن کے سلسلے میں خاص قانونی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، تاکہ متعلقہ لوگ زیادہ سے زیادہ محتاط رہیں اور احتمالی نقصان کی پابجائی کے لئے آمادہ۔

اور اگر یہ اُصول طے کر لیا جائے کہ جن صنعتوں اور کاموں میں خاص قسم کے خطرات پنہاں ہوتے ہیں، اُنھیں نقصان کی مکمل طور پر تلافی کرنی ہوگی تو پھر اس اُصول کا دائرہ بہت دُور تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض ملکوں میں اُن کاروں پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے جو تفریح یا نجی کاموں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا رُجحان ہے جس کے تحت سب پر بلاتفریق ذمہ داری عائد کر دی جاتی ہے، اور یہ رُجحان ایسا عام ہوتا جا رہا ہے کہ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ مقنن ایک ایسے مستقبل کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں جہاں قانونی ذمہ داری کے تعین میں غلطی اور ارادے کا کوئی دخل قابلِ توجہ نہیں رہے گا۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا مستقبل کبھی نہیں آئے گا۔ اگر خاص خاص قسم کی سرگرمیوں اور حرکتوں پر نہیں بلکہ تمام سرگرمیوں پر کڑی ذمہ داریاں لگا دی جائیں تو سبب اور نتیجے کے قدرتی اُصول کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہیگا۔ فرض کیجیے کہ شاعر کوئی دردانگیز نظم لکھتا ہے جسے کوئی ناکام عاشق پڑھتا ہے اور اس قدر بے حال ہو جاتا ہے کہ اپنی جان سے بیزار ہو کر خودکشی کر بیٹھتا ہے۔ بھلا بتائیے، اس صورت میں اگر سبب اور نتیجے کا اُصول باقی نہ ہو تو غریب عاشق

کی موت کا محرک اور ذمہ دار کون ٹھہرے گا، کیا شاعر اس کا ذمّے دار ہے یا وہ ظالم محبوبہ، جو عاشق کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، یا شاید وہ استاد، جس نے اس میں شاعری کا اتنا گہرا ذوق اور احساس بیدار کیا؟ پھر اگر ایک آدمی شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنی بیوی کو گولی مار دے تو اس واردات کی ذمہ داری متعلقہ افراد میں سے کس پر عائد ہوگی، خود گولی مارنے والے پر، یا اس پر جس نے اسے بندوق دی تھی، یا شراب فروش پر، یا اس دوست پر، جس نے اسے طلاق دینے کی حرکت سے باز رکھا تھا، کیونکہ اگر وہ طلاق دے دیتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ لہٰذا میرا خیال صحیح ہے کہ غلطی اور ارادے کو ذمہ داری کے تعین میں سوائے مخصوص حالات کے دخل رہے گا اور رہنا چاہیے۔

اصل ذمہ داری کے تعین میں بعض اوقات اس قسم کی دشواریاں ناگزیر ہوتی ہیں، اسی قسم کی ایک ذمہ داری مزدوروں کے قوانینِ معاوضہ کے تحت عائد کی گئی ہے، یہ بات تو بہر حال ضروری ہے کہ مزدور کی ملازمت اور اس کی بیماری یا معذوری کے درمیان بغرض ادائی معاوضہ کوئی نہ کوئی تعلق ظاہر ہونا چاہیے۔ متعلقہ قانون میں وضاحت یہ کی گئی ہے کہ اگر مزدور بیمار یا متضرر ہو تو یہ ضروری ہے کہ وہ ملازمت کے دوران ہو اور اسی کام کی وجہ سے ہوا ہو تو معاوضہ دیا جائے گا۔ اب اس دفعہ کی تعبیر کرنے میں بڑی غیر یقینی صورتِ حال سامنے آجاتی ہے اور نظائر میں پیچیدہ سوالات پیدا ہوتے اور حل کئے گئے ہیں۔ اب اگر غیر مشروط طور پر قانونی ذمہ داری ہر ضرر اور نقصان کے لئے مقرر کردی جائے تو ہم اس اصول کا اطلاق کیسے کریں گے جس میں صرف کہا گیا ہے کہ مدعی کو جو ضرر یا نقصان پہنچے وہ مدعا علیہ کے "طرزِ عمل کی بنا پر" ہونا چاہیے۔ کیونکہ عمل اور طرزِ عمل کی اصطلاحیں پیچیدہ

وسیع ہیں۔

اب تک ہم نے ذمّہ داری کے تعین کے مسئلہ کی جو وضاحت کی ہے وہ مکمل اور قطعی نہیں ہے۔ بعض ذمّہ داریاں اور قسم کی بھی ہوتی ہیں جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غیر یقینی اور مخلوط قانونی مقاصد کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ غیر مشروط ذمہ داری کے تعین کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ زیادہ توجّہ اور احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ بہ نسبت ان ضابطوں کے جن میں یہ ثابت کرنا ہرجہ پانے کے لئے ضروری ہے کہ توجہ اور احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ انسانی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن میں ذمّے داری کا تعین خاصا پیچیدہ عمل بن جاتا ہے اور مشروط ذمہ داری اور غیر مشروط ذمہ داری کے مابین حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً جب قانوناً قیاس ہو کہ قصور مدعا علیہ کا تھا اور بارِ تردید اُس پر پڑ جائے۔ آخر میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ معاہدوں کی ذمہ داریاں عام طور پر کڑی ہوتی ہیں حالانکہ اس میں بھی بعض ناگہانی باتوں کی وجہ سے کارگزاری متاثر ہوسکتی ہے۔ لیکن ٹھیکیدار یہ کہہ کر نہیں بچ سکتا کہ اُس نے تو بھرپور کوشش کی لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا۔ قانون کے داخلی اخلاق کے لئے اس قسم کی ذمہ داری کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ قانون خود انسان پر کوئی ایسا بار نہیں ڈالتا جسے وہ برداشت نہ کرسکے۔ لیکن اگر وہ ایسی ذمہ داری قبول کرلے جو اُس کی بساط اور وسائل سے باہر ہو تو وہ عذر و معذرت پیش کرکے بچ نہیں سکے گا اور ہر عذر کو آفاتِ فطری اور ناگہانی کا درجہ نہیں دے سکے گا۔

اب ہم ایک اور بحث شروع کرتے ہیں اور اس کا تعلق اِس اصول کی خلاف ورزی سے ہے کہ قانون کے تحت ناممکنات کا حکم نہیں دیا جانا چاہیے

فوجداری کے قوانین میں یہ مجرمانہ ذمہ داری نہایت سخت ہوتی ہے کیونکہ یہ قوانین ایسے ہوتے ہیں جن کے تحت آدمی مجرم قرار دیا جاسکتا ہے باوجودیکہ اس نے احتیاط سے کام کیا تھا اور اس کی نیت مجرمانہ نہیں تھی۔ جدید زمانے میں اقتصادیات، صحت عامّہ اور تحفظ کے ضابطوں میں اس طرح کی ذمہ داری کا نہایت فراخ دلی سے استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ منشیات، جوئے اور شراب کے قبضے میں رکھنے کے مقدموں میں بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

ہمارے قوانین میں غیر مشروط مجرمانہ ذمّہ داری عائد کرنے کو کبھی بھی مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ جہاں کہیں بھی اس قانون ذمہ داری کا اطلاق کیا گیا ہمیشہ احتجاج کیا گیا اور اس کا دفاع کیا گیا، اور عام طور پر لاچارگی کا سہارا لیا گیا۔ بہرحال یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ موجودہ نظام قانون سازی میں یہ قوانین نہ صرف جاری ہیں بلکہ بڑھ رہے ہیں۔ اس میں مقدمات قائم ہیں اور اُن کی پیری کرنے والے کو بڑی آسانیاں ہیں اور وہ ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ ان قوانین میں بظاہر جو ناانصافیاں ہیں ان کا علاج اس طرح کیا جاتا ہے کہ خاص خاص صورتوں میں ہی ایسے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ وکلائے سرکار کہتے ہیں کہ ان قوانین کی زد میں بے گناہ لوگ بھی آجاتے ہیں، لیکن ہم عملاً اصل مجرم ہی کو سزاوار ٹھیراتے ہیں اور اختیار تمیزی استعمال کر کے مقدمات چلاتے ہیں، ان کو یہ سہولت بھی رہتی ہے کہ حکومت مقدمہ تیار کرتے وقت غلطی، جرم یا ارادے کو ثابت کرنے کی زحمت سے بچ جاتی ہے کیونکہ یہ بڑا مشکل کام ہے خصوصاً ایسے حالات میں جب ضابطے کی پیچیدہ کارروائیوں سے گزرنا ہو، جب قطعی ذمہ داری کے ساتھ سنگین سزائیں بھی ہوتی ہیں جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو مقدمہ چلانے والے کی پوزیشن اور بہتر ہو جاتی ہے۔ اِن حالات میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مقدمہ کو سماعت تک پہنچنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بلکہ مدعا علیہ

کو کڑی سزا یا بھاری جرمانے کی دھونس دے کر ہی کام چلا لیا جاتا ہے اور جرم کا اقرار کرا لیا جاتا ہے اور جہاں گنجائش ہوتی ہے، عدالت کے باہر سے معاملہ طے کر لیا جاتا ہے۔ سخت سزائیں بھی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں عوامی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی آدمی سے کوئی لغزش بھی ہو مگر وہ جانتا ہے کہ اس پر کسی نہ کسی طرح جرم ثابت کیا جا سکتا ہے اور اسے مجرم گردانا جا سکتا ہے تو اس صورت میں اگر اسے چھوڑ دیا جائے اور مجرم کہلانے کی ندامت سے بچا لیا جائے تو وہ آدمی، گو در اصل مجرم نہیں ہوتا، بے حد شکر گزار ہوتا ہے اور پورے خلوص دل سے وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ وہ بہت زیادہ دیانت اور شرافت سے کام کرے گا۔

بہر حال یہ زبردستی کی قانونی ذمہ داری ہے جو کسی آدمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے دھونس دے کر اس کے سر تھوپی جا سکتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں یہ رجحان بہت عام رہا کیونکہ حکام کے پاس کام بہت زیادہ تھا اور وہ پیچیدہ اقتصادی ضابطوں کی خلاف ورزی اور پیچیدہ شہادت سے ثابت کرنے کی زحمت سے بچنے کے لئے کوئی سیدھا طریقہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال خواہ مخواہ کسی کے سر ذمہ داری تھوپنا ایک خطرناک رجحان ہے اور ہر وہ شخص اس کی مذمت کرے گا جو یہ چاہتا ہے کہ قانون کا احترام اس کے تمام ضابطوں اور اصولوں کے مطابق کیا جائے اور یہ نہ ہو کہ سرکاری حکام اپنی مرضی کے مطابق جس کو چاہیں مجرم قرار دلوا سکیں اور دھونس اور دھمکی سے کام چلا لیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ کچھ عرصے سے اس برائی کے خلاف نہایت بااثر اور اہم لوگوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے اور وہ ان تمام برائیوں کا تدارک چاہتے ہیں جو غیر مشروط مجرمانہ ذمہ داری عائد کرنے کے سلسلے میں پیدا ہوتی ہیں۔[1]

(1 یہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ہم ایسے قوانین سے بحث کر رہے ہیں جن کا تعلق ناممکنات کے مطالبے سے تھا۔ اس بحث کو ختم کرنے سے قبل دو اور باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، ان میں ایک تو یہ ہے کہ غیر معمولی دشوار اور ناممکن کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔ کوئی ایسا قانون جس میں ضرورت سے زیادہ مطالبے، شرائط اور تقاضے ہوں، سخت گیر یا غیر منصفانہ ہو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ قانونی نظام کے بنیادی مقاصد کی نفی کرتا ہو۔ اس قانون کی مانند جس میں ایسی چیز کا مطالبہ کیا جائے جو لازماً ناممکن ہو۔ ان ہی دونوں کے درمیان وہ مقام ہے جہاں قانون کی داخلی اور خارجی اخلاقیات ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ اس سوال کا کہ کون سی چیز ناممکن ہے؟ فیصلہ کرنے کے لئے انسان کی فطرت اور کائنات کے حقائق کو سامنے رکھنا چاہیے اور ان حقیقتوں کو بھی جو معلومات اور تجربات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ آج اگر کسی قانون کے تحت کسی قسم کے مذہبی اور سیاسی عقائد کو ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے تو اس قانون کی مخالفت اس بنا پر کی جاتی ہے کہ یہ انفرادی اور شخصی آزادی میں مداخلت بے جا کے مترادف ہے۔ تھامس جیفرسن کا خیال ذرا مختلف تھا، مذہبی آزادی کے متعلق ورجینیا کے قانون کے دیباچے میں انھوں نے ایسے قوانین کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ ان کا مقصد انسان کو ناممکنات پر عمل کے لئے مجبور کرنا ہے۔

(فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) ۱۵ ملاحظہ ہو "جنرل پرنسپلز آف کریمنل لا" از ہال (سنہ ۱۹۶۰ء) ص ۳۵۱-۳۵۰ "ایمس آف کریمنل لا" از ہارٹ۔ ۲۳ "لا اینڈ کنٹمپوریری پرابلمس" (سنہ ۱۹۵۸ء) ص ۴۴۱-۴۰۱ "امریکن لا انسٹی ٹیوٹ۔ ماڈل پینل کوڈ (سنہ ۱۹۶۲ء) دفعات ۱ اور ۲ کے اجزاء

"ہم سمجھتے ہیں کہ انسانوں کے خیالات اور عقائد کا انحصار خود ان کی مرضی پر نہیں ہوتا بلکہ ان کے ذہن کو جو باتیں سمجھائی جاتی ہیں، اور جو ثبوت دیئے جاتے ہیں وہ ان کے اثرات غیر شعوری طور پر قبول کر لیتے ہیں"[1]

---

[1] "دی پیپرز آف تھامس جیفرسن" - جلد دوم ص ۵۴۵

قوانین کا ثبات

(Contancy of Law)

قانون کے داخلی اخلاق کے اصولوں میں ایک یہ ہے کہ قوانین ایسے ہونے چاہئیں جو آئے دن بدلے نہ جائیں۔ لیکن آئینی دائرے میں رہ کر ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہر کوئی آئینی نظام ایسا ہوگا جس میں اتنی نادانی کا مظاہرہ کیا جائے کہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ کوئی بھی قانون مثال کے طور پر سال بھر میں ایک بار سے زیادہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف آئین سازوں کو اس بات کی بڑی فکر رہی ہے کہ قوانین کا اطلاق زمانۂ ماضی سے کرنے کی روش مضر ہے اور اس پر پابندی لگا دینی چاہیے۔ اب دیکھا جائے تو دونوں ہی نقصان دہ ہیں۔ سابق العمل قوانین سے بھی نقصان ہوتا ہے، اور بار بار قانون کی تبدیلی بھی مضر رساں ہوتی ہے، اور یہ دونوں باتیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ قوانین کو ثبات و دوام حاصل نہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کہ میڈیسن (Madison) نے آئین میں سابق العمل قوانین کی اور معاہدوں کی ذمہ داری سے انحراف کی دفعات کے خلاف تبصرہ کرتے ہوئے جو زبان استعمال کی ہے اُس کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سابق العمل قوانین کے نتائج کے مقابلے میں بار بار بدلنے والے قوانین کو زیادہ بُرا قرار دیا ہے۔

عوامی اداروں کے بار بار بدلنے والے رجحانات اور نئی نئی پالیسی کرتے رہنے کی عادت سے امریکہ کے سنجیدہ لوگ تنگ آچکے ہیں۔ انھوں نے نہایت غم و غصے کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے کہ روز قانون بدلتے رہتے ہیں، اور قانونی مداخلت بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ قوم کے محنت کش اور کم علم طبقے کے لئے بڑی مصیبت ہے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قانون سازی کی پہلی مداخلت آخری نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے[1]۔

سپریم کورٹ کے فیصلوں میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ بار بار اور اچانک بدلنے والے قوانین اور زمانۂ سابق سے نافذ العمل قوانین یکساں مسائل پیدا کرتے ہیں۔ سابق العمل قوانین کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے پرانے قانون کے تحت درست کام کیا ہو اور پھر قانون بدلا تو ان کے پرانے عمل پر جو قانون کے ماتحت تھا سخت اور ناقابل برداشت گرفت ہونے لگی۔ البتہ بعض اوقات یہ ہو سکتا ہے کہ سابق عمل کی تلافی کی جا سکے بشرطیکہ پہلے سے یہ تنبیہ کر دی گئی ہو کہ اس قانون میں تبدیلی کا امکان ہے، اور جب تبدیلی ہو تو اس قدر اچانک نافذ نہ ہو کہ نئے قانون کے تحت عمل کو ڈھالنے کی مہلت ہی نہ مل سکے۔

چنانچہ عدالت عالیہ نے فیصلہ دیا:۔

"یہ طے شدہ امر ہے کہ (میعاد سماعت کے قوانین) میں ترمیم کی جا سکتی ہے اور مقررہ وقت کو مختصر کیا جا سکتا ہے لیکن اُسی صورت میں جبکہ متعلقہ کام کی میعاد ابھی باقی ہو اور اتنی مہلت مل سکے کہ ترمیم قانون کے نفاذ سے پہلے انسان اپنا چارۂ کار اختیار کر سکے"[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو "دی فیڈرلسٹ" نمبر ۴۴

[2] ملاحظہ ہو "اوچاوا بنام ہرنانڈز موریلز" ۲۰۳ یونائیڈڈ اسٹیٹس (۱۹۱۳) صفحہ ۱۳۹ بر صفحات ۲-۱۶۱

سرکاری کارروائی اور مسلّمہ ضابطے کے مابین مطابقت :-

اب ہم قانون کے داخلی اخلاق کے سب سے پیچیدہ اور اہم ترین عنصر کا جائزہ لیں گے۔ اور وہ عنصر یہ ہے کہ سرکاری کارروائی اور قانون میں مطابقت اور ربط ہونا چاہیے۔ ہزاروں ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں جب اس مطابقت کو صدمہ پہنچتا ہے، بعض اوقات قانون کا غلط مفہوم لیا جاتا ہے کبھی قانون تک بوجہ لاعلمی یا کم علمی پوری رسائی نہیں ہوتی بعض اوقات نظامِ قانون کی وقعت اور حرمت کو برقرار رکھنے والی باتوں کا گہرا شعور نہیں ہوتا، اس کے علاوہ رشوت، تعصب، قانون سے بے توجہی اور بے نیازی، شر انگیزی، ذاتی اقتدار کی ہوس، غرض ہزاروں باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن سے قانون کی بالادستی پر ضرب پڑ سکتی ہے اور انتظامیہ بے لگام ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اگر قانون کی عظمت اور حرمت کو برقرار رکھنا ہو تو اس کے بھی ہزار طریقے اور طریق کار ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک مقررہ دستور العمل کی پابندی یعنی جب کوئی اقدام قانون کے مطابق نہیں ہوتا تو متاثرہ فرد کو عدالت سے رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اور مخالف گواہوں پر جرح کرنے کا حق بھی دیا جاتا ہے۔ اس میں ہم حبس بے جا کے خلاف خصوصی دادرسی کے حق کو بھی شامل کر سکتے ہیں، اور ہر فیصلہ کے خلاف اور بڑی عدالت میں اپیل کرنے کی گنجائش کو بھی۔ دستوری مسائل اٹھانے کا حق بھی اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اگر قانون اور اس پر عمل درآمد کرنے کے اصولوں اور ضابطوں میں کوئی تطابق نہ ہو اور قانونی جواز کے بغیر اندھا دھند اقدامات کئے جائیں تو پھر ایسے بے اصولے پن کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ آئین کی تحریری دفعات، اور اس پر عمل درآمد کے مابین کوئی رشتہ اور رابطہ باقی نہ رہے گا۔

ہمارے ملک میں یہ کام عدالتوں کو سونپا گیا ہے کہ اگر مسلّمہ قوانین اور ان

پر عملدر آمد میں کوئی ٹکراؤ یا فرق ہو تو اس کی روک تھام کی جائے' اس تقسیم کار کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ ذمہ داری ایسے لوگوں کو سونپی گئی ہے جو جہاں دیدہ ہوں اور جس طرح قانون پر عمل ہوتا ہے' اُس کا عوامی محاسبہ کیا جا سکے اور مثالی طور پر کھلے بندوں قانون کی عظمت کو برقرار رکھا جا سکے۔ لیکن اگر قانون کے غیر قانونی استعمال کے تدارک کی ساری ذمہ داری صرف عدالتوں پر ڈال دی جائے تو ایسا نظام نہایت ناقص ہوگا، کیونکہ ضروری نہیں کہ قانون کی غلط طور پر زد میں آنے والا ہر شخص ذہنی اور مالی اعتبار سے مقدمہ بازی کا اہل ہو۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جہاں کہیں بھی پولیس کی لاقانونیت کو صرف عدالتی ذرائع سے روکنے کی کوشش کی گئی، زیادہ کامیابی نہیں ہوئی —— اور یہ بُرائی اس لئے پیدا ہوتی کہ چھوٹی ماتحت عدالتیں عام طور پر پولیس کے بنائے ہوئے مقدموں کو درست تسلیم کر کے پولیس کے حق میں فیصلے دے دیتی ہیں تاکہ پولیس کا' جو نظم و ضبط کی ذمہ دار ہے وقار نہ گرے پولیس کی لاقانونیت پر قابو پانے کے لئے ایک اور مستعد اور نگراں ادارے کی ضرورت ہے جو تحریری یا زبانی شکایت موصول ہوتے ہی فوراً حرکت میں آجائے ناروے' سویڈن اور اب انگلستان میں ایک افسر جسے (Gmbudsman) آم بڈس مین کہتے ہیں اس کام پر مقرر ہوتا ہے۔

بعض صورتوں میں جج ہی قوانین بناتے ہیں؛ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقاضائے قانون اور سرکاری کارروائی میں فرق جو ماتحت عدالتیں قرار دیتی ہیں' اگر صحیح نہ ہو تو بلا وجہ احکام اور عملدرآمد کے اندرونی اور اخلاقی تطابق کو صدمہ پہنچا ہے' لیکن سپریم کورٹ کی کارروائی سے ایسا نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ سپریم کورٹ تو خود بھی قانون سازی کرتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی حیثیت سے قانون کی جو تعبیر سپریم کورٹ کرتی ہے وہ حرفِ آخر ہے اور انتظامیہ کو اس کی پابندی

لازمی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص دائرہ کار رکھنے والی سپریم کورٹ خود قانون کے دائرے کے باہر قدم نہیں رکھ سکتی، کیونکہ وہ تو قانون سازی کر کے انصاف اور حق طلب کرنے والوں کی راہ متعین کرتی ہے ــــ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ عدالت عالیہ نے جو راہ دکھائی ہے بعض اوقات وہ بھی ناقابلِ عمل ہو اور خود عدالت کے ارکان بھی اس راہ پر نہ چل سکتے ہوں۔ جب عدالت خود قانون بناتی ہے تو وہ تمام عوامل جو عدالتی کارروائی اور قانون میں بے ربطی کا سبب بن سکتے ہیں (جیسے وہ قانون سازی کے دوسرے طریقوں سے بھی متعلق ہو کر انھیں متاثر کرتے ہیں) سپریم کورٹ کے بنائے ہوئے قانون کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔ مثلاً واضح عام اُصولوں کا عدم شعور، متضاد فیصلے اور ہدایات کی بار بار تبدیلیاں اور قانون میں زمانہ کے سابق سے تغیر و تبدل، یہ خرابیاں جس طرح غیر ماہر مجلس قانون ساز کے قوانین میں پیدا ہو سکتی ہیں، اسی طرح لاپروائی سے دئے ہوئے اعلیٰ عدالت کے فیصلوں میں بھی۔

قانون اور سرکاری اقدامات کی مطابقت کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ یہ آتا ہے کہ قانون کی تشریح و تعبیر کس طرح کی گئی ہے۔ قانون پسندی اور قانون کی مقبولیت کا تقاضا ہے کہ جج اور دوسرے حکام قانون کا نفاذ اور اطلاق اپنی پسند کی یا خالص لفظی تشریح کر کے نہ کریں بلکہ تعبیر و تشریح کے اُن اُصولوں کو پیش نظر رکھیں جو پورے نظامِ قانون میں ان کے وجود کے منشاء کے مطابق اور ان کے شایانِ شان ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اُصول کون سے ہیں؟ ہمیرے خیال میں تو اس کا بہترین اور مختصر ترین جواب ۱۵۸۴ء میں اُسی وقت دے دیا گیا تھا جب وزارتِ خزانہ کے حکام بالا ہیڈن کے مقدمے میں تشریح و توضیح کے ایک مشکل مسئلے سے دوچار ہوئے۔

اُنھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ عام طور پر ہر قسم کے قوانین کی صحیح اور سچی تعبیر

کے لئے یہ ضروری ہے کہ چار باتوں کا لحاظ رکھا جائے، اور وہ یہ ہیں :-

(۱) متعلقہ ایکٹ کے نفاذ سے پہلے عام قانون کیا رائج تھا۔

(۲) وہ کون سی خامیاں اور خرابیاں تھیں جن کے متعلق مروجہ قانون خاموش تھا۔

(۳) پارلیمنٹ نے اس کا کیا علاج تجویز کیا، اور اس عوامی خرابی کو دُور کرنے کی کیا تدابیر اختیار کیں؟

(۴) اصلاح کا اصل سبب معلوم کیا جائے، اور جب اس کا تعین ہو جائے تو عدالتوں کا فرض منصبی واضح ہے اور وہ یہ کہ قانون کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ جو خامیاں اور خرابیاں نئی قانون سازی کی بنیاد تھیں دُور ہوں اور انصاف کے تقاضے پُورے ہوں۔

اِس تجزیے پر ایک ہی تنقید کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں پانچواں نکتہ بھی شامل ہونا چاہیے اور وہ کچھ اس انداز کا ہونا چاہیے: "جن لوگوں کو قانون کے الفاظ و عبارت سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے وہ نئے قانون کا منشا کس طرح سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ قانون کو ایسا معمّہ تو نہیں ہونا چاہیے جسے صرف عدالت عالیہ کے جج صاحبان ہی سمجھ سکیں، بلکہ یہ ضروری ہے کہ قانون کی تعمیل کرنے والے بھی اس کے منشا و مفہوم کا صحیح ادراک کر سکیں۔

اگر ہیڈن (Haydon) کے مقدمے کے فیصلے کو پیش نظر رکھیں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی قانون کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ ان عوامی خرابیوں کو سامنے رکھیں جن کے تدارک کے لئے قانون بنایا گیا ہے، تو پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قانون کی تشریح و تعبیر کس طرح کی جائے اور اُس کی تفہیم میں جو اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اُنھیں کیسے دُور کیا جائے۔ اِس میں

بعض اُلجھنیں ایسی ہیں کہ وہ بڑی معقول نظر آتی ہیں، اور عام شعور اور معمولی سمجھ کے لوگ اُنھیں اس طرح قبول کر لیتے ہیں کہ گویا وہ صحیح طور پر تعبیر قانون کا مسلّمہ اُصول ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال "گرے" (Gray) کے الفاظ میں پیش کی جاسکتی ہے:-

قانون کی تعبیر کا مطلب عام طور پر یہی لیا جاتا ہے کہ اس حقیقت کا سراغ لگایا جائے کہ مجلس قانون ساز نے اِس قانون کا منشاء کیا رکھا ہے؛ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر مقننہ کا کوئی معیّن منشاء ہو تو پھر تفہیم میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعبیر قانون کی دُشواریاں اس وقت پیش آتی ہیں جب خود مجلس قانون ساز کی نظر میں کوئی مفہوم نہ رہا ہو یعنی جب قانون کے بارے میں ایسے سوالات پیدا کئے جائیں جو مجلس قانون ساز کے مباحثے کے وقت اور منظوری کے وقت اراکین کے ذہن ہی میں نہ تھے ایسی صورتوں میں جب جج صاحبان یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ قانون سازوں کا اصل مطلب یہ تھا تو درحقیقت وہ خود قانون سازی کرنے لگتے ہیں اور اِن خامیوں کو دُور کرتے ہیں جو قانون میں محسوس ہوتی ہیں[1]۔ بہرحال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات قانون کا مسودہ تیار کرتے وقت بعض ایسی صورتیں اور حالتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں جن کے رونما ہونے کا بظاہر امکان رہتا ہے۔ اور جب مسودہ تیار کرنے والے کی توجہ اس خامی یا نقص کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے تو وہ عذر معذرت پیش کرنے لگتا ہے۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے اور قانون کی تعبیر کے سلسلے میں جو اصل مسائل سامنے آتے ہیں ان میں مسودے کی یہ خامی عام طور پر شمار نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] ملاحظہ ہو "دی نیچر اینڈ سورسیس آف لا" (طبع ثانی۔ ۱۹۲۱) ص ۱۷۲

عام طور پر قانون میں اصل مقاصد کو ضرور پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ البتہ وہ بعض اوقات سپاٹ اور نامکمل ہوتے ہیں۔

گرے کا تصور یہ ہے کہ قانون کی غرض نفاذ بہت مختص اور مقرر ہوتی ہے اور قانون کے الفاظ کے معانی منشاء کی بڑی صاف نشان دہی کرتے ہیں۔ اس نظریے کے لحاظ سے انسانی طرز عمل کی عام کیفیت نہیں بلکہ واضح طور پر خاص صورتوں کے لئے اور مخصوص شکایتوں کے دفعیے کے لئے نہ کہ عام خرابیوں کی اصلاح کے لئے قانون وضع ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس نظریئے کو سنجیدگی سے قبول کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "خطرناک اسلحہ جات" کے خلاف قانون کا مسودہ تیار کرنے والے کا منشا ہم تمام ہتھیاروں مثلاً ریوالور، پستول، بندوق، خنجر اور چاقو وغیرہ وغیرہ تک محدود سمجھیں گے، اور اگر عدالت نے اسی قانون کا اطلاق کسی ایسے ہتھیار پر کیا جس کا مسودے میں ذکر نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قانون کی تشریح نہیں بلکہ تشکیل کی جا رہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ان اسلحہ پر بھی قانون کا اطلاق کیا جائے جو قانون کی منظوری کے وقت تک ایجاد ہی نہیں ہوا تھا تو پھر عدالتی قانون سازی کا دائرہ بے حد وسیع ہو جائے گا۔ حالانکہ ایسے قانون کا مقصد واحد یعنی ضرر سے حفاظت میں امداد مختصر اور معین مقصد ہے[1]۔ قانون کے مفہوم کے متعلق واضعانِ قانون کے منشاء کا نظریہ اس قدر مقبول ہے کہ اس کی وجہ سے قانون کی تعبیر کے مسئلے کو اور زیادہ صفائی اور صحت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہم ایک مثال کے ذریعے اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو میرا مقالہ "امریکن لیگل ریلزم" ۸۲۔ یونیورسٹی آف پنسلوانیا لاریویو (۱۹۳۴) ص ۴۲۹، ۴۴۳-۴۴۴، ۴۴۷

فرض کیجئے کہ خانہ داری کی چیزوں کا ایک موجد کوئی چیز ایجاد کرنے کی فکر میں تھا لیکن اس کا انتقال ایسے وقت ہو گیا جبکہ ایجاد کا صرف خاکہ ہی تیار ہوا تھا۔ اس نے بیٹے کو وصیت کی کہ وہ اس کے کام کو جاری رکھے اور مطلوبہ چیز کو تکمیل تک پہنچائے لیکن وہ یہ نہ بتا سکا کہ اس ایجاد کا مقصد کیا تھا اور وہ اسے کس طرح مکمل کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔ باپ کی وصیت پر عمل درآمد کرتے وقت سب سے پہلے بیٹے کو یہ طے کرنا ہوگا کہ ایجاد کا مقصد کیا تھا اور اسی قسم کی مروجہ اشیاء میں ایسی کونسی خامیاں اور خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے نئی چیز ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ زیر نظر ایجاد کا اصول اور مقصد طے کر سکے گا، یعنی ہائیڈن کے مقدمے کے الفاظ میں "اصلاح کا اصل سبب" معلوم کر سکے گا۔ جب یہ مسئلے طے ہو جائیں گے تو پھر اس کام پر توجہ دے گا کہ متعلقہ شئے کے ڈیزائن کی تکمیل کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔

آیئے ہم اب اس لڑکے کے عمل کے بارے میں وہی سوالات کریں جو قوانین کی تعبیر و تفہیم کے سلسلے میں عام طور کئے جاتے ہیں۔ کیا بیٹے نے باپ کے مقاصد اور منشاء سے وابستگی اور وفاداری کا ثبوت دیا؟ اگر اس سوال سے ہمارا مطلب یہ جاننا ہے کہ آیا اس نے اس ارادے کی تکمیل کی جو باپ نے ڈیزائن تیار کرنے کے طریقے کے بارے میں قائم کیا تھا۔ ظاہر ہے اس سوال کا جواب ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ باپ کا واقعی ایسا ہی ارادہ تھا اور اگر کوئی ارادہ تھا تو وہ کس نوعیت کا تھا۔ لیکن اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ باپ کے متعین کردہ دائرۂ کار کے اندر رہا، اور باپ کا یہ منشا قبول کیا کہ ایسی کسی چیز کی ضرورت پائی جاتی ہے اور اسے پورا کرنا ضروری ہے؟ تو اس کا جواب اثبات میں ہے۔ اگر لڑکا اس قابل ہو کہ وہ باپ کی روح سے ہمکلام ہو سکے اور اسے مدد کے لئے طلب

کر سکے، تو اس کا امکان ہے کہ باپ نے جن مسائل کو ابھی طے نہیں کیا تھا انھیں حل کرنے میں وہ بیٹے کے ساتھ تعاون کرے گا۔ یہی حال قانون کی تعبیر کے مشکل مسائل کا بھی ہے۔ اگر ایسی کسی اُلجھن کے وقت قانون کے مسوّدہ نگار کو براہ راست مشورے کے لئے طلب کیا جا سکے تو وہ بھی وہی راہِ عمل اختیار کرے گا جو جج صاحبان کرتے ہیں اور اِس قسم کے سوالات کرے گا۔ کیا یہ تعبیر اُن بُرائیوں کے رفع کرنے میں مدد دے گی، جن کے تدارک کے لئے قانون بنایا گیا تھا؟ قانون میں "اصلاح کا جو اصل مقصد" ہے آیا اس معاملے میں اس تعبیر سے وہ پُورا ہوتا ہے؟ اور اصل مقصد تو یہی تھا کہ اس طرح کی عام بُرائیوں کے پس منظر میں متعلقہ خرابی کی نشان وہی کرے اس کے تدارک کی تدبیر کی جائے۔ کیا قانون کی جو تعبیر پیش نظر ہے وہ اس کے پورے پس منظر میں اس خاص بُرائی کا دفعیہ کرتی ہے۔

نامکمل ایجاد کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ اِن اُلجھنوں کو دُور کرنے میں بھی کام آسکتی ہے جو لفظوں اور عبارتوں کی تعبیر میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم عام طور پر انفرادی نفسیات کے اصول پر منشاء کا تعین کرتے ہیں حالانکہ ہم جس چیز کی تشریح کر رہے ہیں وہ ایک جماعت کا مرتب کردہ جامع مسوّدہ قانون ہے۔ اِس لئے ہم "قانون ساز" کا منشاء معلوم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قانون ساز کوئی فرد واحد نہیں ہوتا جس کا انفرادی منشاء معلوم کیا جائے، وہ تو پُورا قانون ساز ادارہ ہوتا ہے۔

بعض اوقات ہم کہتے ہیں کہ "مجلس قانون ساز" کی نیت یہ تھی" حالانکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جو لوگ اسمبلی میں قانون کے حق میں ووٹ دے چکے ہیں ان کے ذہن میں ہزار مصلحتیں ہو سکتی ہیں اور منشائے قانون کے بارے میں ان کی مختلف رائیں ہوں گی اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ قانون کے حق میں ووٹ دینے والے قانون

اصطلاحات کے مفہوم سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ انفرادی نفسیات کے اُصول کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "مسودہ نگار" کا تو ضرور کوئی منشا ہوگا؟ لیکن یہ بھی بڑی اُلجھن کی بات ہے، قانون کا مسودہ کوئی ایک آدمی تھوڑا ہی بناتا ہے۔ درجنوں لوگ اس کام پر لگے ہوتے ہیں اور مختلف مراحل پر کام کرتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ان سب کی نگاہ میں یکساں مقصد اور منشا ہو۔ اور کوئی مقصد اس کے یا ان کے دل میں رہا ہو جس کا تحریر میں ثبوت نہ ہو تو ہم قانونی تشریح میں اس کی نیت کو دلیل یا جواز نہیں بنا سکتے اور وہ محض غیر متعلقہ بات ہوگی[1]

اب ہم اس نامکمل ایجاد کی مثال پھر سامنے رکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا یہ ہماری کچھ مدد کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بیٹا اپنے مسائل کو حل کرتے وقت اپنے آپ کو فکر و فہم کی اس سطح پر رکھنا چاہے گا جو اس کے باپ کی تھی اور سوچے گا کہ ایسے حالات اور معاملات میں اس کے باپ کا اندازِ فکر اور طرزِ عمل کیا ہوا کرتا تھا لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ باوصف کوشش وہ باپ کے خیالات تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو خصوصاً جب اُس کا باپ کوئی بہت اُصول پرست آدمی ہو۔ بیٹا تو اس ڈیزائن پر نظر رکھے گا، اور طے کرے گا کہ اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے اور

---

[1] ملاحظہ ہو "اسٹیچوٹ آف فراڈس"۔ مقدمہ ایش بنام ایبڈی ۳۰۔ سوینسٹن صـ۶۶۴ (۱۶۷۸) میں لارڈ چانسلر ناٹنگھم نے اپنے فیصلے میں لکھا "میرا تعلق اس خاص قانون سے یہ ہے کہ میں اس کے محرکوں میں تھا۔ اس لئے میں صحیح تعبیر جانتا ہوں"۔ اس پر سب سے عمدہ تبصرہ کیمپبل نے اپنی کتاب "لائیوز آف لارڈ چانسلرس آف انگلینڈ" (طبع سوم ۱۸۴۸) صـ۴۲۳ پر کیا ہے کہ "اگر اس قانون کا مسودہ لارڈ ناٹنگھم نے تیار کیا، تو یہ ان کی تعبیر میں نقص کی بنیاد ہے۔ کیونکہ "لاشعوری طور پر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جو اُس کی نیت میں ہے اُس چیز کو وہ الفاظ میں ادا کر چکا، گو ایسا واقعی نہ ہوا ہو"۔

متعلقہ ڈیزائن تیار کرنے میں کون سے اصول کارفرما رہے ہوں گے" دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہیں گے کہ وہ "ڈیزائن کا منشاء" معلوم کرے گا۔ یہ ایک نیا استعارہ ہے۔ لیکن اس طرح بیٹے کے عمل کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہوگی۔

لہٰذا جب ہم "قانون سازوں" کے مقصد اور منشاء کی بات کرتے ہیں، تو میرے خیال میں اگر ہم "قانون کے منشاء" کی بات کریں (یعنی جو منشاء الفاظِ قانون سے اخذ ہو) تو زیادہ مناسب ہوگا جس طرح مینس فیلڈ (Mansfield) نے ایک دفعہ معاہدے کے معاملے سے بحث کرتے ہوئے "معاہدے کے منشاء" کی اصطلاح استعمال کی تھی [1]

جج کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ نافذ شدہ قانون سے وفاداری برتے اور اس کے مضمرات خوب سمجھ کر اس کی تعبیر کرے یعنی انفعالی طور پر اثر قبول کرے اور خود اثر اندازی نہ کرے۔ اگر وہ خود اپنی "تخلیقی قوت" کو بروئے کار لاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قانون کی "تعبیر" کی حدود کو پار کر رہا ہے اور یہ اس کے منصب کا تقاضا نہیں۔ جو لوگ ججوں کے بنائے ہوئے قوانین کو ترجیح دیتے ہیں وہ اس طرزِ عمل کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ جج صاحب نے بال کی کھال کھینچ کے رکھ دی اور اپنی طرف سے قانون بنا دیا۔ اس کے برعکس جو لوگ عدالتی اختیار تعبیر کی وسعت کے نظریے پر اعتماد نہیں رکھتے وہ اس قسم کے تخلیقی عمل کو پسند نہ کریں گے اور کہیں گے یہ تو اصولوں سے انحراف ہے اور در پردہ ذاتی اقتدار کی ہوس کی تکمیل کے مترادف ہے جب کوئی مسئلہ اس شکل میں سامنے آئے تو پھر سارا معاملہ ہی الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر نامکمل ایجاد کی صورت میں لڑکے نے "تخلیقی عمل" کا مظاہرہ کیا تو اس عمل

---

[1] کنگسٹن بنام پریسٹن ۲۰۔ ڈگلس صفحہ ۶۸۹ (۱۷۷۳)

پر نہ ہو تو اُسے الزام دیا جانا چاہیے نہ اس کی واہ واہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ تو محض اُس فرض کو پُورا کر رہا ہے جو اسے تفویض کیا گیا ہے اور باپ کی وصیت کی تکمیل کے لئے وہی کر رہا ہے جو اُسے کرنا چاہیئے۔ تحسین اور الزام کا مرحلہ تو اس وقت آئے گا جب ہم یہ دیکھیں گے کہ اُس نے مجبوراً تخلیقی عمل سے کام لے کر جو چیز پیش کی، وہ کیا ہے اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے ــــ ججوں کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

شاید کوئی صاحب یہ اعتراض کر بیٹھیں کہ یہاں جس قسم کی مثال سے کام لیا گیا ہے وہ خود گمراہ کن ہے۔ کیونکہ قانون کا مقصد اتنا واضح، سادہ اور آسان نہیں ہوتا جتنا برتن صاف کرنے والے کسی پاؤڈر کا۔ قانون میں معاشرتی سوئے عمل (Mischief) کے تدارک کے لئے ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر بہت نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ اور اکثر ایسے سوئے اعمال کی نشاندہی کرنے کے لئے بھی بہت بڑے علم اور اقدار شناسی کی ضرورت ہوتی ہے اور عوامی مسائل اور اُلجھنیں کسی بجلی کے تار کی طرح نہیں ہوتیں جنھیں جوڑ کر کام پُورا ہو جاتا ہے، قانون ساز ادارے اصلاح کے ہزاروں طریقوں میں کچھ کا انتخاب کر لیتے ہیں اور بعض طریقے ایسے بالواسطہ اور لطیف ہوتے ہیں جو عام طور پر سمجھ میں نہیں آتے، لیکن وہ بُرائی کے خاتمے میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔

یہ باتیں درست سہی لیکن میں پھر یہی عرض کروں گا کہ عام حالات میں نامکمل ایجاد والی مثال نہایت کار آمد ہے۔ اصلاح کے سلسلے میں بعض ایسی جزوی یا ضمنی سوئے عملی گرفت سے رہ جاتی ہے جسے بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اور یہ جب قانون کا ابہام ایک

حد سے گزر جاتا ہے تو پھر جس طرح بھی تعبیر اور تشریح کی جائے کوئی بات نہیں بنتی اور ابہام کا سقم باقی رہتا ہے۔ کسی بھی قانون میں کسی بُرائی اور اُس کے مجوزہ تدارک کے باہمی تعلق میں کوئی اگر ذراسی خامی یا کمی محسوس بھی ہو تو اس سے قانون میں بہت زیادہ سقم نہیں پڑتا۔ لیکن اگر خامی یا عدم مطابقت ایسی ہو کہ برائی اور مجوزہ تدارک میں تعلق پیدا نہ ہو، یا غلط تعلق پیدا ہو تو بامعنی تشریح اور مؤثر تعبیر کا سہارا لے کر قانون کے نفاذ کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ ہم یہ سمجھ بیٹھیں کہ کوئی ایجاد، جو بنیادی طور پر غلط ہو صاف ستھرے کاغذ پر خوب صورت ڈیزائن بنانے سے بامعنی ہو جائے گی۔

اب ہم ایک ایسے باضابطہ قانون کی مثال پیش کرتے ہیں جس کے وضع کرنے میں بنیادی نقص موجود تھا، میری مراد اسٹیچوٹ آف فراڈس مجریہ ۱۶۷۷ء کی دفعہ چار کے پانچویں پیراگراف سے ہے۔ یہ پیراگراف اس مفروضے پر لکھا گیا کہ قانوناً بعض قسم کے معاہدات اُس وقت تک نافذ العمل نہ ہونے چاہئیں، جب تک کہ اُن کا وجود کسی دستخط شدہ دستاویز سے ثابت نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس یہ خیال کیا گیا کہ تمام معاہدات پر اس قسم کی کڑی شرط لگانا دانشمندی کے خلاف ہے، چنانچہ بعض معاہدے ایسے بھی تھے جن کے نفاذ کے لئے قانوناً صرف زبانی سمجھوتہ کافی سمجھا گیا۔ چنانچہ قانون کا مسودہ تیار کرنے والوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ دونوں قسم کے معاہدوں کی تقسیم کر کے یہ بتایا جائے کہ کون کون سے معاہدے تحریری ہونے چاہئیں اور کون سے محض زبانی۔ چنانچہ ایک دفعہ کی عبارت کچھ یوں ہے: "کوئی بھی ایسا معاملہ قابلِ رجوع نالش نہ ہو گا...... جو ایک سال کے اندر واجب التعمیل نہ ہو۔ جب تک یہ معاہدہ جس پر دعوے کی بنیاد ہے، تحریری نہ ہو اور ذمہ داری قبول کرنے والے کے اس

پر دستخط نہ ہوں"۔

غالباً یہ کہنا درست ہو گا کہ اس قانونی دفعہ کی تشریح میں جتنی بے ربطیاں اور اُلجھنیں پیدا ہوئیں، بہت کم قوانین میں پیش آئی ہوں گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غلطی کہاں ہے؟ قانون کی عبارت تو سادہ اور آسان انگریزی زبان میں ہے، اور جس بُرائی کی اصلاح کے لئے قانون بنایا گیا وہ بھی بہت واضح ہے۔ یہ بھی جاننا آسان ہے کہ تحریری ثبوت کا مطالبہ ایسے معاہدات کے لئے جن کی مدت تکمیل سال سے بڑھ جاتی، کیوں کیا گیا۔ ہولٹ (Holt) کے الفاظ میں اصل قصّہ یہ ہے کہ اس "قانون کا ڈیزائن یا مسودہ یہ کہنا ہے کہ گواہوں کی یادداشت پر ایک سال سے زیادہ مدت تک بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"۔[1] اس قانونی حکم کی تعبیر میں ساری دشواریاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ مسودہ نگاروں نے پوری طرح نہیں سوچا کہ جس خامی یا جن عواقب کی وہ روک تھام چاہتے تھے اور جو اصلاح کے طریقے وہ تجویز کرتے تھے اُن میں مؤثر تعلق پیدا ہوا یا نہیں۔ معاہدہ کی تکمیل کب ہوئی اور عدالت تک بات کب پہنچی، اس کا صحیح تعین کرنا ہی مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ معاہدہ کی تکمیل کی مدت ایک مہینہ ہی مقرر ہوتی لیکن عدالت میں اس کے ثبوت کی نوبت دو سال بعد آتی۔ اس کے علاوہ قانون سازوں کو یہ سمجھنے میں بھی ناکامی ہوئی کہ عدالتیں ان معاہدوں کے مقدمات میں کیا فیصلے دیں گی جن معاہدوں کی تکمیل کے وقت کا تعین بھی مشکل ہے جیسے ایک آدمی کو زندگی بھر کے لئے ملازم رکھا گیا یا کسی کو بیماری سے بالکل صحت یاب ہونے تک ایک ماہوار رقم دینے کا وعدہ کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں معاہدے کی مدت کیا ہو گی، اس کا فیصلہ

---

[1] ملاحظہ ہو، اسمتھ بنام ویسٹ فال ۱۰۱۔ لارڈ ریمنڈ صہ ۳۱۷ (۱۶۹۷)

مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان ناگہانی اور ان جانی باتوں کا بھی لحاظ رکھیں جو معاہدے کی توسیع کا سبب بن سکتی ہیں تو بھی مدت تکمیل کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ قانون پاس ہونے کے بعد ہی ایک مقدمہ[1] پیش ہوا تھا جس میں یہ خیال کیا گیا کہ معاہدے کی مدتِ تکمیل کا انحصار متعلقہ واقعات کے رونما ہونے کے عرصے پر ہونا چاہیے۔ اگر معاہدے کی تکمیل ایک سال میں ہو جاتی تو زبانی معاہدہ بھی درست ہوتا۔ اگر نہیں تو معاہدہ کا نفاذ نہ کیا جائے، لیکن یہ حل قابل قبول نہ سمجھا گیا، نہ یہ ممکن تھا، کیونکہ فریقوں کو کم از کم جھگڑا شروع ہونے کے وقت تو ضرور یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اُن کے درمیان کوئی معاہدہ ہے بھی یا نہیں۔ بعد کے حالات پر کسی معاہدے کے وجود کو منحصر کر دینا اور پھر اس کی پابندی کرانا سخت نادانی ہے اور اس طرح سینکڑوں اُلجھنیں پیدا ہو سکتی اور کی جا سکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ عدالتوں کو ایک ایسے قانون سے سابقہ پڑا جس کا اطلاق سرسری طور پر نہیں کیا جا سکتا تھا اور قانون سازوں کی نیت کا اپنی طرف سے فیصلہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخر کار ۱۹۵۴ء میں برطانیہ میں یہ طے کیا گیا کہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ متعلقہ دفعہ کو فوراً منسوخ کر دیا جائے۔ قانونی دماغ اب بھی محولہ بالا معمے کے معقول حل کی تلاش میں ہیں اور کوئی واضح حل نہیں نکل سکا۔

غلط اندازوں کے تحت بنائے ہوئے قوانین کے بارے میں اب میں جو مثال دوں گا وہ زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے قانون سے ہے جس میں ایسا نقص پایا جاتا ہے کہ یہ بتانا ہی مشکل ہے کہ وہ کس غرض سے وضع کیا گیا۔ امریکہ میں شراب نوشی قانوناً حرام کی گئی۔ پھر جلد ہی وہ قانون منسوخ ہوا۔ اس کے بعد امریکیوں کی زبردست اکثریت نے چاہا اور طے کیا کہ پُرانی قسم کے

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ محولہ نوٹ بالا۔

شراب خانوں کی بحالی کی روک تھام کریں گے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہوا؟ "پرانے شراب خانے" کوئی مخصوص اور مقررہ اصطلاح نہیں۔ اِس میں تعمیراتی، ماحولی، فن کارانہ، تجارتی، قانونی اور عمرانی اجزاء شامل تھے۔ یہ تو بالکل ناممکن بات تھی کہ وہ پرانی شکل میں لوٹ آتے، کیونکہ پندرہ سال کے عرصے میں لوگوں کے مزاج، ملک کے حالات، اور معاشرتی آداب بدل چکے تھے۔ لیکن پھر بھی متعدد ریاستوں میں یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کے لئے قانون بنا دیا جائے۔ اب آپ بتائیے کہ پرانے شراب خانے کی جامع تعریف موجود ہی نہیں تو اُن کے خلاف قانون کیسے بن سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پرانے سیلونوں میں گھومنے والے دروازے ہوتے تھے اس لئے اگر کہیں ایسے دروازے ہوں تو کیا اس کے پیچھے بیٹھ کر شراب نوشی ممنوع قرار پائے گی۔ پرانے سیلونوں میں لوگ کھڑے ہو کر شراب پیتے تھے اس لئے اب کیا ضروری ہو جائے گا کہ لوگ بیٹھ کر مے نوشی کریں تاکہ اور آسانی ہو جائے۔ پرانے سیلونوں میں کھانا قیمتاً نہیں ملتا تھا اگر ضرورت ہوتی تو بلا قیمت مل جاتا تھا، کیا نئے سیلونوں میں یہ لازمی ہو گا کہ کھانا بھی ضرور ملے۔ لیکن گھر کا سا ماحول پیدا کرنا ہے تو اور بھی تقاضے ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی پیاسا آ جائے اور اُس سے کہا جائے کہ پہلے کھانا خریدو پھر پینے کو ملے گا۔ تو یہ بھی بڑی زیادتی ہو گی۔ لہٰذا نئے سیلون کے لئے قانونی شرط یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ہر اُس شرابی کو کھانا دینے کو تیار رہے جو اس کا آرڈر دیں چاہے ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

اب اِس قسم کے قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کرانے کی ذمہ داری مقدمہ دائر کروانے پر نہیں بلکہ لائسنس دینے والے حکام پر ہے۔ اگر آپ ایسے حاکم بنا دئے جائیں تو ملک و قوم کو اس سے کیا فائدے حاصل ہو سکیں گے؟

ظاہر ہے کہ یہ قانون ناقص ہے اور اس میں رشوت اور بدعنوانی کے مواقع ہیں۔ کیونکہ قانون واضح نہیں ہے۔ اگر کوئی دیانت دار حاکم ان قاعدوں اور ضابطوں کی تکمیل ہی کو مقصدِ حیات بنا لے تو بھی اصل مسئلہ حل نہ ہو سکے گا، کیونکہ قانون کی تشریح و توضیح کا دائرہ بہت وسیع ہو گا اور فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ مثلاً یہی کہ قانون میں کہا گیا ہے کہ کھانا دینے کو تیار رہے چاہے کھانے والا نہ آئے۔" تو اس تیار رہنے سے کیا مراد ہے؟ اور کس صورت میں اس کی خلاف ورزی شمار ہو گی؟

ہم چاہتے ہیں کہ اس مرحلے پر تشریح و تعبیر کی بحث ختم کر دیں۔ کسی مثال یا تشبیہ و استعارے کی مدد سے یہ پیچیدہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق اصل واقعات اور معاملات سے ہے کوئی مثال کام نہیں آسکتی، صرف چند اصول طے کئے جا سکتے ہیں لیکن قانون کی مختلف شاخوں پر اطلاق اور تعبیر کی صورت میں جو مشکلات آئیں گی ان کا کوئی آسان علاج نہیں۔ بہر حال مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو، تشریح و تاویل کو قانون کی داخلی اخلاقیات میں مرکزی اور اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس سے یہ اعلیٰ سبق ملتا ہے کہ قانون کی روح کو برقرار رکھنے کے لئے بڑی سمجھداری اور رواداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ قانون ایسا ہونا چاہیے جس کا کوئی نہ کوئی مفید اور اچھا مفہوم نکالا جا سکتا ہو، اچھے قانون ساز اور مسودہ نگار کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھتا ہو کہ تشریح و تاویل کے انداز اور قرینے کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ سارا نظام قانون اسی بنیاد پر استوار ہے کہ قانون ساز اور قانونی تاویل کرنے والوں کے مابین ذہنی طور پر ربط باہم موجود ہو۔ کوئی فرد واحد، خواہ کتنا ہی ذہین، دور اندیش، بالغ نظر اور نیک نیت کیوں نہ ہو، اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ وہ انسانی عمل کو سرکاری ضابطوں کا تابع بنانے کی جدوجہد میں پوری طرح

کامیاب رہے گا۔

قانون اور "قانونیت" بحیثیت فن :-

ابھی گزشتہ صفحات میں ہم اچھی خاصی طویل بحث کر چکے ہیں، آئیے، اب ہم اس کی روشنی میں، قانونی لوازم کے اطلاق کے سلسلے میں کچھ مشاہدات قلمبند کر لیں :-

(۱) سب سے پہلے تو خود لفظ "قانون" کی وضاحت ضروری ہے۔ ۱۹۴۱ء میں قوانین ریاست میساچوسیٹس میں ایک قانونی دفعہ یہ شامل کی گئی کہ چکاڈی کو دولت مشترکہ کا "سرکاری" پرندہ قرار دیا جانا چاہیے[۱] ظاہر ہے کہ یہ قانون ایسا ہے کہ اگر عام لوگوں کے علم میں نہ آئے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اس سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہم کسی نظامِ قانون میں کسی سرکاری اقدام کو قانون کا نام دیں تو پھر ہو سکتا ہے کہ ایسے حالات پیدا ہوں جن میں قانون کی جملہ تفصیلات لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا لازمی ہے۔ فرض کیجئے کسی نئے جنگی ہتھیار کی تحقیق کے اخراجات کے لئے قانون کے تحت رقم دی گئی تو اُسے پوشیدہ رکھنا ہی ہوگا۔ جب کوئی سرکاری کارروائی عوام سے چھپانی ضروری ہوتی ہے اور عوامی تنقید کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے تو یہ ہمیشہ ایک نامناسب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن بعض اوقات حالات کا تقاضا یہی ہوتا ہے اور حقائق کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ خود آئینِ امریکہ کی دفعہ پانچ میں بیان کیا گیا ہے کہ "کانگریس کے دو ایوان اپنی کارروائی کا ریکارڈ رکھیں گے، اور وقتاً فوقتاً اسے شائع کرتے رہیں گے۔ البتہ بعض حصے جنھیں وہ خفیہ نوعیت کے سمجھتے ہوں، خارج کئے جا سکتے ہیں۔"

بہر حال ہم جن قوانین سے بحث کر رہے ہیں اُن کا اس حوالے سے زیادہ

---

[۱] جیسے نیشنل انیتھم۔ سرکاری نیشنل ایمبلیم۔ سرکاری طغریٰ وغیرہ۔

تعلق نہیں ہے[1] یوں تو ایسے کسی ہنگامی حالات کا تصور نہیں کیا جا سکتا جن کے تحت عوام کی نظر اور علم سے کسی ایسے قانون کا پوشیدہ رکھنا جائز ہو جس کے تحت کوئی مثلاً نیا جرم قائم کیا گیا ہو، یا قانوناً قابلِ نفاذ وصیت کے لوازم تبدیل کر دئے گئے ہوں۔ اس بحث سے قانون سے واقف ہونے کی اہمیت یا عدم اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) قانونی اخلاق کی خلاف ورزی کا عمل مجموعی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے:-
اگر قانون واضح نہ ہو، اس میں اندرونی تطابق نہ ہو یا مناسب طریقہ پر مشتہر نہ کیا گیا ہو تو ان کے عواقب کی اصلاح کو زمانۂ ماضی سے قانون کے نفاذ کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ قانون میں بار بار تبدیلیوں سے بھی مقصد فوت ہو جاتا ہے، کیونکہ اس سے لاعلمی کا جواز سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ اگر قانون ناقابلِ عمل ہو تو بھی بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں کیونکہ ان پر عمل کرانے کے لئے خاص تعبیروں سے کام لیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قانون اور سرکاری تعبیروں میں ہم آہنگی باقی نہیں رہ جاتی۔

(۳) قانون میں صحیح اور غلط یعنی حق و باطل کا جو تصور اور امتیاز قائم کیا گیا ہو، اگر وہ ایسا ہے جسے عوام کا بڑا طبقہ تسلیم کرتا ہو تو اسکے لئے قانون کی مناسب اشاعت اور تشہیر کی زیادہ اہمیت نہیں رہتی۔ سابق العمل قوانین کا بھی یہی حال ہے اگر سابق العمل قانون ایسے افعال سے متعلق ہے جن کے حق و باطل صحیح اور غلط کا معیار عام طور پر معروف ہے، وہاں زمانۂ سابق سے قانون سازی کی جو صورت ہوگی وہ لوگوں کے عام خیال اور اخلاقی توقعات کے مطابق ہوگی۔ یا یہ سابق العمل قانون اسی منزل کی طرف بڑھ رہے ہوں گے جس کی معاشرہ خود ضرورت محسوس کرتا آیا ہو۔

---

[1] حکومت کے بعض اعمال اور اقدامات کا عوام سے راز میں رہنا بہت ضروری ہے، اس کے بھی ضابطے ہوتے ہیں مگر وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

جیسے جب سولھویں صدی کے آخر میں انگلستان کی عدالتوں نے باہمی سمجھوتوں کو تسلیم کرلیا تھا اور عملدرآمد کی قانونی منظوری دی تھی تو گویا انھوں نے تسلیم کیا تھا کہ متعلقہ فریقین پہلے جو کام بالواسطہ طور پر کرتے تھے وہ باہمی اور براہ راست طے کر سکتے تھے۔ اس طرح عدالتوں نے یہ فیصلہ کرکے کوئی نئی چیز نہیں پیش کی بلکہ اسی طور طریقے کی توثیق کردی جو تجارت اور کاروباری حلقے میں پہلے ہی سے رائج تھے۔

(۴) قانون کے جو آٹھ نکات بیان کئے گئے ہیں جن کا مجموعی طور پر جس سختی اور ترتیب و اہمیت کے ساتھ اطلاق کیا جائے گا وہ بھی متعلقہ قانون کی نوعیت سے متاثر ہوگا اور نوعیت قانونی کے تحت جو مخصوص قاعدے زیر غور ہوں گے، ان کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوگا، لہٰذا اہم بات یہ ہے کہ آدمی کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ اس کی قانونی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں، بجائے اس کے وہ یہ معلوم کرکے پریشان ہو کہ کس قانون کی خلاف ورزی پر کیا سزا بھگتنی ہوگی۔ سابق العمل قانون جس میں کوئی نیا جرم داخل کرلیا گیا ہو سراسر قابل اعتراض ہے۔ اسی طرح موجودہ جرم کے لئے سزائے قید کی میعاد بڑھا دینا بھی غلط ضرور ہے مگر اس درجے میں نہیں۔ قانون کی نوعیت میں واضح فرق وہ امتیاز ہے جو فرائض کے ضابطوں اور قانونی حیثیت کے ضابطوں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ دونوں قسم کے ضابطوں کا کسی نہ کسی حد تک قانونی اخلاقیات کے آٹھوں تقاضوں سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے، کہ جن ضابطوں کے تحت قانونی اختیارات کی منظوری اور تشریح ہوتی ہے، زندگی کے عام معمولات میں ویسی چیزیں نہیں ہوتیں۔ مثلاً معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد فریقین مصافحہ ضرور کرتے ہیں، حالانکہ قانونی تقاضوں کے تحت اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ جن ضابطوں کے تحت قانونی اختیارات

کی تشریح کی جائے ان کی توضیح و تشہیر بہت ضروری ہے ورنہ بعد میں ابہام اور اُلجھنیں پیدا ہوں گی۔ اس کے برعکس گذشتہ افعال کو سابق العمل قوانین سے جائز قرار دینا تشہیر کا اتنا محتاج نہیں اور بغیر تشہیر بھی "قانونیت" میں اضافہ ہوا ہے۔

(۵) پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ ہم نے قانون کی اخلاقیات کے آٹھوں مطالبات اور تقاضوں پر بحث اور اُن کے تجزیے کے دوران اپنے ذہن میں ایک ایسے قانون ساز کا تصور رکھا ہے جو باشعور ہے اپنی ذمہ داریوں کی نوعیت سمجھتا ہے اور اس راہ کی دشواری سے واقف ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا۔ قانون کے اخلاق کے ہر مطالبے کو بعض ایسے طور طریقوں سے مجروح کیا جا سکتا ہے جن کا پتہ چلانا دشوار نہیں۔ مثال کے طور پر کالیگولا (Caligula) کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس نے اس روایت کو تو برقرار رکھا کہ رومیوں کے قوانین عام جگہوں پر چسپاں کئے جایا کریں لیکن اس نے کچھ اور بھی انتظام کر رکھا تھا اور وہ یہ کہ وہ خود اپنے قوانین کو نہایت باریک حروف میں چھپواتا اور اتنی بلندی پر انہیں آویزاں کراتا تھا کہ کوئی بھی شخص انہیں پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔

بظاہر یہ ایک قول محال ہے لیکن حقیقت سے دور نہیں کہ بعض موضوعات نہایت آسان مگر انتہائی مشکل ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت ہم سقراط کے ایک بیان سے کریں گے۔ اپنی کتاب اخلاقیات (Ethics) میں سقراط نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ آیا دوسروں کے ساتھ انصاف کرنا آسان کام ہے؟ اس کا خیال ہے کہ بظاہر یہ کام آسان ہے، کیونکہ منصفانہ سلوک کے کچھ مسلّمہ اصول ہیں جن پر کاربند رہ کر انسان آسانی سے انصاف کی راہ پر چل سکتا ہے، اُصول آسان ہو تو اس پر عمل بھی آسان ہی ہوتا ہے۔ لیکن واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ سقراط اس کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ "یہ بات جاننا بالکل مشکل

نہیں کہ شہد یا شراب کے استعمال، اور جلد کو داغنے یا فصد لگانے کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ لیکن یہ چیزیں کسی انسان کو کب کیا کس حالت میں اور کس طرح استعمال کرائی جائیں اس کا علم کوئی معمولی کام نہیں، اس کے لئے ماہرِ طب ہونا ضروری ہے۔"

لہٰذا ہم آخر میں یہی کہیں گے کہ یہ جاننا آسان ہے کہ قوانین واضح ہوں، سابق العمل نہ ہوں، عام اصول بیان کرتے ہوں، اور اُن کی تشہیر ہونی چاہیے، لیکن یہ جاننا کہ یہ باتیں، کب، کن حالات میں، اور کس توازن کے ساتھ ہوں، کوئی معمولی کام نہیں ہے اور اس کے لئے قانون ساز بن جانا بھی ہنسی کھیل نہیں۔

باب سوم

قانون کا تصوّر

اِس باب کا مقصد یہ ہے کہ باب دوم میں جو تجزیہ کیا گیا ہے اُسے مَیں قانون کے مروجہ نظریات کے تعلق سے واضح کردں۔ میرا مقصد یہ بتانا نہیں کہ دوسروں کے نظریات کے خلاف میں نے بہتر نظریہ پیش کیا ہے، بلکہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی ذرا اور وضاحت ہو جائے۔ مجھے اس بات سے تو اتفاق ہے کہ قانون کے متعلق کوئی کتاب لکھی جائے تو ایسی نہ ہو جس سے صرف اتنا ہی پتہ چل سکے کہ دوسری کتابوں میں کیا لکھا گیا ہے، پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ جو کچھ انسان دوسری کتابوں سے معلوم کرتا ہے اسی کی بنیاد پر اور اسی کی روشنی میں نئے تجزیے کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر جو مسلّمہ نظریات ہوتے ہیں اگر اُن سے کوئی اختلاف ہو تو اُس کی بھی نشان دہی کردی جائے۔

قانونی اخلاق اور فطری قانون

چنانچہ سب سے پہلے مجھے اس کی وضاحت کرنی چاہیے کہ صدیوں سے "فطری قانون" کی اصطلاح چلی آرہی ہے لیکن میں نے "قانون کے داخلی اخلاق"

کا ذکر کیا ہے تو ان دونوں تصورات میں تعلق کیا ہے؟ کیا میں نے دوسرے باب میں جو خیالات پیش کئے ہیں، اور جو اُصول وضع کئے ہیں وہ فطری قانون سے کافی حد تک مطابق ہیں۔ اس کے جواب میں میں نہایت وثوق سے کہوں گا کہ ہاں بڑی حد تک یہی بات ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ انسانی سرگرمیوں کے ایک خاص نوعیت کے فطری قوانین کو واضح طور پر الگ کر کے بیان کروں اور اسی لئے میں نے ان سرگرمیوں کو "انسانی اعمال کو ضابطوں کا پابند بنانے کی کوشش" قرار دیا ہے۔ ان فطری قوانین کا کسی آسمانی طاقت یا ماورائی فطرت ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ان میں ایسے تصورات کے لئے کوئی جگہ ہے مثلاً یہ کہ ضبطِ تولید کے اُصول اختیار کرنے سے خدا کے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ان قوانین کا رشتہ و رابطہ اسی عالمِ آب و گِل سے ہے اور ان قوانین کی کوئی "ماورائی" حیثیت نہیں ہے اور اگر ان کے ساتھ کوئی صفت لگانی ضروری ہو تو ہم انھیں معمولی قوانین کہہ سکتے سکتے ہیں۔ یہ قوانین بڑھئی کے کام اور فن کے عام قاعدوں کی مانند ہیں یعنی ایسے اُصول جنھیں ہر وہ بڑھئی پسند کرتا ہے جس کی یہ آرزو ہو کہ اس کا بنایا ہوا مکان پائدار ہو اور جن لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے ان کی ضرورتیں پوری کرے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ فطری قوانین انسانی سرگرمیوں کے ایک اہم ترین شعبے اور حصّے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ وہ انسان کی تمامتر اخلاقی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے۔ مثلاً ان قوانین میں تعدادِ ازواج، مارکس کے مطالعہ، خدا کی عبادت، ترقی پذیر انکم ٹیکس اور عورتوں کی محکومی جیسے موضوعات پر کچھ نہیں ملے گا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ آیا یہ موضوعات یا اسی قسم کے دوسرے معاملات کو قانون سازی کا موضوع بنانا چاہیئے تو اس سوال کا تعلق اُس بنیر

سے ہوگا جسے میں نے "قانون کا خارجی اخلاق" کہا ہے۔

اِس بات کی مزید وضاحت کے لئے میں ایک اور آسان راستہ اختیار کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اصلی فطری قوانین سے مُمیّز کرنے کے لئے میں زیرِ بحث قوانین کو "اِضافی قوانین" (Procedural) یا ضابطے کے قوانین کہوں گا۔ مَیں نے جس چیز کو قانون کا داخلی اخلاق کہا ہے وہ اسی معنی میں فطری قانون کے ضابطے سے عبارت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر قسم کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے لفظ "ضابطہ" کو انتہائی خاص مگر وسیع معنوں میں استعمال کیا جائے۔ اس طرح کہ اس مفہوم میں قانون اور سرکاری اقدام میں مطابقت والی بات بھی آجائے۔ "ضابطہ کار" کی اصطلاح اس لئے بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمیں نہ صرف دفعاتِ قانون کے ٹھوس مقاصد سے دلچسپی ہے بلکہ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ انسانی عمل میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے جو قاعدے اور ضابطے بنائے جائیں ان پر ایک مربوط نظام اور اُصول کے تحت عملدرآمد کیا جائے تاکہ جو مقاصد پیشِ نظر ہیں وہ پورے ہو سکیں۔

اب ہمیں یہ بتلانا ہے کہ قانونی اور سیاسی افکار و نظریات کی تاریخ میں اِن اصولوں میں جو ہم باب دوم میں بتا چکے اور فطری قوانین کے نظرئے کے مابین کیا تعلق رہا ہے؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہمارے متذکرہ اصول بھی فطری قوانین کی روایت کا ایک لازمی حصّہ ہیں؟ جو لوگ اِس نظریے قانونِ فطرت کے مخالف ہیں کیا وہ غیر مشروط طور پر ہمارے اُصولوں کو مسترد کر دیتے ہیں؟ اِن سوالات کے جواب آسان نہیں۔

قانون کو صرف وضعی چیز سمجھنے والے مفکرین[۱] کی نظر میں کوئی واضح صورت

---

[۱] آسٹن - بنتھم - گرے - سا ۱ جن کا تذکرہ آتا ہے قانون کو وضعی چیز کہتے ہیں۔

نہیں اُبھرتی۔ آسٹن نے قانون کی تشریح کرتے ہوئے یہ کہا کہ "وہ سیاسی حکمرانِ اعلیٰ کا حکم ہے" تاہم اُس نے اس پر زور دیا کہ یہ نام نہاد قوانین، عام ضوابط کی حیثیت رکھتے ہیں اور روزمرہ کی اور معمولی ضرورت کے تحت جو احکام دیئے جایا کرتے ہیں، انھیں قانون نہیں کہا جا سکتا۔ بینتھم نے اپنے حسنِ بیان کے ذریعے فطری قوانین کے تصور کے پرخچے اڑائے۔ بہرحال اُسے قوانین کے ان پہلوؤں سے خاص دلچسپی رہی جنھیں تیں نے قانون کے داخلی اخلاق کا نام دیا ہے۔ اس نے اس ضرورت کا خاص طور پر ذکر کیا کہ جن لوگوں کے بارے میں قوانین بنائے جائیں وہ اُسے جانتے اور سمجھتے ہوں۔ دوسری طرف، نئے دور میں گرے (Gray) نے اس سوال کو اہمیت نہیں دی کہ آیا قوانین کو عام ضابطوں کی شکل اختیار کرنی چاہیئے کیونکہ عملاً اس امتیاز کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، حالانکہ اُس نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ قانونی اختیار کا الگ تھلگ اور مخصوص استعمال، اُصول قانون کا معقول موضوع نہیں بن سکتا۔ پھر سوملو (Somlo) نے سابق العمل قوانین کو اس بنا پر مسترد کیا ہے کہ وہ غیر منصفانہ ہیں، لیکن یہ نہیں کہا کہ وہ خود قانون کے تصور کے عام دائرے سے خارج ہیں۔

جہاں تک فطری قوانین کی روایت کو ماننے والے مفکرین کا تعلق ہے، ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی قانونی اخلاق کے تقاضوں کے بارے میں گرے اور سوملو کی طرح قانون کے داخلی اخلاق کی طرف سے بے توجہی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ اس چیز سے گہرا تعلق رکھتے ہیں جس کے لئے میں نے اصلی فطری قانون کی اصطلاح استعمال کی ہے اور جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانونی ضابطے مرتب کر کے صالح مقاصد کی تکمیل ہونی چاہیئے۔ جب یہ لوگ قانونی اخلاق کے تقاضوں کے سلسلے میں بات کرتے ہیں تو یہ عام طور پر محض ایک

اتفاقی امر ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اس موضوع کے ایک پہلو پر خاصی وضاحت سے کام لیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اکوینس (Aquinas) کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہر اختلافی مسئلے کا الگ الگ فیصلہ کرنے کے بجائے عام ضابطوں کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس نے حیرت انگیز طور پر بڑی عالمانہ بات کہی ہے اور یہ دلیل بھی دی ہے کہ دانشمند لوگوں کی تو ہمیشہ ہی قلت رہتی ہے، اس عام اقتصادی اصول کے تحت یہ ضروری ہے کہ ان کی صلاحیت سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اُٹھائیں، چنانچہ ایسے لائق لوگوں کو ایسے عام ضابطے مرتب کرنے کے لئے کہا جائے جن پر عام لوگ عمل کریں۔[1] دوسری طرف آئسیڈور (Isidore) کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے اکوینس کا کہنا تھا کہ بقول آئسیڈور قوانین کی پوری پوری تشریح و توضیح موجود ہونی چاہیے تاکہ سبھی اس کو سمجھ لیں اور خود قانون سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ رہے۔[2]

میرا خیال ہے کہ فلسفی حضرات کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب بھی وہ اخلاقِ قانون کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں تو یہ ایک سرسری اور اتفاقی امر یعنی جملۂ معترضہ ہوا کرتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس کا جواب کچھ مشکل نہیں ہے۔ انسان کسی ایسی چیز کی وضاحت یا تاویل کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جو بظاہر خود ہی واضح اور عیاں ہو۔

اس بات کا امکان ہے کہ تاریخ اور تمدن کے ہر دور میں فلسفۂ قانون کے علم برداروں نے اس ضرورت پر زور دیا ہو گا کہ قوانین کی تشہیر اور اشاعت بہت ضروری ہے تاکہ جو لوگ ان کے پابند بنائے جائیں، انھیں قوانین کا علم

---

[1] ملاحظہ ہو "سما تھیولوجیکا" ۱-۲-سوال نمبر ۹۵ آرٹیکل ۱-

[2] حوالہ کتاب ماسبق آرٹیکل ۳-

ہو سکے۔ لیکن چند ہی ایسے ہوں گے جنھوں نے اس دلیل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہو یا جنھوں نے اسے ایک واضح نظریے کی صورت میں پیش کرنے کی زحمت کی ہو۔

ایک نقطۂ نظر سے یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ قانونی اخلاق کے تقاضے عام طور پر اتنے عیاں اور ظاہر سمجھے جاتے ہیں۔ اس ظاہری صورت کی وجہ سے حقائق پوشیدہ رہ گئے ہیں اور لوگوں کو خیال ہوا کہ اس موضوع پر زیادہ تحقیق اور تجزیے کی ضرورت نہیں اور ایسا کرنا ممکن بھی نہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون میں یا قانونی احکام میں تناقص یا تضاد نہیں پایا جانا چاہیے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بات ختم ہو گئی اور اب اس میں کسی اضافے کا سوال باقی نہیں رہا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے بعض حالات میں عدم تضاد کا اصول برقرار رکھنا اور اس کا برتنا اس قدر مشکل ہو جاتا ہے جتنا اور اصولوں کا، جن سے قانون کے داخلی اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے۔ برتنا اور برقرار رکھنا مشکل نہیں ہوتا[1]۔

سیاسی اور قانونی افکار و نظریات کی تاریخ میں عام طور پر تو یہی ہوتا ہے کہ قانونی اخلاق کے اصولوں کا محض ضمناً تذکرہ کر دیا گیا اور وہ بھی جہاں اپنی دلیل کو ٹھوس بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن ایک مثال اس کے برعکس بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سترھویں صدی کے دوران انگلستان میں بڑی قانونی گہما گہمی رہی، یہ صدی سیاسی اور آئین شکنی کے مقدموں، سازشوں، ریشہ دوانیوں، اور خانہ جنگیوں کی صدی تھی اور اس کے دوران مروجہ اداروں میں بڑی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ان کا از سر نو جائزہ

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب محولہ ماسبق ص ۷۹-۸۴

لینا پڑا۔

مفکرین کا خیال ہے کہ امریکی آئین کی بنیادیں قانونِ فطرت پر رکھے جانے کی محرک یہی صورت حال تھی۔ گمنام مصنفوں کے کتابچوں اور عدالتی فیصلوں میں اس دور کا جو لٹریچر ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں قانون کے داخلی اخلاق کا نہایت سختی سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس میں قوانین کے تضاد اور کالعدم ہونے، ناممکن العمل قوانین اور خود پارلیمنٹ کی قانونی خلاف ورزیوں پر بحث کی گئی ہے۔[1] اس دور کے ادیبوں کی تخلیقات میں یہ اشارے ملتے ہیں، لیکن اس عظیم دور کا مشہور اعلان وہ ہے جو ڈاکٹر بونہم کے مقدمے میں کوک نے کیا تھا۔ وہ مقدمہ یوں تھا:۔

ہنری ہشتم نے رائل کالج آف فزیشن کو اس سلسلے میں وسیع اختیارات دے دیئے تھے کہ وہ لندن میں علاج معالجہ کرنے والوں کے کام میں باقاعدگی پیدا کرے، اور انھیں لائسنس یا اجازت نامے جاری کرے۔ کالج کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا تھا کہ وہ اپنے جاری کردہ ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف خود ہی مقدمہ شروع کرے، سماعت کرے اور انھیں جرمانے یا قید کی سزائیں سنائے۔ جرمانے کی آدھی رقم بادشاہ کو چلی جاتی تھی اور آدھی رقم خود کالج کے پاس رہ جاتی تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر تھامس بونہم نے لندن میں ڈاکٹری شروع کی، لیکن انھوں نے رائل کالج سے سرٹیفکیٹ یا لائسنس حاصل نہیں کیا تھا۔ چنانچہ کالج نے ان پر مقدمہ چلایا، جرمانہ کیا اور پھر قید کر دیا۔ انھوں نے اس قید کے جواز کو چیلنج کیا۔ کوک نے فیصلہ دیتے ہوئے، ڈاکٹر بونہم کے دلائل کو تسلیم کیا اور اپنے فیصلے میں یہ تاریخی پیراگراف لکھا:۔

---

[1] ملاحظہ ہو گف۔ "فنڈامنٹل لا ان انگلش کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری" مطبوعہ ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۱ء

.... رائل کالج کے منتظم بہ یک وقت جج وزیر اور فریقوں کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ بہ یک وقت جج نہیں ہو سکتے کہ خود فیصلے اور سزائیں سنا دیں۔ اُسی وقت وہ ایسے منتظم بھی نہیں ہو سکتے جو حکمنامے اور ضمن جاری کر سکیں اور پھر حصہ دار بنیں جو مال کی ضبطی میں نصف کے مستحق قرار پائیں اور اس بات کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ اکثر حالات میں (کامن لا) اصول قانون عامہ پارلیمنٹ کے قوانین پر بھی غالب آجاتا ہے اور کبھی کبھی انھیں بالکل کالعدم قرار دے دیتا ہے۔ کیونکہ جب پارلیمنٹ کا وضع کردہ کوئی قانون حق و صداقت کے خلاف ہو، انصاف کے اصولوں کے منافی ہو، یا ناممکن العمل ہو تو قانون عامہ اس پر غالب رہے گا اور اس قسم کے ہر قانون کو کالعدم قرار دیا جائے گا۔"[1]

آج اس فیصلے کو فطری قوانین کے حق میں نہایت اہم دستاویز قرار دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس میں ضابطۂ کار اور اداروں کے دستور العمل پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ اس میں صرف ایک ٹکڑا ایسا ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق ٹھوس صداقت یا انصاف سے ہے اور وہ یہ کہ اس میں کہا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کے قوانین بھی جو انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوں تو کالعدم سمجھے جائیں گے۔ حق سے کوک کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ حقوق جو قانوناً حاصل کئے جائیں اور پھر قانون ہی کے ذریعے سلب کر لئے جائیں اور یہ مسئلہ کچھ اسی قسم کا ہے جیسا زمانۂ سابق کے نافذ العمل قوانین کی صورت میں پیش آیا کرتا ہے۔ اس اعلان سے ایک اور پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ انسان خود اپنے ہی معاملوں میں جج کا کردار ادا نہیں کر سکتا۔ کوک نے جو فیصلہ سنایا اس میں بڑا ربط اور تسلسل ہے یعنی جس طرح ضابطے ایک دوسرے کے منافی ہو سکتے ہیں اسی طرح ادارے بھی منافی ہو سکتے ہیں۔ کوک اور ان کے ساتھیوں نے اپنے فیصلے کے ذریعے ایک ایسا

---

[1] ملاحظہ ہو تھارن کا مقالہ "ڈاکٹر بانہم کیس" ۵۴ لا کوارٹرلی ریویو ۵۴۳، ۵۵۲ (۱۹۳۸)

ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں عدالتیں غیر جانبدار رہیں اور اس بات کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو کہ کوئی جج خود اپنے معاملے اور مقدمے کا فیصلہ صادر کر سکے۔ اس فیصلے کے بعد بادشاہ اور پارلیمنٹ نے پھر مداخلت کی اور انھوں نے کالج کو ایسے اختیارات دے دئے جس سے کالج نے خود اپنی اجارہ داری برقرار رکھی یعنی اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے کو سزا دینے کے لئے اپنے اراکین میں سے ایک عدالتی بنچ بنالی اور پھر جرمانے کی رقم آدھی آدھی بٹنے لگی۔ کوک نے پھر اس قانونی بیہودگی پر کاری ضرب لگائی اُس نے اس طور طریق پر نہ صرف اپنی نفرت کا اظہار کیا بلکہ یہ ظاہر کیا کہ قانون کا مطلب انصاف ہے اور اس قسم کی کارروائیاں حق و انصاف کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہیں۔

عام طور پر جدید مفکرین کا خیال ہے کہ اس فیصلے میں کوک نے فطری قوانین پر حد سے زیادہ اور معصومانہ تکیہ کیا ہے جس میں غلطی کا امکان ہے لیکن یہ خیال ایسا ہے جس سے سترھویں صدی کی ذہنی سطح کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ یہ خیال ہمارے جدید دور کی پیداوار ہے، اور یہ دور ایسا ہے جس میں یہ یقین پایا جاتا ہے کہ انسانی فطرت یا چیزوں کی نوعیت سے تعلق رکھنے والی بات انفرادی ترجیحات کو چھپانے کی ایک کوشش ہے۔ یہ نئے مفکر ہر قدرتی اصول کو انفرادی پسند کہتے ہیں اور یہ لیبل دو ایسے بعید اصولوں پر جیسے "قوانین بہر حال واضح ہونے چاہئیں" اور "یہ کہ منصفانہ ٹیکس صرف اسی قدر ہوتا ہے جس قدر خود ٹیکس دہندہ کو حکومت سے ملتا ہے" یکساں چسپاں کرتے ہیں کہ یہ بھی انفرادی رائے ہے نہ کہ قرینِ فطرت اُصول۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جن لوگوں نے ہمارے ملک کو جمہوریت اور آئین عطا کیا وہ کوک کے دور کے نظریات سے ہمارے مقابلے میں قریب تر تھے

اور وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ ادارے قانون کے تقاضوں کے منافی نہ ہوں، اور یہ ادارے انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ ہملٹن نے اِس شاعرانہ حُسنِ بیان کو مسترد کر دیا تھا کہ:۔

"طرزِ حکومت کے سوال پر جھگڑنا احمقوں کا کام ہے، وہی نظامِ حکومت بہترین ہے جو بہترین طور پر نظم و نسق چلا سکے۔"

جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے کہ عدالتوں کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ کانگریس کے منظورہ قوانین کو غیر آئینی قرار دے سکیں ہملٹن نے کہا کہ عدلیہ قانون سازی کے معاملے سے قطعاً بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ تحریری آئین موجود نہ ہوں، تو بھی ججوں کو متضاد قوانین سے نپٹنے کے سلسلے میں کچھ ضابطے مرتب ہی کرنے پڑتے ہیں، اور یہ اُصول اور قاعدے کسی مسلّمہ قانون سے نہیں بلکہ فطری طور پر معاملے کی ماہیت نوعیت اور فہم و فراست ہی سے مرتب کیے جا سکتے ہیں[۱]

امریکہ میں مسلسل اس سوال پر بحث ہوتی رہی ہے کہ آیا عدالتوں کو آئین کی تشریح کرتے وقت "فطری قوانین" کے تصورات سے اثر قبول کرنا چاہیے یا نہیں[۲]۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر اصلی مقاصد والے فطری قوانین اور متعلقہ ضابطہ فطری قوانین میں امتیاز قائم رکھا جائے تو اس بحث کا اور بھی مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ "فطری قوانین" کی اصطلاح کا سب ہی نے اتنا غلط استعمال کیا ہے کہ اس کے بارے میں معقولیت پسندی کا رویہ اختیار کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ایک بات یہ واضح ہو چکی ہے کہ آئین کی بعض دفعات سپاٹ اور نامکمل ہوتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی مطلب نکالنا ہی پڑتا ہے۔ ظاہر ہے

---

[۱] "دی فیڈرلسٹ" شمارے ۷۸-۶۸ (ہیملٹن)

[۲] ملاحظہ ہو ایڈم سن بنام کیلی فورنیا۔ ۳۳۲۔ یو۔ ایس ۴۶ (۱۹۴۷)

کہ اس تفسیر کی کسی نہ کسی پر زد پڑتی ہے، اُسے بہت فکر ہوتی ہے کہ باریک بینی سے کام لے کر کوئی معقول مفہوم نکالا جائے۔ دوسری طرف عدلیہ پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تشریح و تعبیر کے گراں بار فرض کو بطریقِ احسن انجام دے۔ ایسی صورت میں عدلیہ اور متعلقہ فریق دونوں ہی کو یہ دیکھنا چاہیے کہ تشریح و توضیح نہایت معقول طور پر کی جائے، اور جہاں تک ممکن ہو جمہوری حکومت، اور خود انسانی فطرت کے تقاضوں کو حتی المقدور پورا کرے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کا تعلق آئینی قوانین میں اُس قسم کے احکام سے ہے جن کو میں نے قانون کے داخلی اخلاق کا نام دیا ہے۔ داخلی اخلاق کو سمجھنے کے بعد جو تشریح کی جائے گی وہ ممکن ہے آئین کے ظاہری الفاظ سے الگ اور بے جوڑ نظر آئے، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ہماری حکومت کے پورے نظام کا جو مقصد ہے وہ مجروح نہ ہوگا اور اس سے وفاداری قائم رہے گی۔ مثال کے طور پر آئین میں کہیں بھی مبہم اور گنجلک قوانین بنانے پر پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اگر ضابطۂ فوجداری کے قوانین میں امر و نہی کی واضح تعریف نہ ہو تو میرے خیال میں کوئی بھی اسے پسند نہیں کرے گا اور جب ایسے مبہم احکام کی خلاف ورزی کے مقدمات میں عدالت "ضابطے کی عدم پابندی" کی بنا پر ملزم کو بری کرے تو عدالت کو خود رائے کوئی نہ کہے گا۔ کیونکہ اخلاق کا تقاضا ہے کہ جن باتوں کی ممانعت کی گئی ہے ان کی وضاحت موجود ہو۔ جب کوئی شخص آئین کے مسودے تیار کرنے کے مسائل سے بحث کرے گا تو وہ اس پر بھی غور کرے گا کہ آئین میں کوئی دفعہ ایسی ہو جو مبہم اور گنجلک قانون سازی کی ممانعت کرتی ہو۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ ابہام کس حد تک روا یا ناروا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا کوئی معیار نہیں ہے اور اسے صرف عام طریقے سے ہی بیان کرنا ہوگا۔

قانون کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عام ضابطوں کے ذریعے انسانی عمل کو منظم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا محاسبہ کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ضابطہ فوجداری اس قدر واضح ہو کہ دونوں مقصد حاصل ہو سکیں۔ ایک مقصد تو یہ ہے کہ شہریوں کو یہ معلوم رہے کہ وہ کون سی اور کس قسم کی چیزیں اور باتیں ہیں جن سے منع کیا گیا ہے، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی قانون کی خلاف ورزی کرے تو انصاف کرنے کے لئے واضح احکام اور معیار موجود ہو اب اگر کوئی اس وسیع معیار کو ایک فقرے میں سمیٹنا چاہے تو بہترین طور پر یہی کیا جا سکتا ہے کہ بہر صورت "قانونی ضابطے کے مقررہ معیار کی تکمیل ہونی چاہیے"

آئین میں کہا گیا ہے کہ معاہدوں کی ذمہ داری کو ساقط کرنے والا ہر قانون ناجائز ہے اور ایسے قوانین کی ممانعت کی گئی ہے لیکن عدالتوں نے اس قسم کے فیصلے دئے ہیں، اگر کسی قانون کے تحت موجودہ معاہدوں کی ذمہ داریاں بہت بڑھا دی گئی ہوں تو وہ قانون بھی خلاف قانون آئین قرار پائے گا کیونکہ یہ امر بھی قابل اعتراض ہے، بظاہر یہ عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن آخر اس فیصلے کی بنیاد اسی آئین پر ہی رکھی گئی ہے۔ معاہدوں کی ذمہ داری کی کمی سے متعلق دفعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بغور دیکھو تو سابق العمل قوانین کی عام برائیوں کی ایک عمدہ مثال ہے۔ آئین کے مسودہ نگاروں نے دانشمندی سے کام لے کر اس بارے میں زیادہ تفصیل و تشریح سے کام نہیں لیا، جب ہم عام مقاصد کو سامنے رکھ کر متعلقہ دفعہ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاہدوں کی ذمہ داری سے بچنا یا اُسے نظر انداز کرنا بھی غلط ہے اور ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ کرنا بھی درست نہیں اس لئے دونوں صورتوں میں قوانین کے اثرات یکساں ہونے چاہئیں۔ معاہدوں کی صورت میں ذمہ داری پوری کرنے

کا معاملہ خاصا کٹھن ہوتا ہے اس لئے انسان کو اچھی طرح جاننا چاہیے کہ موجودہ قوانین کے تحت اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور خلاف ورزی کی شکل میں کیا سزا مل سکتی ہے۔ اگر بعد میں مجلس قانون ساز نے اس قانون کو یکسر بدل دیا اور اس طرح کہ کسی کے حق میں اضافہ اور کسی کے حق میں کمی ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایوان نے متعلقہ لوگوں کا اعتماد کھو دیا ہے اور ان سے بدعہدی کی ہے۔

ممکن ہے کہ میری اس بحث سے کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ میں قانون کے داخلی اخلاقیات کی متضاد خصوصیات بیان کرنے لگا ہوں، میں نے بتایا ہے کہ تحریری آئین میں یہ اخلاقیات تشریح طلب رہتی ہیں، ساتھ ہی میں نے بتایا ہے کہ قانون کے داخلی اخلاق سے متعلقہ مسائل سے نبٹتے وقت عدالتیں نہایت اعتماد اور غیر جانبداری کے ساتھ تشریح و تاویل کر سکتی ہیں لیکن آئین میں وہ باتیں جامع صورت میں نہیں ملتیں جن پر تشریح و تاویل کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ نکتہ اتنا مشکل تھا کہ دستور سازوں نے بھی اس کی وضاحت نہ کی اور ادھورا چھوڑ دیا، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ادھوری اور مبہم دفعات عدالتی تشریح کے لئے ٹھوس بنیاد کس طرح بن سکتی ہیں؟

میرے خیال میں اس سوال کا جواب دیا جا چکا ہے لیکن شاید زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں دیا گیا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ قانون کا داخلی اخلاق زیادہ تر طبعی اخلاق ہے نہ کہ قانونی اخلاق ـــ اور آپ اس طبعی اخلاقیات کے مطالبات اور تقاضے بہت سے گنوا سکتے ہیں لیکن میں نے آٹھ تقاضوں کا ذکر کیا ہے، اور میرا یہ بیان کوئی حرفِ آخر نہیں ہے۔ ان سب کا مقصد ایک ہی ہے اور مختلف حالات اور ضروریات کے تحت ان مقاصد کے حصول کے ذرائع اور راستے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس کا ایک

نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ ہم کسی ایک تقاضے سے نادانستہ طور پر بھی پہلو تہی کریں گے تو پھر اس کی تلافی کے لئے دوسرے مطالبے سے بھی کسی قدر ہٹنا پڑے گا۔ مثلاً عدم تشہیر سے قانونی غلطیاں ہو جائیں تو درستی کو سابق العمل قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے یعنی جب قانون کی اچھی طرح تشہیر نہیں کی جاتی تو اس کی تلافی کے لئے سابق تاریخوں سے قانون نافذ کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ایک تقاضے کو نظر انداز کیا تو دوسرے تقاضے پر ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔ ایسی صورت اس وقت پیش آتی ہے جب بار بار قانون بدلا جاتا ہے تو پھر نہایت ضروری ہوتا ہے کہ قانون کی تشہیر مسلسل کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہیں گے کہ اقتصادی تخمینوں کی طرح قانون کے عناصر کو حالات اور ضروریات کے تقاضوں میں ڈھالنا ضروری ہوتا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عدالتوں کو قانون پر نظر ثانی کرنے کی نہایت اشد ضرورت ہے اور قانون کے داخلی اخلاق کے تقاضوں کو پورا کرنا آئین کی مطابقت کے ساتھ ساتھ ضروری ہے۔ جب بھی موقع ہو عدالتوں کو اس دائرے میں ہوتے ہوئے اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔ اب میں مثال کے طور پر رابنسن بنام کیلیفورنیا[1] کے مقدمے کا ذکر کرتا ہوں جس میں سپریم کورٹ نے واضح طور پر غلط راہ اختیار کی۔ اس مقدمے میں یہ نکتہ پیدا ہوا تھا کہ آیا آئین کی رُو سے کوئی ایسا قانون درست ہوگا جس میں نشے کی حالت یا کیفیت کو ایسا جرم قرار دیا جا سکے جس کی سزا چھ ماہ قید کی ہو۔ یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ سائنسی حقیقت کے طور پر کیفیت نادانستگی میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ متعلقہ قانون، آئین کی آٹھویں ترمیم کے منافی ہے کیونکہ اس میں نہایت غیر معمولی اور ظالمانہ سزا رکھی گئی ہے۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ چھ مہینے کی قید کی سزا" کوئی غیر معمولی اور ظالمانہ

---

[1] ملاحظہ ہو ۳۷۰ یونائیٹڈ اسٹیٹس ص ۶۶۰ (۱۹۶۲)

سزا نہیں ہے لیکن اس سزا میں جیل کی قید و بند کی زندگی کی مصیبتوں کا تصور ضرور موجود ہے۔ اِس اعتراض کے جواب میں عدالت نے یہ دلیل دی کہ کسی سزا کے ظالمانہ یا غیر معمولی ہونے کا فیصلہ اس جرم کی نوعیت کے پیش نظر کرنا ہوگا جس کے لئے سزا دی گئی ہے اس لئے عدالت نے خواہ مخواہ یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی کہ یہ تصفیہ کرتی رہے کہ سزا جرم کے متناسب ہو۔ یہ ذمہ داری بلا وجہ ہے اگرچہ عظیم ہی کیوں نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ عمل انصاف کے معاملے میں اس موشگافی کی ضرورت نہیں۔ امریکی دستور میں یہ ممانعت کردی گئی ہے کہ فوجداری کے قوانین زمانۂ سابق سے نافذ العمل نہیں ہونے چاہئیں اور آئینی قانون کا ایک مُسلّمہ اُصول یہ بھی ہے کہ جرم کی قانون میں جو تشریح کی جائے وہ خاصی حد تک واضح اور صاف ہونی چاہیے، قانون سازی کی آزادی پر یہ دونوں احتیاطی پابندیاں اس نظریئے پر مبنی ہیں کہ فوجداری کے قوانین عوام کے سامنے ایسی شکل میں پیش کئے جائیں کہ وہ اپنا عمل اس سے ہم آہنگ کر سکیں۔ مختصر یہ کہ وہ قانون پر کاربند رہ سکیں۔ بے گناہی میں نشے کی حالت میں پایا جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے قانونی فعل قرار دے دیا جائے اور اُسے نافرمانی سمجھنا بھی درست نہیں۔ اب اگر مذکورہ مقدمے کا فیصلہ روایتی انداز سے کیا جائیگا تو اس میں وہی دشواریاں پیدا ہوں گی جو ایسی صورت میں پیش آتی ہیں جب فوجداری کا کوئی "قانون" مجلس قانون سازنے خفیہ رکھا ہو اور جب تک مقدمہ میں اس کا انکشاف نہ ہو جائے وہ خفیہ ہی رہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہمارے آئین میں یہ بات ضروری قرار نہیں دی گئی ہے کہ قوانین کو شائع کیا جانا چاہیے۔

قانونی اخلاق اور قانونِ موضوعہ کا تصوّر

(Positive Law)

اب ہماری بحث اس مرحلے پر آگئی ہے کہ پچھلے ابواب میں ہم نے قانون کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اُس کا وضعی قانون کی مروجہ تعریفوں کی روشنی میں جائزہ لے کر باہمی بندشوں اور رابطوں کی وضاحت کی جائے۔ قانون کی تعریف کے سلسلے میں جو اُصول یا نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ اب قارئین پر واضح ہو چکا ہو گا، یعنی قانون انسانی عمل کو ضابطوں کا پابند بنانے کی کوشش کا نام ہے۔ قانون کے جدید ترین نظریات کے برعکس ہمارے نظریے میں قانون کو ایک عمل قرار دیا گیا ہے اور نظامِ قانون کو ایک مسلسل بامقصد جدوجہد کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ آیئے ہم اس نظریے کے اثرات و عواقب کا اِن دوسرے نظریات سے موازنہ کریں جو اس کے خلاف پیش کئے گئے ہیں:۔

سب سے پہلے میں اس نظریئے کو لیتا ہوں جو اِن ابواب میں پیش کردہ نظریئے کے بالکل برعکس ہے اور وہ جس انداز اور طنطنے سے پیش کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرے اور اس کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے تاہم اس کی نظریاتی بحث میرے خیالات سے ہم آہنگ بھی ہو سکتی ہے گو بظاہر یہ امر محال معلوم ہوتا ہے۔ یہ مخالف نظریہ جسٹس ہومس (Holmes) کا ہے جو قانون کے قیاسی نظریئے کے نام سے مشہور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"قانون سے میری مراد اُن باتوں کا قبل از وقت ادراک و انکشاف ہے جو عدالتیں عملاً کریں گی، یعنی عدالتیں آخر میں

جس فیصلے اور نتیجے پر پہنچیں گی وہی قانون ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔[1]

اب یہ بات بھی ظاہر ہے کہ پہلے سے کسی بات کا علم و ادراک ہونے کے لئے بھی کسی نہ کسی قسم کے اصول کے وجود کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس نظریے والوں کو اُن اثرات کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا اور ان اثرات میں ثبات بھی چاہیے جن کی بناء پر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ عدالتیں حقیقتاً کیا کریں گی؟ ہومس نے قانون کی تلوار پر ساری توجہ مرکوز کر دی لیکن احکام سے اصول اخذ کرنے کا تذکرہ ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے خود بیان کیا ہے کہ اس نے یہ اس خیال سے کیا کہ قانون اور اخلاق کے درمیان واضح طور پر حدِ فاصل قائم رکھی جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اس مقصد میں کامیابی اسی وقت حاصل کر سکتا ہے، جب خود پیشگوئی کے عمل کی تشریح کرنے سے پہلو تہی کرے۔ اگر ہم اعتماد کے ساتھ یہ بتا سکتے ہیں کہ عدالتیں درحقیقت کیا کریں گی تو پھر ہمیں یہ غور بھی کرنا چاہیے کہ وہ کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، بلکہ ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہیے اور قانون سازی کے اس مقصدی عمل میں شریک ہونا چاہیے جو انسانی عمل کو ضابطوں میں ڈھالنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اگر ہم عدالتوں کے عمل اور کوشش کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ چاہیے کہ اپنے آپ کو ایک ایسا جج تصور کریں جس کے سامنے ایک ایسا قانون ہے جو عملی اعتبار سے بہت ہی مبہم ہے لیکن قانون کے دیباچے میں جس مقصد کی وضاحت کی گئی ہے وہ ایسا ہے جسے وہ جج درست نہیں سمجھتا پھر بھی ایک معقول نتیجے پر پہنچنے کی سعی کرتا ہے اور ایک اصول مرتب کرتا ہے، یہی میرا نظریہ بھی کہتا ہے۔ اگر ہم قانون کا مسودہ تیار کرنے والے سے یہ

---

[1] ملاحظہ ہو "دی پاتھ آف دی لا"۔ ۱۰ ہارورڈ لاریویو صفحہ ۴۵۷ بر صفحہ ۴۶۱ (۱۸۹۷)

شکایت کریں کہ قانون مبہم ہے تو وہ بیچارا دن بھر کا تھکا ہارا جس پریشانی کا اظہار کرے گا وہ ظاہر ہے، یعنی وہ یہی کہے گا مجھے معلوم ہے اس میں اصلاح اور ترمیم کی گنجایش ہے، اور اگر مسودے کی اصلاح نہ ہوئی تو لوگوں کو بہت سے ایسے کاموں پر عدالت میں پیش کردیا جائے گا جو ہمارے خیال میں بھی نہیں تھیں لیکن میں کیا کروں، آخر میں کب تک مسودہ پر نظر ثانی کرتا رہوں گا۔"

عدالتیں قانون کی جو با مقصد تعبیر کرتی ہیں ان میں بہر حال کچھ نہ کچھ اصول برتے جاتے ہیں۔ ان اصولوں پر خاص توجہ صرف ہومس کے نظریے ہی سے وابستہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر فرائیڈمین (Fried mann) "اخلاق پر مبنی قانون" اور "وضعی قانون" کے نظریات کے بین بین ایک نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی جسمیں عملی انصاف کے کسی خاص تصوّر کی گنجایش نہیں رکھی گئی ہے۔ انھوں نے قانون کی تعریف اِن لفظوں میں کی ہے۔

"قانون کی حکمرانی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ امن عامّہ برقرار رہے۔ اس کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں کہ ایک منظم حکومت ہو، جو قیامِ امن اور نظامِ حکومت کی برقراری کے لئے مختلف ذریعوں اور اداروں کی معرفت کام کرتی ہو، چنانچہ اسی مفہوم میں نئے دور کے ہر معاشرے میں قانون کی حکمرانی ہے حتیٰ کہ فسطائی اور سوشلسٹ اور آزادی پسند ریاستوں میں بھی اس مفہوم میں قانون حکمرانی ہوتی ہے۔"[۱]

لیکن یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ 'امن عامہ' سے ملتی جلتی کیفیت تو اس وقت بھی ہوتی ہے جب غیر قانونی جبر و تشدّد کے سبب ہر طرف سکوت اور سنّاٹا ہو اور لوگ چپ چاپ گھروں میں بیٹھے ہوں، اور ہنگامہ آرائی سے کوسوں

---

[۱] ملاحظہ ہو فرائیڈمین کی "لا اینڈ سوشل چلینج" صفحہ ۲۸۱ (۱۹۵۱)

دور ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ فرائیڈ مین کے ذہن میں "امنِ عامہ" کا یہ تصور نہیں ہے، کیونکہ وہ "منظم حکومت" "قانونی احکامات کے تحت چلائے جانے والے اداروں" کی بات بھی کرتے ہیں، لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ اور وضاحت سے کام نہیں لیتے۔ وہ تو قانون کو بس قانون ہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس لحاظ سے نازی جرمنی کا قانون بھی اسی طرح کا ایک "قانون" گردانتے ہیں جیسا دوسرے ملکوں کا ہوتا ہے۔ میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا کہ میں نے گزشتہ صفحات میں قانون کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس نظریئے سے بہت الگ اور مختلف ہے۔

قانون کے بارے میں جو مختلف نظریات پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر کا خاصّہ ہے کہ دباؤ اور طاقت کے استعمال کو قانون کا ایک امتیازی نشان سمجھا گیا ہے، میں نے اس امتیاز کو تسلیم نہیں کیا، میرا قانون کا تصور مندرجہ ذیل تعریف کے بالکل برعکس ہے جس میں ایک علم الانسان کے ماہر نے قدیم معاشرے کی مختلف معاشرتی نظاموں میں ایک قانون کے قائم کردہ نظام میں "قانونی عنصر" کا سراغ لگایا ہے، اور یہ کہا ہے کہ:-

"عملی مقاصد کے لئے قانون کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے، وہ سماجی عمل قانونی ہوتا ہے، جس کی اگر مسلسل خلاف ورزی کی جائے اور جسے برابر نظرانداز کیا جاتا ہے خواہ عملاً ہو یا اصولاً"، تو پھر معاشرے کے افراد یا طبقے جن کی حیثیت یا قدرت" نفاذ" معاشرے کو تسلیم ہو، اُس کے تدارک کے لئے طاقت استعمال کرنا ضروری سمجھیں۔[۱]"

جدید تحریروں میں بھی یہ خیال عام طور پر پایا جاتا ہے کہ دوسرے سماجی اعمال سے قانون کو ممیز کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے دفاع کے لئے طاقت

---

[۱] ملاحظہ ہو ہبل "دی لا آف پری میٹیو مین" ص ۲۸ (۱۹۵۴)

استعمال کرنے کا اختیار اور مجاز حاصل رہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نظریے کی وجہ سے قانون کے مقاصد اور نصب العین کے بارے میں ہمارے خیالات اور گنجلک ہو گئے ہیں اور ان کا کوئی واضح تصور نہیں ابھرتا۔ یہاں یہ سوال کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتیاز اور شناخت کا نظریہ کہ طاقت یا جبر کا اختیار اور مجاز جزوِ نظامِ قانون ہے کیونکر پیدا ہوا۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسانی فطرت جیسی کچھ ہے اس کے پیشِ نظر یہ بات پوری طرح ظاہر ہے کہ اگر قانونی ضوابط کا کوئی نظام ایسا ہو جس میں غیر قانونی تشدد کا عمل بلا روک ٹوک جائز ہو، تو پھر یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات تشدد کا توڑ تشدد ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ امر قابلِ قیاس ہے کہ عام طور پر معاشرے میں کوئی ایسا انتظام بھی ضرور ہونا چاہیے کہ اگر ضرورت ہو تو قانون کے تحفظ کے لئے طاقت کا استعمال کیا جا سکے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طاقت کے استعمال کو قانون کی خصوصیات میں شمار کر لیا جائے۔ جدید سائنس کا بڑی حد تک دارومدار پیمائش اور تجرباتی آلات پر ہے لیکن سائنس کو صرف پیمائش اور تجربے کے آلات کا استعمال کہنا درست نہیں، یہی حال قانون کا بھی ہے۔ قانون خود الگ چیز ہے اور اس کے مقاصد کے حصول کے لئے جو عمل اختیار کیا جائے وہ دوسری چیز ہے۔

قانون اور طاقت کے استعمال کو لازم و ملزوم قرار دینے کے سلسلے میں ایک اور بات یہ ہے کہ نظامِ قانون میں تشدد کے استعمال کی گنجائش ہو تو نفاذِ قانون کے لئے ضابطۂ مقررہ قانون کی حرف بحرف پابندی پر بے حد اصرار ضروری ہو جاتا ہے۔

مہذب اقوام میں فوجداری کے مقدمات میں سخت تدبیریں اور ضمانتیں ضروری

سمجھی جاتی ہیں تاکہ قانون کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باضابطہ کارروائی اور طریقۂ کار اختیار کرنے پر اصرار فوجداری مقدمات میں یوں ضروری ہے کہ طاقت کے استعمال میں قانون اپنے سے وفادار رہے۔ قدیم معاشرے میں یہ امتیازی خصوصیت زیادہ ملے گی جہاں نجی تشدد کو روکنے کے لئے اور نفاذِ قانون کے لئے سخت اقدامات کی ضرورت پڑتی تھی۔ سزا دینے سے پہلے مقررہ رواجوں اور رسوم کی پابندی پر اصرار اسی وجہ سے تھا۔

بہرحال ان باتوں سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قانون اور طاقت کے استعمال کے باہمی تعلق کے بارے میں جدید رجحانات کیا ہیں، لیکن اس طرح صرف ایک حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے، اس کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ آئیے ایک مثال کے ذریعے ہم اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ فرض کیا کہ ایک قوم غیر ملکی تاجروں سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس ملک کی حدود میں اپنی تجارتی سرگرمیاں شروع کرنے سے پہلے قومی بنک میں ایک مقررہ رقم اس بات کی ضمانت کے طور پر جمع کرائے کہ وہ متعلقہ قوانین کی پابندی کریں گے۔ متعلقہ قوانین کے نفاذ پر دیانت سے عمل کیا جاتا ہے اور اگر تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو خصوصی عدالتیں اس کا فیصلہ کرتی ہیں، اور اگر قانون کی خلاف ورزی ثابت ہو جاتی ہے تو وہ ضمانت کی رقم کا ایک حصہ بطور جرمانہ ضبط کر لیتی ہیں۔ اس ضبطی کے لئے طاقت کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی، صرف کاغذات میں جمع تفریق کر کے مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ تاجروں کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں جو اس کارروائی کو روک سکے۔ اگر اب کوئی یہ کہے کہ اس نظام میں نفاذِ قانون کے لئے طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑی اس لئے یہ نظام جبر کے استعمال سے خالی نہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ خیال غلط ہوگا۔ قانون اس بیان کردہ صورت

میں بلاجبر باقاعدہ زیرِ عمل ہے۔ ہاں اگر مسلّمہ ضابطوں اور ججوں کے فیصلوں پر اعتماد نہ ہو اور وہ محض نمائشی ہوں اور محض دکھاوے کی چیزیں ہوں تب تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ نظامِ قانون کا فقدان ہے۔

میرے خیال میں اس وضاحت کے بعد اب یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس نکتے پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ قانون اور استعمالِ طاقت کے باہمی تعلق کی بحث میں جبر اور طاقت کے استعمال کا کیا مفہوم لیا جا سکتا ہے۔

استبدادی حکومت میں لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اگر انھوں نے کبھی حکم عدولی کی تو انھیں زندہ جلا دیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ خوف کے مارے مروجہ قانون پر کاربند رہتے ہیں تو کیا طاقت کے استعمال کی دھمکی اسی چیز کا نام ہے، اگر ایسا ہی ہو تو پھر طاقت کا یہ ایک نیا مفہوم ہے اور صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر کوئی نظامِ قانون واقعی نظام ہے تو پھر اسے عملی اُمور میں قدرت ضرور حاصل ہونی چاہیے خواہ اس قدرت کی بنیاد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اب یہ نظریہ ایسا ہے جو ناقابلِ اعتراض ہے، گو اس کا تعلق بھی نفاذ سے ہے قانون سے نہیں۔

قانون کے مختلف نظریات میں طاقت کے عنصر کا گہرا تعلق اس خیال سے بھی رہا ہے کہ اس میں اقتدار اور اختیارات کا ایک اعلیٰ ادارہ ہوتا ہے۔ ہیوبیل کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے اس میں اس تعلق کا فقدان ہے، کیونکہ وہ علم الانسان کا ماہر تھا اور قدیم قوانین سے اس کا زیادہ تعلق تھا، اور قدیم دور میں کوئی واضح ادارۂ اقتدار موجود نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب قومی شعور پیدا ہوا اور مملکتیں وجود میں آئیں تو ہوبس سے لے کر آسٹن، کیلسن اور سوملو

تک فلسفۂ قانون کے ماہرین اور اکابرین کا ایک گروہ سامنے آتا رہا اور انہوں نے کہا کہ قانون کا نفاذ حکومت کے زیر اثر ہونا لازم ہے۔ یعنی حکومت کے تصور کے بغیر قانون کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اُن کا یہ تصور اس بنیاد پر ہے کہ متعدد سرگرمیوں کے بغیر قانونی ضابطوں کا کوئی نظام بے معنی ہو گا، اس لئے ضروری ہے کہ حکومت کے ادارے قائم ہوں اور اُن کے دائرۂ کار کے اندر قانونی عمل جاری رہے۔

فلسفۂ قانون کو اس نظرئیے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ جس مکتبۂ فکر میں اسے قبول کیا گیا ہے اس میں رائے کے بڑے اختلافات بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی معقول حل نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر اس دلیل کو لیجئے کہ آیا "قانون" میں صرف عمومی ضابطے شامل ہیں یا اس میں خصوصی اور انفرادی احکامات کو بھی شامل سمجھا جائے۔ کچھ لوگ عمومیت کو لازم سمجھتے ہیں کچھ نہیں۔ جو عمومیت کے نظرئے سے متفق ہیں وہ "عمومیت" کی تشریح پر اتفاق نہیں کرتے۔ کیا قانون کے لئے عمومیت اشخاص کی ضروری ہے یا اعمال کی۔ وہ بہت لوگوں کے متعلق ہو یا متعدد افعال پر حاوی ہو؟ یا دونوں عنصر عنصر درکار ہیں؟ یہ ساری دلیل جو بحث اور رائے اور جوابی بحث اور رائے پر ختم ہوتی اور انجام کار تشنہ ہی رہ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بحث بے معنی ہے اگر قانون کا مطلب صرف یہ ہے کہ سرکاری اختیار کے تحت حسب مرضی اور بے ڈھنگے طور پر احکام نافذ ہوتے رہیں تو ظاہر ہے کہ شہری اپنے عمل کو قانونی نظام کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتے۔ اور کوئی نظام قانون صورت پذیر نہیں ہو سکتا۔

اگر ہم یہ سوال کریں کہ حکمران کے حکم کا نام ہی قانون ہے تو قانونی تصور کا مفہوم کیا ہے، تو جواب اس کے علاوہ کیا ہے کہ یہ تصور سیاسی قومی مملکت کے

قانونی اقتدار کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ درست اور واضح جواب یہ ہوگا کہ اس میں یہ خواہش موجود ہے کہ تنازعات کا فیصلہ نظامِ قانون کے دائرے میں رہ کر کیا جائے۔ لیکن غور کیجئے تو میرے نظرئیے کے مطابق اس تصور میں، قانون کے داخلی اخلاق کا ایک اُصول (یعنی قوانین میں تضاد نہ ہونا چاہیے) مکمل اور قطعی مان لیا گیا ہے، اور دوسرے تمام اُصولوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے کیلسن اور سوملو (Kelson-Somlo) دونوں نے داخلی ارتباط پر بہت زیادہ توجہ دی ہے اور یہ ان کے نظریات کا ایک بنیادی عنصر بن گیا ہے[1]۔ یہ درست ہے کہ نظامِ قانون میں جو تصفیہ طلب تضادات ہوں ان سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے یا پھر انہیں اس وقت طے کرنا چاہیے جب ایسے تنازعے پیدا ہوں۔ لیکن اگر صرف تضاد ہی نظامِ قانون کا عیب ہو تو پھر کیسے متضاد قوانین کے نظام اور مبہم ضابطوں کے نظام میں کوئی امتیاز قائم رکھا جائے، کیونکہ مبہم ضابطے بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں تضاد یا عدمِ تضاد کا پتہ چلانا غیر ممکن ہوتا ہے۔

اِس کا ایک جواب یہ ہے کہ اگر قانون ساز چاہتے ہیں کہ ان کے بنائے ہوئے قوانین مؤثر ہوں تو فہم و فراست سے کام لے کر ایسے قوانین بنا سکتے ہیں جو خاصے واضح اور قابلِ فہم ہوں۔ البتہ حکومت کے ادارے قانون پر عمل کرنے میں جو مختلف ضابطے بروئے کار لاتے ہیں ان میں بہرحال تضاد رہ سکتا ہے اور یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، مگر "حکومت کے وضعی قانون" کے قائلوں کا ایک امکانی جواب یہ ہو سکتا ہے، مگر میرے خیال میں ان کا یہ جواب شافی نہیں۔ بعض حکومتیں قصداً قانون کو مبہم رکھ سکتی ہیں۔ کیا یہ عمل اچھے نظامِ قانون کا نام پا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم قانون اور اس پر عمل کی مشکلات کا حل صرف قانون کی نئی تعریف سے کرنا چاہیں تو ساری بحث

---

[1] ملاحظہ ہو کیلسن "جنرل تھیوری آف لا اینڈ اسٹیٹ" (۱۹۴۵) ص ۴۰۱۔ سوملو "جورسٹش گرنڈلہرے" (۱۹۲۷)

بیکار اور بے نتیجہ ہو گی۔ قانون کی یہ تعریف بالکل صاف ہے کہ اس میں داخلی تضاد نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اُصولاً نچلی سطح پر تنازعات کا حل کرنے کے لیے اونچی سطح پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی مثال موجود رہتی ہے۔ لیکن عملاً جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ بہر حال ایک مسئلہ بنی رہتی ہیں۔ کیونکہ خود یہ سوال بھی خاصا نازک ہے کہ تضاد کے کیا معنی ہیں، اور کون سی باتوں کو متضاد سمجھا جانا چاہیے۔ کیلیسن اور سوملو نے تضاد کو دور کرنے کے مسئلے پر بڑی بحث کی ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ انھوں نے کسی ایسے مسئلے کو نہیں لیا جو نفاذِ قانون کی عملی مشکلات سے متعلق ہو۔ اس کے برعکس زبانی بحث لمبی چوڑی کی گئی ہے اور کچھ اس طرح کی باتیں کہی گئی ہیں "منطقی طور پر یہ کہنا غلط ہو گا کہ ایسا ہونا بھی چاہیے، اور ایسا نہیں بھی ہونا چاہیے۔"[1] یہ بحث کسی جج کے کام نہیں آسکتی۔ کیونکہ اگر اس کے سامنے ایک قانون کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ زید کو ٹیکس ادا کرنا چاہیے اور دوسری دفعہ میں اُسے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہو، تو اس صورت میں وہ کون سی راہِ عمل اختیار کرے۔ سوملو صاحب کا اُصول یہ ہے کہ "ایک تضاد اصلی ہوتا ہے ایک ظاہری۔ اور اصلی تضاد کی صورت میں متضاد ضابطے ایک دوسرے کو منسوخ کرتے ہیں۔" اس قسم کی باریک بحث سے بھی جج کو عملاً کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔[2]

اگر تضاد کے تمام مسائل کسی ایک تعریف کی مدد سے حل کر سکیں تو بھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ ایک برسرِ اقتدار جماعت یا حکومت ہی نظامِ قانون کے تنازعات کو حل کرنے کے لئے بہترین ذریعہ بن سکتی ہے۔ جب ماتحت عدالتوں

---

[1] ملاحظہ ہو کیلیسن کی محولہ بالا کتاب صہ ۳۷۴

[2] سوملو کی کتاب محولہ بالا صہ ۳۸۳

ہیں۔ یہ بحث چھڑتی ہے کہ قانون کیا ہے؟ تو کیا صورت حال پیش آتی ہے؟ اس کا ذکر کرتے ہوئے گرے [illegible] نے یہ بات پہلے سے فرض کرلی ہے کہ عدلیہ موجود ہے۔[۱] چنانچہ وہ ماتحت عدالتوں کے اُٹھائے ہوئے سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ سپریم کورٹ جو کچھ کہے وہی قانون ہے۔ لیکن ایسا نظام عدالت بھی ممکن ہے جہاں سب عدالتیں برابر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور جس کے جج صاحبان اپنے اختلافی اور متنازعہ مسائل کو طے کرنے کے لئے کبھی کبھی اپنا اجلاس کرتے ہوں اور باہمی رواداری اور افہام و تفہیم کے جذبے سے قانونی گتھیاں معقول طریقے پر سلجھا لیں۔ اسی قسم کی بات اس موقع پر ہوئی تھی جب اپیلوں کی سماعت کرنے والے جج مقدموں کی سماعت کرنے والے اجلاس کی صدارت کرتے تھے اور مشکوک مقدمات کو پوری عدالت کے سامنے زیر بحث لایا کرتے تھے۔

امریکہ میں صنعتی یونین قائم ہے اور ایک ایسا دستور العمل بھی ہے جسے ہم صنعتی قانونچہ کہتے ہیں کسی کارخانے میں باہمی تعلقات کو درست رکھنے کے لئے جو ضابطے ہوتے ہیں وہ کسی مجلس قانون ساز نے نہیں بنائے بلکہ انتظامیہ اور مزدور یونین کے مابین معاہدے کی رُو سے مقرر ہوتے ہیں۔ اس نظام قانون کی "عدالت" فریقین کے مقرر کردہ ثالث ہوتے ہیں اور وہ اتفاق رائے سے چُنے جاتے ہیں۔ اِس نظام میں ناکامی کے امکانات بہت ہیں۔ اگر دونوں فریقوں میں سمجھوتہ نہ ہو تو حقوق اور اجتماعی سودے بازی کے بنیادی منشور اور معاہدے وجود میں ہی نہیں آتے، یا پھر جب کسی کامیاب معاہدے کے تحت تنازعے پیدا ہوں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فریقین ثالث مقرر کرنے پر بھی اتفاق رائے نہ کرسکیں عام طور پر اس امکان کے پیش نظر کوئی نہ کوئی انتظام پہلے سے موجود رہتا ہے۔

---

[۱] گرے "دی نیچر اینڈ سورس آف لا" (۱۹۲۱) ص ۱۱۷

مثال کے طور پر اگر ثالثی پر اتفاق نہ ہو تو امریکی ثالثی ایسوسی ایشن کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود ثالث نامزد کر دے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ آخری علاج ہے اور پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ حالات موافق نہ ہوں تو بہتر سے بہتر نظامِ قانون کا بھی شیرازہ بکھر جاتا ہے خواہ اُس میں اقتدارِ اعلیٰ اور سلسلۂ اقتدار بہت باقاعدگی سے منظم کیا گیا ہو۔ بعض علماء قانون کو اقتدار اور صاحبانِ اقتدار کے احکام کا مظہر قرار دیتے ہیں، اسی نظریاتی بحث کے سلسلے میں پاشوکانس (PASHUKANIS) نے لکھا[1] ہے کہ اگر قانون کا لازمی عنصر یہی ہے کہ اس میں سلسلہ حکّام مقررہ اور قواعد و ضوابط بڑے منظّم اور مرتّب شکل میں ہوں تو پھر یہ کہنا درست ہو گا کہ فوج کا نظامِ قانون سب سے زیادہ منظّم اور مرتب ہوتا ہے لیکن فوجی نظامِ قانون کو مثالی قانون تصور کرنا عقلِ سلیم کے منافی ہے۔ خالص نظریٔے اور قابلِ عمل اصولوں کے درمیان جو تصادم ہے وہ یہ ہے کہ نظریوں میں بامقصد سرگرمیوں کے عنصر کو نظرانداز کر کے دوسری باتوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ فوجی نظامِ قانون اور شہری نظامِ قانون کے مقاصد اور لوازمات میں کیا فرق ہوتا ہے۔

بعض اوقات نچلی سطح پر جب عام شہری کو قانون کی کسی غلط تشریح کے سبب مصائب کا شکار ہونا پڑتا ہے تو اُسے کس قدر بے بسی کا سامنا ہوتا ہے، اور خود اعلیٰ عدالتوں کو بھی اس صورتِ حال کے سلجھانے میں دقّت ہوتی ہے لیکن فوجی نظامِ قانون میں ایسا کوئی موقع پیش نہیں آتا سوائے مارشل لا کے دوران، جب فوج کو عدل اور انصاف کے فرائض خود سنبھال لینے پڑتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو "جنرل تھیوری آف لا اینڈ کمیونزم"، مترجمہ باب "سوویٹ لیگل فلاسفی" ٹونیتھ سنچری لیگل فلاسفی سیریز نمبر ۵ صفحہ ۱۵۴ (۱۹۵۱)

قانون کے نظریات کے بارے میں ہماری یہ بحث اس وقت تک ادھوری رہے گی جب تک ہم پارلیمانی بالادستی کے اصول کا ذکر نہ کریں۔ اس اصول کے تحت مثال کے طور پر برطانیہ میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ اس نظریے کا تجزیہ اس لئے ضروری ہے کہ ان کا گہرا تعلق ان نظریات سے ہے جن میں سلسلۂ اقتدار اور حاکموں کے درجہ بدرجہ اختیارات کو نظام قانون کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پارلیمانی بالادستی کی اس بنا پر مکمل حمایت کی جائے گی کہ ایک ایسا ادارہ ضروری ہے جو ناگہانی حالات اور نادیدہ صورت حال میں قانون سازی کے فرائض انجام دینے کے لئے ہر وقت موجود رہے بالکل بدلے ہوئے حالات میں نئے تقاضوں کو پورے کرنے کے لئے پارلیمنٹ کو اختیارات ضرور ہونے چاہئیں لیکن اگر ان اختیارات پر سخت قیود عائد کر دی جائیں تو انصاف کے تقاضے میں رکاوٹ بھی پڑ سکتی ہے۔ اگر حالات کے تقاضے بہت شدید ہوئے تو ہو سکتا ہے کہ اسے پورا کرنے کے لئے فریب اور مفروضات کا سہارا لیا جائے جو بذاتِ خود حکومت کے اخلاقی ماحول اور اداروں میں بدعنوانیوں کو جنم دے سکتے ہیں، اس نکتے کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی جا سکتی ہے جو ایک سخت قید کے طور پر امریکی آئین میں موجود ہے مثلاً ہمارے آئین کی ایک دفعہ یہ ہے کوئی ریاست، سینٹ میں مساوی نمائندگی سے محروم نہیں کی جا سکتی، صرف یہی ایک آئینی بندش موجود ہے جو خود آئین میں ترمیم کے ذریعے دُور کی جا سکتی ہے۔[1]

---

[1] دستور ریاستہائے متحدہ آرٹیکل نمبر ۵۔ یہاں مراد اس کے بعد کے فقرات پڑھتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس دستور میں ترمیم ریاستوں کی دو تہائی اکثریت سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی ترمیم ایک تہائی ریاستوں سے ایک زیادہ ریاست کو منظور نہیں تو کبھی پاس نہ ہو گی۔

اب ایسا تو ہو سکتا ہے کہ مثلاً کسی طوفان یا تباہی سے کسی یا کچھ ریاستوں کی بہت سی آبادی گھٹ جائے، فرض کیجئے ایک تہائی ریاستوں کی آبادی صرف ایک ایک ہزار رہ جائے ایسی صورت میں سینٹ میں مساوی نمایندگی دنیا میں سیاسی حماقت ہو گی۔ اگر اس حالت میں مساوی نمایندگی کے اصول پر کاربند رہیں تو قوم کی ساری سیاسی زندگی تہہ و بالا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کوئی نہ کوئی نئی قانونی شکل ذہن میں آئے گی۔ شاید ہم کہیں کہ آئین میں ترمیم کر کے سینٹ کے اختیار گھٹا دئے جائیں اور اسے بھی برطانوی دارالامراء کی طرح بنا دیا جائے، یا پھر سینٹ کو ختم ہی کر دیا جائے، اور ایک ایوان رہنے دیا جائے، یا اگر رائے عامہ ساتھ دے تو سینٹ کا نام بدل کر مجلس اکابرین (Council of Elders) رکھ دیا جائے اور نشستوں کی تقسیم و تخصیص از سر نو کی جائے۔ غرض ترمیم کی مشکلات سے اندازہ ہو گا اس خاص حد تک پارلیمانی دستور سازی کے طریقے سے جو انگلستان میں مروج ہے اگرچہ وہاں ترمیم کی آسانی بھی غلط نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

پارلیمانی بالادستی کا اصول درست ہے اور اسکے ساتھ تحریری آئین کی بعض اٹل باتیں بھی قابل توجہ ہوتی ہیں ان دونوں کے باہمی موازنے کے دوران ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پارلیمانی بالادستی کا اصول بظاہر نہایت سادہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ پارلیمانی بالادستی کا مفہوم یہ ہے کہ پارلیمنٹ اس اعتبار سے قانون سے بالاتر ہے کہ جو قانون اسے ناپسند ہو اُسے وہ بدل سکتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اُسے قانون سے بالاتر ہونے کی پوزیشن بھی اسی بنا پر حاصل ہوئی ہے کہ وہ خود بھی قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ اور یہ قانون اس کے داخلی طریقۂ کار کا قانون ہے۔ قانون منظور کرنے کے لئے اُن قوانین کی مطابقت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو قانون منظور ہونے پر اس عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ثابت

ہوں گے۔ اور یہ قوانین خود بھی ہر قسم کی شکست و ریخت کے تابع ہوتے ہیں یعنی یہ اس قدر مبہم اور متضاد بھی ہو سکتے ہیں کہ قانون سازی میں زیادہ معاون ثابت نہ ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وقت ضرورت اِس معیار کو بھی نظر انداز کر دیا جائے اور قانون سازی کے معیاری اصولوں کو پسِ پشت ڈال دیا جائے' قانون سازی کے اختیارات اگر محدود ہوں تو بعض اوقات بحران پیدا ہو جاتا ہے لیکن قانون سازی کے قانونی 'طریقۂ کار' میں بھی' اور غالباً زیادہ آسانی سے 'بحران پیدا ہو سکتا ہے۔ انگلستان میں بھی' جہاں عوام اور اصول اور اضابطے کے بڑے پابند ہیں۔ ایسا واقعہ بھی رونما ہوا کہ پارلیمنٹ کی روداد میں سے ایک ایسے مسئلے کو قانون سمجھ کر عمل کر لیا گیا جو ابھی محتاجِ منظوری تھا[۱]۔ اقتدار کا وہ ڈھانچہ' جو قانون کی تنظیم کا ذمہ دار ہوتا ہے' خود بھی قانون ہی کی پیداوار ہوتا ہے۔

جن ملکوں میں پارلیمانی بالادستی کا اصول مستحکم ہو چکا ہے وہاں قانون کی افادیت پر بحث کم ہوتی ہے اور ضابطۂ قانون سازی کے پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے[۲]۔ جو لوگ اس اُصول کے حامی ہیں انھوں نے اسے قانون کا اُصول قرار دیا ہے۔ ایک حد تک اس اصول کے ناقدین نے بھی اس دلیل کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن ضابطہ قانون سازی کے علاوہ خود نوعیت قانون کی نظریاتی بحث شروع کی جا سکتی ہے، جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں میری تحقیق میں قانون' انسانی عمل کے لئے اصول اور ضابطے وضع کرنے کا نام ہے۔ پارلیمانی بالادستی کا اصول

لے ملاحظہ ہو "دی لا آف کانسٹی ٹیوشن" از ڈائسی۔ طبع دہم ۱۹۶۰ء دیباچہ صـ ۴۰

لے اس کی واضح مثالیں پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں میں اجرائے پروانہ کی درخواستوں کے فیصلوں میں ملتی ہیں۔ بحث یہ ہوتی ہے کہ ضابطے کی عدم پابندی کی بنیاد پر نزاعی حکم ناقابلِ قبول ہے اور منسوخ کیا جائے۔

صرف وضع کرنے کے طریقہ کار کو بے حد فوقیت دیتا ہے اور عمل کی نوعیت کی پرواہ کم کرتا ہے۔ ڈائسی (Diecy) نے بہت پہلے پارلیمانی بالادستی کا جو دفاع کیا ہے اس میں اس نے اس نظریے کے اثرات کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے۔ اپنے استدلال کے آخری پیراگراف میں وہ لکھتا ہے کہ پارلیمینٹ کے منظور کردہ بعض قوانین اقتدار اعلیٰ کا اعلیٰ ترین اظہار اور بیّن ثبوت ہوتے ہیں[1] یہاں خیال رکھیے کہ یوں اقتدار کا اظہار اور قانون سازی کا ضابطہ ترجیح پا گئے، نوعیت قانون کا ذکر تک نہیں۔

وہ کون سے قوانین ہیں جن میں یہ غیر معمولی خصوصیات ہوتی ہیں؟ خود ڈائسی کے الفاظ میں یہ وہ قوانین ہیں جو ایسی شادیوں کو جائز قرار دیتے ہیں، جو کسی اور وجہ سے باضابطہ طور پر سرانجام نہیں دی جا سکی تھیں، اور ایسے قوانین جن کا مقصد ایسے لین دین کو قانونی بنانا ہے جو اُس وقت غیر قانونی تھے جب کئے گئے تھے۔ اور وہ سابق العمل قوانین جن کے تحت قانون شکنی کر چکنے والے کو اس جرم سے بری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِن ہی قوانین کے بارے میں ڈائسی نے لکھا ہے' بظاہر یہ قانون سازی' لاقانونیت کو قانون بنا دیتی ہے لیکن اقتدار اعلیٰ کی اعلیٰ ترین قوت کا مظہر ہے[2]

یہ محض ایسی نظریاتی بات ہے جس میں اس نظام قانون کی تشکیل اور نفاذ کو ترجیح دے کر اخلاقی حقائق کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو سابق العمل قوانین کے سلسلے میں ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اسی مکتبۂ فکر کے دوسرے مبلغوں نے سابق العمل قوانین کو قانون سازی

---

[1] ملاحظہ ہو ڈائسی حوالۂ بالا ص ۵۰

[2] ڈائسی حوالۂ بالا ص ۵۰-۴۹

کا ایک عام طریقۂ کار تسلیم کیا ہے اور ان کے نزدیک زمانۂ سابق سے قوانین کے نفاذ کی وجہ سے نظریۂ قانون کے لئے کوئی خاص مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ ایک ہی نظرئیے کے اندر، یہ دو متضاد خیالات یہ ظاہر کرتے ہیں، ان خاص اصحاب میں قانون سازی کے اخلاقی مسائل سے گہری وابستگی کا فقدان ہے۔

پارلیمانی بالادستی کے اصول سے بھی ڈالسی نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس میں بھی یہی خامی ہے، اُس نے جو اہم ترین نتیجہ اخذ کیا ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں:

"پارلیمنٹ کو قانونی طور پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ خود کو توڑ کر اپنا وجود ختم کر دے اور قانونِ انتخابات کو منسوخ کر کے کوئی ایسا راستہ باقی نہ رکھے جس پر چل کر قانونی طور پر کسی دوسری پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کیا جا سکے"[1] یہ بات کچھ ایسی ہی ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ خودکشی کے عمل میں بھی زندگی کی قوت ظاہر ہوتی ہے، یہ حُسنِ بیان وجودیت کے حامیوں کی شاعری ضرور بن سکتی ہے لیکن یہ زندگی اور انسان کے مسائل اور حقائق سے اتنا ہی دُور اور بعید از قیاس ہے جتنا کہ ڈالسی کا یہ نظریہ کہ نظام قانون کی خودکشی قانوناً ممکن ہے۔

پارلیمنٹ کی قانونی مطلق العنانیت پر بحث کرتے وقت عام روایت یہ رہی ہے کہ امور کا بطور مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے جو انتہا پسندانہ اور لغو ہیں، اور ان کی وضاحت اور تشریح کے لئے جو مثالیں دی جاتی ہیں وہ بھی لغو ہوتی ہیں میں اب جو مثال دینے والا ہوں اس میں اس روایت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ آئیے ہم اب ڈالسی کے دو بیانات کو ملا کر پڑھیں وہ کہتا ہے کہ پارلیمنٹ خود کو قانوناً ختم کر سکتی ہے اور برطانوی دستور میں پارلیمنٹ کو قانون بنانے اور منسوخ کرنے کا سو فی صد اختیار حاصل ہے۔ اب فرض کیجئے کہ کسی زمانے میں پارلیمنٹ

---

[1] ملاحظہ ہو ڈالسی حوالۂ بالا صفحہ ۶۸ تا ۷۰

کو مندرجۂ ذیل اقدامات کرنے پڑیں[1]

(۱) کہ پارلیمنٹ کے اُس وقت کے تمام ارکان ہر قسم کے قانون اور ضابطے سے آزاد ہوں گے، اور انھیں لوگوں کو لوٹنے، جان سے مار دینے اور ان کی آبرو ریزی کی کھلی چھٹی حاصل ہوگی۔ اور ان کی حرکتوں پر کسی قسم کی قانونی گرفت نہ ہوگی۔

(۲) ایسے ممبروں کی سرگرمیوں میں جو رکاوٹ ڈالے گا وہ مجرم قرار پائے گا۔ اور اُسے سزائے قید اور سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔

(۳) ہر قسم کے تمام قوانین منسوخ کر دئے گئے ہیں۔

(۴) پارلیمنٹ کو ہمیشہ کے لئے برخاست کر دیا گیا ہے۔

اب ایسے حالات میں اگر کوئی ملزم اپنے وکیل کے پاس جائے گا اور وہ وکیل ڈائسی کے نظریے کے تحت پارلیمانی بالادستی کا اصول مانتا ہو تو کیا وہ وہ اپنے مؤکل سے یہ کہے گا کہ بھائی جہاں تک قانون کا تعلق ہے، پارلیمنٹ کے ممبروں کی تباہ کاریاں اور ظلم و زیادتیاں سب جائز ہیں اور قانون کے تحت انھیں اس کا حق حاصل ہے، اور اگر تم ان ممبروں پر ہاتھ اٹھانا چاہتے ہو تو یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے میں کیا کر سکتا ہوں، کیونکہ میں تو قانون ہی کی بات کر سکتا ہوں۔"

ظاہر ہے کسی نہ کسی مرحلے پر قانون اور لاقانونیت کا امتیاز واضح ہو کر رہے گا، اور میرے خیال میں یہ مرحلہ جلد ہی آجائے گا۔ جب ہم یہ سوال کریں گے کہ کیا قانون سازی بلا بندش اخلاق اتنی آزاد ہو کہ پارلیمانی خودکشی ممکن ہو جائے یا پارلیمنٹ اپنے اختیارات کسی ڈکٹیٹر کو منتقل کر دے، یا پارلیمنٹ یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ آئندہ سے تمام قوانین لوگوں سے پوشیدہ رکھے جائیں گے۔ پہلے دو سوالوں کا جواب ڈائسی کے نظریے کے مطابق دیا

---

[1] ملاحظہ ہو ڈائسی حوالہ بالا ص ۳۹

جا سکتا ہے، کہ ہاں ایسا قانون جائز نہ ہوگا لیکن اس نے تیسرے سوال پر غور نہیں کیا حالانکہ تاریخ اور تجربے کی روشنی میں دیکھا جائے تو تینوں میں سے یہی سوال سب سے زیادہ اہم ہے، اور ظاہر ہے کہ خفیہ قانون' قانون کے مقاصد کے خلاف ہے اور اس مرحلے پر پہنچتے ہی قانون کے داخلی اخلاق کا نظریہ سامنے آجاتا ہے۔

اب میں قانون کے ان نظریات پر تنقیدی بحث ختم کرتا ہوں جو میرے پیش کردہ نظریے کے خلاف ہیں۔ مختصراً عرض کردوں کہ میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ قانون ایک مقصدی عمل ہے اور اسے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں لازماً کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا تب ہی کامیابی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس میں نے جن نظریات کو رد کر دیا ہے، ان میں حقائق کا براہ راست تجزیہ کئے بغیر صرف قانونی ڈھانچے کی تشکیل کا تذکرہ آجاتا ہے۔ چنانچہ جب قانون کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ "امنِ عامّہ کا وجود" ہے تو پرانے نظریوں میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ کس قسم کا امن اور کیسا نظم وضبط مراد ہے اور اس کے قیام کے ذرائع کیا ہوتے ہیں، یا کسی نظریے میں یہ کہا گیا کہ قانون کا امتیازی نشان، طاقت ہے جو مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کی جاتی ہے، یہاں اس بات کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ طاقت کے استعمال یا عدم استعمال سے ان لوگوں کے مسائل جوں کے توں رہتے ہیں، جو قانون بناتے اور اس پر عمل درآمد کراتے ہیں بلکہ طاقت کے استعمال سے مقاصد کا حصول اور زیادہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ آخر میں وہ نظریات ہیں جن میں حکومت کے اقتدار اعلیٰ اور اجرائے احکام پر زور دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ میں نے جس عمل کو قانون کہا ہے اس کی تشکیل اور رہنمائی یہی نظام کرتا ہے لیکن یہ لوگ بھی اس حقیقت

کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ نظام یا اقتدار کا ڈھانچہ جس نے عمل کی رہنمائی کرنے کا دعویٰ کیا ہے، خود بھی اسی عمل کی پیداوار ہوتا ہے، یعنی کسی نہ کسی قانونی عمل کے ذریعہ ہی اقتدار کی شکل بنتی ہے۔

اب مجھے یقین ہے کہ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو عام طور پر میرے استدلال اور نظریات سے اتفاق کریں گے پھر بھی انہیں اُس نظریۂ قانون پر جو میں نے پیش کیا ہے کسی قدر بے اطمینانی باقی رہے گی۔ میری تجویزوں میں جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ ان کے نزدیک بہت جھول دار قرار پائے گا، جس میں بہت زیادہ لچک ہے، جس کا بہت سے نظاموں اور حالات پر آسانی سے اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے قانون کا اتنا لچکدار اور جھولدار نظریہ اچھا نہیں۔ ان کے خیال میں اسے اور زیادہ واضح اور مبسوط ہونا چاہیے۔ مَیں بعد میں اِن اعتراضات پر بحث کروں گا۔ لیکن پہلے میں ایک مثال پیش کروں گا جو میرے پیش کردہ تصور اور نظریئے کی تصدیق کر سکتی ہے۔

سائنس کا تصوّر

میں سائنس کی مثال پیش کروں گا، اور بنیادی طور پر میری مراد طبعی اور حیاتیاتی سائنس ہے۔

سائنس کو ایک خاص نوعیت کی انسانی جدوجہد کہا جا سکتا ہے۔ اِس کے اپنے مسائل ہوتے ہیں جنھیں بعض اوقات حل کرنے میں ناکامی بھی ہوتی ہے۔ فلسفۂ قانون کی طرح فلسفۂ سائنس بھی ہوتا ہے۔ سائنس کے بعض فلاسفر خصوصًا مائیکل پولانی نے سائنس داں کی سرگرمیوں سے تعلق رکھا ہے اور سرگرمی کے مقاصد اور طریقہ کار متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور مقاصد کے حصول کے لئے اداروں کی تشکیل پر توجہ دی ہے۔ دوسرے لوگوں نے نظریات کے تانے بانے

تیار کئے ہیں اور سائنس داں کا دائرۂ عمل متعین کرنا چاہا ہے۔ اِن باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانونی اور سائنسی فلسفوں میں بڑی مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ ہومز نے قانون کا جو دو ٹوک تصور پیش کیا ہے وہ برج مین Bridgman کے اِس تصور اور تعریف سے کچھ دُور نہیں کہ سائنس نظریات کے عملی پہلو پر مشتمل ہے۔ سائنس کو محض تجربہ کہنے کے ایک حامی نے علانیہ یہ کہا ہے کہ میرے فلسفہ میں خود سائنسی ایجاد کے بارے میں کوئی بیان نہیں مل سکتا کیونکہ کسی بھی ایجاد کا منطقی تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ اس کو پڑھ کر انسان کا ذہن فوراً کیلسن (Kelsen) کے نظریے کی طرف جاتا ہے جس نے کہا کہ قانون بنانے اور اس کی تشریح و تاویل کے تمام اہم مسائل درحقیقت عدلیہ کے عمل اور اصولوں پر منحصر ہیں۔ اب یہاں میں سائنسی فلسفہ کی تحریروں کی اور زیادہ مثالیں نہیں دوں گا اس کے بجائے میں قانونی نظریات کی طرز پر سائنس کی تین فرضی تعریفیں پیش کروں گا۔

سائنس کی تعریف کرتے وقت یہ عین ممکن ہے بلکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ اس کے نتائج پر توجہ دی جائے نہ کہ ان سرگرمیوں پر جن سے وہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ جس طرح قانون کو ایک نظریے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صرف امنِ عامّہ کو وجود میں لانے کا نام ہے، اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کا وجود اس وقت ہوتا ہے جب انسان میں فطرت کے مظاہر کے انکشاف اور اُن پر غلبہ پانے کی صلاحیت موجود ہو۔ قانون کی تعریف دوسرے نظریے میں یہ ہے کہ وہ طاقت کے استعمال سے منسوب ہے تو اس سلسلے میں ہم سائنس کی مثال پہلے ہی دے چکے ہیں کہ چونکہ سائنس میں آلات استعمال ہوتے ہیں اس لئے اسے آلات کا علم بھی کہا جاسکتا ہے۔ البتہ قانون کے اقتداری نظام کی کوئی مثال سائنس میں نہیں مل سکتی۔ البتہ مطلق العنان حکومت کے زیر اثر ایسا ہو سکتا ہے کہ سائنسی

اقتدار بھی بالترتیب منتقل ہوتا رہے لیکن ہمیں یاد پڑتا ہے کہ کیاسن نے انسانی اقتدار کی حکمرانی نہیں بلکہ معمولات کی حکمرانی کا ذکر کیا ہے۔ اس نظریئے کی بنیاد پر ہم سائنس کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ قدرتی مظاہر کے متعلق مفروضات کا ایک سلسلہ ہے جو کبھی چند کبھی زیادہ تجربوں سے قائم ہوتا اور کبھی عام تجربے پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کوئی بھی نظریہ غلط ہے۔ صرف یہ بات ہے کہ ان نظریوں کی مدد سے عام آدمی سائنس اور اس کے مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ یہ نظریات ان سائنس دانوں کے لئے بھی کارآمد نہیں جو سائنس کے مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع کی اپنی جگہ خود وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں سائنسی تعلیم میں اصلاح کی ایک تحریک شروع ہوئی ہے۔ اور سائنس کے عام نصاب مرتّب کئے گئے ہیں جو ان لوگوں کے لئے ہیں جو سائنس داں بننے کا خیال نہیں رکھتے۔ پرانے نصاب میں عام طور پر سائنسی کارناموں کا بڑا جامع تذکرہ ہوتا تھا' سائنسی عمل اور طریقوں کا سرسری تجزیہ اور مطالعہ ہوتا تھا اور استنباط اور تجربے کے سائنسی مراحل بیان کئے جاتے تھے۔ نئے نصاب میں طلباء کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ سائنس نئے حقائق تک کیونکر پہنچتا ہے۔ کونینٹ (Conant) نے جو کورس شروع کیا ہے اس میں ایک ایک تجربے کی چھان بین کے ذریعہ یہ علم سکھایا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلباء کو سائنسی ایجاد کے عمل کا ذاتی طور پر تجربہ ہو سکے۔ اور عام طلباء سے امید کی جاتی ہے کہ اس طرح وہ سائنس کے اصولوں اور اس کی حکمت عملی سے بڑی حد تک واقف ہو جائیں گے۔[1]

مائیکل پولانی نے جو نظریات پیش کئے ہیں ان میں سب سے بڑا کارنامہ

---

[1] "سائنس اینڈ کامن سنس" کونانٹ ۱۹۵۱ء

یہ ہے کہ سائنسی ایجادات کی تجرباتی تاریخ معلوم اور قلمبند کی۔ لیکن جہاں تک اِن مضامین کے موضوع کا تعلق ہے اس اعتبار سے اس کا عظیم ترین کام یہ ہے کہ اس نے سائنسی جد وجہد کا تصور پیش کیا ہے۔[۱] وہ چاہتا ہے کہ سائنس کے مقاصد حاصل کرنے اور مسائل حل کرنے کے لئے مناسب اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ذہین افراد آتے رہیں گے اور بڑے بڑے انقلابی نظریات پیش کریں گے لیکن وہ اپنے بزرگوں اور ہمعصروں کی تحقیق، نظریات اور ان کی خامیوں اور غلطیوں ہی کی بنیاد پر اپنی عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔ سائنسی شعبے میں سائنس داں کی آزادی صرف شخصی آزادی نہیں ہے بلکہ سائنسی حقیقت کی تلاش کے لئے مشترکہ اور سلسلہ وار ہونا ناگزیر ہے۔ سائنس داں کی اپنے خاص شعبے اور پیشے کے لحاظ سے امتیازی اخلاقیات ہوتی ہیں اور بنیادی اُصول بالکل قانون کی اخلاقیات کی طرح، اپنے مقاصد کے پیش نظر، یہ طبعی اخلاق ہوتا ہے قانونی اخلاق نہیں۔ ایسا ہونا کیوں ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب میں ایک مثال کے ذریعے دوں گا:-

فرض کیجئے ایک سائنس داں نے کوئی خیر بنائی یا سوچی ہے اور اُسے یہ یقین ہے کہ اس کی یہ ایجاد یا دریافت دوسرے سائنس دانوں کی تحقیقات پر اثر انداز ہوگی اور تحقیقی کاموں کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی۔ ایسی صورت میں اسے اپنی اس ایجاد یا دریافت کی اشاعت کب کرنی چاہیے؟ یہ بات تو طے ہے کہ اگر اس نے واقعی کوئی اہم دریافت کی ہے تو اس کا فرض ہے کہ سائنس داں طبقے کو اس سے آگاہ کرے چاہے اس میں بعض اندیشے ہی کیوں نہ ہوں، مثلاً یہی کہ کوئی حریف سائنس داں جو ایسے ہی کسی منصوبے پر کام کر رہا ہے، اس کی بات کو لے اُڑے گا اور ترقی کر کے

---

[۱] "دی لاجک آف لبرٹی" (۱۹۵۱) اور "پرسنل نالج" (۱۹۵۸) مصنفہ مائیکل پولانی۔

خود اپنی تحقیق کو اس منزل پر لے جائے گا کہ پہلے سائنس داں کی دریافت دھری کی دھری رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ سائنس داں کو واقعی اس کا یقین اور اطمینان ہو کہ اس نے سائنس کی دنیا میں کوئی ایجاد یا دریافت کرلی ہے کیونکہ اگر یہ محض خوش فہمی ہے اور اس نے جلدبازی میں اسے شائع کرادیا تو ظاہر ہے اس سے دوسروں کا وقت ضائع ہوگا اور سائنس دانوں کے تحقیقی کاموں میں اُلجھن اور گمراہی کا امکان رہے گا۔

اسی قسم کے سوالات تھے جن کی بنا پر پولانی (Polanyi) نے ایک قانونی اصطلاح کا سہارا لے کر "سائنس کے امانتی تصوّر" کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور قانون کی اخلاقیات میں بڑی مماثلت ہے، اور اگر اس سے انحراف ہوتا ہے تو دونوں ہی صورتوں میں اُن کی نشان دہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ دونوں ہی شعبوں میں اس بات کا امکان ہے کہ روایتی طور طریق سے وابستگی یا ذاتی مفاد اور پیشہ ورانہ اخلاق کے تقاضے یکساں ہوں اور کوئی اخلاقی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے لیکن دونوں ہی شعبوں کی اخلاقیات میں ایسے مواقع ضرور آتے ہیں، اور ایسے کٹھن مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا حل آسان نہیں ہوتا۔ قانون اور سائنسی اخلاقیات کی حد تک مختلف قوتوں میں قبولیت اور ردِعمل کا عام معیار خاصا مختلف ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی قوم میں معاشرتی اختلاف کے سبب، قانونی اور سائنسی مسائل کا ردِعمل مختلف افراد کی حد تک مختلف ہو۔ سائنس کا معاملہ ایسا ہے کہ ہر کس و ناکس اُسے اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا تاوقتیکہ اُسے سائنس کے مبادیات اور طریقہ کار کا علم نہ ہو۔ اس علم اور شعور کے بغیر عام آدمی بعض مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہے گا، مثلاً یہ کہ سائنس کے بارے میں حکومت کی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ نئے ترقی پذیر ملکوں میں سائنسی

تحقیقات شروع کرنے کا مؤثر ترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے ؟ جب سائنس کی اخلاقیات کی ذمہ داریوں سے روگردانی کی جاتی ہے یا ان کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تو معاشرے کو بڑا ۔ راست یا بالواسطہ طور پر اس کی کیا قیمت عام یا خاص نقصان کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے ۔ میرے خیال میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خود قانون کے معاملے میں بھی اسی قسم کے مسائل اور سوالات سامنے آتے ہیں ۔ بہر حال سائنس سے مماثلت رکھنے والے اس قسم کے قانونی سوالات کے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ فلسفۂ قانون بھی انسانی معاشرے کے تعلق سے جنم لیتا ہے اور محض نظریاتی بحثیں نتیجہ خیز نہیں ہوتیں ۔

میرے قانون کے نظریے پر اعتراضات اور اُن کا جائزہ :۔

میں نے قانون کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ "انسانی عمل کو ضابطوں کا پابند بنانے کی کوشش" ہے ۔ اس تشریح کے خلاف بعض اعتراضات بھی کیئے جا سکتے ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے :

اِس سلسلے میں پہلا اعتراض کچھ اس نوعیت کا ہے کہ جب ہم کسی نظامِ قانون کو ایک "کوشش" قرار دیتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ کوشش کئی درجے کی ہو سکتی ہے یعنی اس کی کامیابی یا تکمیل کا کوئی ایک نقطہ متعین نہیں کیا جا سکتا ، کہیں یہ کوشش زیادہ کامیاب رہے گی اور کہیں کم ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود نظامِ قانون کا وجود بھی درجہ بندی کے تحت آتا ہے اور اگر اس نظریے کو مان لیا جائے تو قانونی استحکام کے بنیادی تصور کی نفی ہو جاتی ہے ، کیونکہ قانون کی حکمرانی (Rule of Law) اور نظامِ قانون

(Legal System) دونوں ہی ایسی چیزیں ہیں جو کئی حصّوں اور درجوں میں تقسیم ہو کر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتیں، یعنی یا تو وہ مکمل اور کامل ہوں گی یا پھر ناپید ہوں گی، ان کا "آدھا وجود" بے معنی ہے۔

اِس اعتراض کے جواب میں میں یہی کہوں گا کہ قانون کی حکمرانی اور نظامِ قانون دونوں ہی "نصف وجود" رکھ سکتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ اور یہ صورت اُس وقت پیش آتی ہے جب ان کے کامل وجود کی کارفرمائی کے لئے ساری جدوجہد "نصف کامیاب" رہتی ہے۔ قانون کی عام زبان میں کامیابی کے درجوں کی تشریح مشکل ہو گی۔ کیونکہ ہم روزمرّہ کی گفتگو میں عادتاً یہ احتیاط رکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ لاقانونیت کی حوصلہ افزائی کرنے والی کوئی بات نہ آنے پائے، مثلاً یہ اچھی بات ہے کہ عام طور پر ہم جج کو جج ہی کہتے اور سمجھتے ہیں، حالانکہ کسی خاص عدالتی عہدے پر فائز افسر کے بارے میں ہم نہایت سچائی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "وہ جج نہیں ہے" بات یہ ہے کہ ہم قانون کے بارے میں بڑی احتیاط سے گفتگو کرتے ہیں جو اس بات کا اعتراف ہے کہ اظہارِ بیان میں ہم ضروری مصلحتوں کی وجہ سے بعض نازک حقائق سے پہلو تہی کر رہے ہیں لیکن جب ہم بنیادی مسائل کا تجزیہ کریں گے اور نظامِ قانون مرتب کرتے وقت یا ان پر عمل کرتے وقت مسائل سے دوچار ہوں گے تو ہمیں اندازِ گفتگو بدلنا ہو گا۔

زندگی کے دوسرے پیچیدہ موضوعات اور معاملات کا تجزیہ کیا جائے تو وہاں بھی کامیابی کے درجے اور مرحلے نظر آئیں گے۔ یعنی یہ بات صرف قانون تک ہی محدود نہیں ہے۔ فرض کیجئے ہم یہ سوال کریں کہ آیا فلاں ملک میں تعلیم کا "وجود" ہے۔ پہلے تو آدمی اس سوال پر الجھن میں پڑ جائے گا کہ تعلیم سے مراد کس قسم کی تعلیم ہے۔ اس کے بعد وہ غالباً کچھ اس قسم کا جواب دے گا ــــ

"کیوں نہیں اُس ملک نے اس شعبے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے"۔ —— یا پھر کہے گا — "ہاں ہے تو لیکن ابھی ابتدائی مراحل میں ہے" —— اگر ہم سائنس، ادب، شطرنج، دایہ گری، فنِ خطابت، اور لاشوں کو محفوظ رکھنے کے فن کے بارے میں اسی قسم کے سوال کریں گے، تو ایسے ہی جوابات ملیں گے. ہو سکتا ہے کہ کامیابی کے معیار اور مقدار کے بارے میں اختلاف رائے پایا جائے، لیکن اس بحث میں کم معیار اور "نصف کامیابی" جیسے الفاظ آئیں تو ممکن ہے کہ وہ حقیقت سے زیادہ ہی قریب ہوں مگر انھیں حسنِ بیان ہی کہنا ہوگا. بہر کیف ہم کسی کامیابی کا صحیح تعین کرنا ہی چاہیں تو وہ نقطۂ صفر اور معراج کامیابی کے درمیان کہیں بھی ہو سکتا ہے یعنی کامیابی کی ابتداء سے اس کی تکمیل تک بڑے درجے اور مرحلے ہوتے ہیں اور جس چیز کو ہم تکمیل کہتے ہیں وہ بھی منتہائے منزل نہیں ہوتی. کیا قانون کا معاملہ اس سے بالکل مختلف سمجھا جائے، فلسفۂ قانون کے جدید نظریئے میں یہ کہا جاتا ہے کہ قانون تو جامد سی چیز ہے، یا تو وہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا —— اسی نظریئے کے تحت قانون داں حضرات نے مثال کے طور پر، "قانون کی اخلاقی بنیاد کے مغائر" یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نازیوں نے اپنے آخری برسوں میں جو نام نہاد قوانین نافذ کئے تھے ان کے مقاصد ضرور بُرے تھے لیکن وہ بہرحال قانون تھے اور ایسے ہی جیسے انگلستان یا سوئٹزرلینڈ کے قوانین تھے. اس تصور کا ایک سنگین نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ شریف جرمن باشندوں پر ان قوانین کی پابندی کی اخلاقی ذمہ داری تھی، اور اس ذمہ داری پر نازی قوانین کی ان اندرونی بداخلاقیوں کا اثر نہیں پڑتا کہ قوانین کے کچھ حصے اُن کے علم میں نہیں تھے، اور ان ہی میں سے بعض قوانین کے تحت قتل عام کا جواز پیدا کیا گیا تھا، ان ہی کی رو سے حکمرانوں کو بے پناہ اختیارات حاصل ہوئے. اس حد

تک کہ وہ جرائم کی تشریح و توضیح جس طرح چاہتے کر لیتے تھے' اور ان قوانین پر عملدر آمد کرنے کے لئے جو فوجی عدالتیں قائم ہوئی تھیں' وہ اپنی مرضی کے مطابق قوانین کی اصل دفعات کو بے تکلف نظر انداز کر دیتی تھیں۔

قانون کے میرے نظریے پر دوسرا اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے تحت' ایک ہی آبادی کے لئے ایک سے زیادہ نظامِ قانون[1] رائج کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک سے زیادہ نظامِ قوانین یقیناً ہوتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ مختلف معاشروں میں ایک سے زیادہ ہی نظامِ قانون رائج رہے ہیں۔ خود امریکہ میں کیا ہے؟ ہر شہری واضح طور پر دو نظامِ قوانین کا پابند ہے۔ ایک تو وفاقی حکومت کا قانون ہے اور دوسرا متعلقہ ریاست کا۔ وفاقی نظامِ قوانین سے قطعِ نظر' خود ریاست ہی میں کئی نظام ہوتے ہیں، مثلاً ایک نظامِ قانون شادی اور طلاق کا ہے' دوسرا تجارتی تعلقات میں باقاعدگی پیدا کرنے کا ہے اور ایک تیسرا نظام قانون بھی ہے جو باقی ماندہ امور سے تعلق رکھتا ہے اور خاص قسم کی علیحدہ علیحدہ عدالتیں ہیں جو ان تینوں نظاموں پر عملدر آمد کراتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ بہت سے قانونی نظام کی موجودگی میں اُصولاً اور عملاً بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ پہلی قسم کی دشواریاں صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہیں جب اُصولی طور پر یہ نظریہ مان لیا جائے کہ قانون کے تصور کے لئے یہ لازم ہے کہ حکومت میں اقتدارِ اعلیٰ ایک ہی ہے اور اُسی کو واضح طور پر قانون ساز

---

[1] اس بحث میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ مسئلہ نظامِ قانون یا قانونی ڈھانچوں اور اداروں کا ہے جو مختلف ہو سکتے ہیں، نہ کہ اصولِ قانون کا جو بہت کم مختلف ہوتے ہیں نہ روحِ قانون کا جسے مصنف اخلاقِ قانون کہتا ہے۔

کے تمام اختیارات حاصل ہیں اور وہ خود قانونی بندشوں کا پابند نہیں۔ کہا جائیگا کہ پھر کئی نظام قانون کے کیا معنی؟ سیاسی زندگی کے حقائق سے اس نظریے کو ہم آہنگ کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اگرچہ قانون کے بظاہر تین نظام ا۔ ب اور س ہیں۔ لیکن دراصل ب اور س کا وجود الف کی قانونی رواداری کے سبب قائم ہے۔ اس بات کو اور آگے بڑھا کر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ ترین قانونی اقتدار کی طرف سے جو رعایت یا اجازت دی جاتی ہے وہ اسی کے احکام کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے جو بظاہر تین نظام معلوم ہوتے ہیں وہ قانون کی نظر میں ایک ہی نظام ہوتا ہے۔

عملی دشواریاں اس وقت رونما ہوتی ہیں جب قانون کے ان نظاموں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کے دائرۂ اختیار کی واضح طور پر نشان دہی نہیں کی جاتی اور غالباً ایسا کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔

وفاقی نظام حکومت میں جب قومی اور ریاستی نظام کے دائرۂ اختیار کے بارے میں کوئی تنازعہ پیدا ہوتا ہے اور تقسیم اختیارات کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تو اس کا ایک حل یہ ہے کہ تحریری آئین کی دفعات کے تحت عدالت عالیہ سے فیصلہ کرایا جائے۔ یہ طریقہ کار نہایت کارآمد ہے لیکن بہرحال ناگزیر نہیں ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مختلف زمانے میں دہرے اور تہرے نظام رائج رہے ہیں اور ان میں کوئی سنگین تصادم پیدا نہیں ہوا اور جب بھی کوئی جھگڑا پیدا ہوا تو عام طور پر باہمی رواداری کے جذبے سے فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ صورت حال انگلستان میں اُس وقت پیدا ہوئی تھی جب عام قوانین کی عدالتوں نے اپنے نظام قانون میں ان بہت سے قاعدوں اور ضابطوں کا انضمام شروع کر دیا جو تجارتی قوانین کی عدالتوں نے وضع کئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا انجام یہ ہوا کہ آخر کار عام عدالتوں

نے تجارتی عدالتوں کی جگہ پوری طرح لے لی۔

تیسرا اعتراض بھی دوسرے اعتراض سے ملتا جلتا ہے لیکن یہ اعتراض، بہت بڑا نظر آتا ہے۔ یعنی اگر قانون کی تعریف یہی ہے کہ یہ انسانی عمل کو اصولوں کا پابند بنانے کی جدوجہد ہے تو یہ جدوجہد صرف دو یا تین محاذوں پر نہیں ہوگی بلکہ ہزاروں پر ہو سکتی ہے۔ اور اس جدوجہد میں وہ سب لوگ مصروف ہوتے ہیں جو کلبوں، کلیساؤں، اسکولوں، مزدور انجمنوں، ٹریڈ ایسوسی ایشنوں، زرعی نمائشوں اور ہزاروں قسم کے دوسرے اجتماعات اور تنظیموں کے داخلی اُمور کے بارے میں ضابطے تیار کرتے ہیں اور ان پر عمل درآمد بھی کراتے ہیں۔ چنانچہ اِس کتاب میں قانون کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے اگر اُس کا پوری طرح اطلاق کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ صرف اسی ایک ملک میں، ہزارہا نظامہائے قانون موجود ہیں۔ اب یہ بات تو بے تکی سی معلوم ہوتی ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا جائے گا وہ بھی بے تکا اور لغو قرار پائے گا۔

اس تنقید کا کوئی عام جواب تلاش کرنے سے پہلے ایک چھوٹے سے نظامِ قانون کی مثال لے کر ہم بات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ فرض کیا ایک کالج ہے جو اپنے طلباء کے عمل و کردار کی رہنمائی کے لئے کچھ ضابطے نافذ کرتا ہے، طلباء یا کوئی علمی کونسل کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ اِن ضابطوں پر عملدرآمد کی نگرانی کرے اور اگر ان کی خلاف ورزی ثابت ہو جائے تو کونسل کو یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ تادیبی کارروائی کرے اور بعض اوقات سخت سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں، مثلاً یہ کہ متعلقہ طالب علم کو کالج سے خارج بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگر لفظ قانون سے کسی ریاست کے اختیار یا طاقت کا تصور پیدا ہو تو ہم کالج کے ضابطوں اور ان کے نفاذ کو بلا دقت ایک نظامِ قانون کہہ سکتے ہیں اس کے علاوہ اگر کسی فلسفی یا ماہرِ عمرانیات کو مملکت یا ریاست کے قانون سے بنیادی طور پر دلچسپی ہو تو وہ اس کالج کے نظام کے ضابطوں، تنظیموں اور پیدا شدہ مسائل کا مطالعہ کر سکتا ہے اور معلوم کر سکتا ہے کہ قانون کا طریقہ کار عام طور پر کیا ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ لفظ قانون، گورنمنٹ اور مملکت کے قانون سے اس قدر منسلک ہو چکا ہے کہ نجی ضابطوں کے نظام کو سنجیدگی کے ساتھ "نظام قانون" کہنا زیادتی ہے اور قانونی زبان پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اگر محض الفاظ کے استعمال اور اصطلاحوں کی مروّجہ عظمت برقرار رکھنی ہے تو پھر کالج کے قواعد اور اُن کے نفاذ کے نظام کو آپ "مشابہ" کی صفت لگا کر قانون کہہ لیجئے مگر حقیقی مشکل محض اصطلاحی نہیں عملی ہے۔ فرض کیجیے کہ اپنے ضابطوں کے تحت کونسل کسی طالب علم کے معاملے کی سماعت کرتی ہے، اور اُسے سنگین خلاف ورزی کا مجرم گردانتے ہوئے اسکول سے نکال دیتی ہے، وہ اِس کارروائی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیتا ہے اور عدالت سے درخواست کرتا ہے کہ اُسے دوبارہ اسکول میں بحال کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ عدالت کو بیشتر معاشروں میں مسلمہ اختیار ہے کہ وہ اس مقدمے کی سماعت کرے۔ قطع نظر اسکے کہ اسکول سرکاری ہے یا نجی[۵] اب عدالت مقدمے کا فیصلہ کیونکر کریگی؟ فرض کیا کہ طالب علم یہ کہتا ہے کہ اس کا اخراج اگرچہ اسکول کے ضابطوں کے مطابق ہے لیکن خود یہ ضابطے غیر منصفانہ ہیں، عدالت اِس بیان پر اپنا فیصلہ دے سکتی ہے۔ اگر ایسا کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو عدالت کے سامنے کچھ اس قسم کا

---

[۵] ملاحظہ ہو "پرائیویٹ گورنمنٹ آن کیمپس" ۷۲۔ ییل لا جرنل صفحہ ۱۳۶۲/۱۴۱۰ (۱۹۶۳)

معاملہ درپیش ہوگا:

آیا اسکول نے اپنے ضابطوں کی تشکیل و تعمیل میں قانون کے داخلی اخلاق کا احترام کیا ہے؟ آیا یہ ضابطے علانیہ نافذ کئے گئے تھے؟ اور کیا طالبعلم کو اِس بارے میں نوٹس دیا گیا تھا، کیا ضابطوں کی زبان اور ان کے معنی بالکل صاف تھے، اور طالب علم کو معلوم تھا کہ خلاف ورزی کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے؟ کیا کونسل کی تجاویز مقررہ ضابطے کے مطابق تھیں؟ کیا اِسے ، طریقۂ کار میں اِس بات کا پکا انتظام تھا کہ واقعات پورے طور پر سامنے آجائیں اور ضابطوں کی بنیاد پر چھان بین ہو؟

عدالت اُس طالب علم کو بحال کرنے کا فیصلہ دے یا اس کی سزا کی توثیق کردے اِس فیصلے کے لئے اُسے جو معیار سامنے رکھنا ہوگا خود کالج کے ضابطوں سے ملے گا۔ اگر قانون کی حیثیت حاصل کرنے کے لئے اِن ضابطوں کے لئے ریاست سے منظوری لینی ضروری تھی تو عدالت کے فیصلے نے اس کمی کو پورا کردیا۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ نجی ضابطے ہی اِس قسم کی نزاعات میں قبل قانون ہیں اور کالج اور عدالت دونوں کو اِن پر کاربند رہنا ضروری ہے تو پھر یہ صورتِ حال اُس سے مختلف نہ ہوگی جس میں اپیل کی سماعت کرنے والی عدالت کسی منصف کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے بیٹھتی ہے۔

آخر پھر ہمیں کالج کے نجی ضابطوں کو قانون کہہ دینے میں کیوں تامّل ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر معانی کا دائرہ اس طرح بڑھایا گیا تو پھر زبان کے مروّجہ استعمالات کی خلاف ورزی ہوگی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان کا استعمال اس طرح کیوں کیا جائے، اِس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مختلف ادارے مقررہ طرح پر کام کرتے رہیں، اگر کسی لڑکے کو ایسے اسکول سے نکال دیا جائے جو کسی مذہبی فرقے کا ہو، یا کسی فوجی اکیڈمی سے کسی طالب علم کو

اِس بنا پر نکال دیا جائے کہ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ فوجی نظم و ضبط پر صحیح جذبے سے کار بند رہ سکے۔ ایسی صورتوں میں تصفیے اور غور کے لئے بڑے نازک مسائل ہوتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ جن ضابطوں اور قاعدوں کے تحت ان کا فیصلہ کیا جاتا ہے انھیں "قانون" جیسے مخصوص لفظ سے تعبیر نہ کیا جائے۔ کیونکہ قانون کے ساتھ طاقت اور حکومت اور اقتدار کے لوازمات مضمر ہوتے ہیں اور دوسرے اداروں میں بالکل دوسری نوعیت کے تقاضے مصالح اور مسائل زیر تصفیہ آجاتے ہیں جن کو بزورِ حجت منوانا ہے نہ کہ بہ قوتِ حکومت۔ اِس احتیاط اور لحاظ کے محرکات قابلِ تعریف کہے جا سکتے ہیں، البتہ میں یہ کہوں گا کہ اصل دشواری اُن فلسفوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو لفظِ قانون کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں، اور اس کے لوازمات کچھ ایسے قرار پا گئے ہیں کہ جہاں اس لفظ کی ضرورت بہت زیادہ ہوتی ہے وہیں اس کا استعمال مناسب نہیں ہوتا۔ مثلاً اسکول والے معاملے میں قانون کی بڑی ضرورت ہے لیکن اسکول کے ضابطوں کو قانون کہنے میں تامل ہے۔ صورتِ حال خاصی اُلجھی ہوئی ہے، ہم اُن ضابطوں کو جن کے تحت کالج سے طلباء کو خارج کیا جا سکتا ہے قانون نہیں کہنا چاہیے۔ دوسری طرف جب معاملہ مقدمہ عدالت تک پہنچتا ہے تو ان ہی ضابطوں کو قانون کی طرح فیصلے کی بنیاد بنایا جاتا ہے، رہی یہ بات کہ اگر یہ ضابطے بہت ہی گڑبڑ اور غیر منصفانہ ہوں تو عدالت انھیں مسترد کر سکتی ہے۔ ایسا تو کانگریس کے منظور کردہ قوانین کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ قانون سازی کی آئینی حدود میں رہ کر نہ بنائے گئے ہوں تو سپریم کورٹ انھیں کالعدم قرار دے سکتی ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ہم کالجوں اور اسکولوں وغیرہ کے ضابطوں کو قانون نہیں کہہ سکتے لیکن کسی نہ کسی اصطلاح کی پناہ گاہ میں تو انھیں رکھنا ہی ہوگا۔ کہا جاتا ہے

کہ یہ ضابطے دراصل اسکول اور طلباء کے باہمی حقوق کے بارے میں ان کے مابین ایک قسم کا معاہدہ ہوتے ہیں لہٰذا ہم اُنھیں پرائیویٹ قانون کی اصطلاح بناکر ادا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اسی مفروضہ معاہدے کی بنیاد پر ان ضابطوں کا قیام اور حقوق کا فیصلہ ہوتا ہے۔[1] بہر حال معاہدے کا یہ تصور مصنوعی تانے بانے سے تیار ہوا ہے اور اس سے بڑی اُلجھن بھی پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس کی دشواریوں اور خامیوں کو ذہن میں رکھیں تو یہ کہنا پڑے گا کہ اسکول سے اخراج کا معاملہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے، اسی قسم کے ہزاروں جھگڑے اور واقعات لیبر یونینوں، کلیساؤں کلبوں اور سینکڑوں دوسرے اداروں میں پیش آتے ہیں۔ ان مختلف قسم کے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے معاہدے کا تصور کئی اعتبار سے ناقص ثابت ہوتا ہے۔ اول یہ کہ اس مفروضہ اُصول کے تحت ایسی دادرسیوں کی طرف اشارہ ملتا ہے جو ان معاملات میں مناسب نہیں۔ دوسرے "معاہدے" کے تصور میں یہ بھی مضمر ہے کہ کوئی انجمن یا ادارہ مناسب سمجھے تو اپنی تنظیم کے ضابطوں میں یہ شرط شامل کر سکتا ہے کہ وہ جب چاہے گا ممبروں کی رُکنیت بلا اظہارِ وجہ یا بلا وجہ بھی ختم کر سکتا ہے۔ سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ اس قسم کے مقدموں میں عدالتیں جو ذمہ داری سنبھالتی ہیں وہ نظریۂ معاہدہ کے خلاف ہیں۔ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ یہ تنظیمی ضابطے، اسکول یا کالج اور طلباء کے مابین ایک معاہدے کی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن جب اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور معاملہ عدالت میں جاتا ہے تو کالج کے حکام ضابطوں کی جس طرح تشریح و تاویل کرتے ہیں تو عدالتیں ان کی رائے من و عن قبول کرنے کا رُجحان کیوں رکھتی ہیں، حالانکہ

---

[1] اس خیال سے کہ اُلجھن بڑھ نہ جائے میں قصداً اُن صورتوں کا ذکر نہیں کرتا جن میں بعض ججوں نے مثلاً کلب کی رکنیت کو "جائداد" اور کلب سے اخراج کو ازالہ حیثیت عرفی قرار دیا ہے۔

جب دونوں فریقوں میں اس سوال پر جھگڑا ہو جائے کہ معاہدے کا مفہوم کیا ہے تو ہم کو چاہیے کہ فریقین کی توجیہہ و تفسیر کو نہیں مانیں بلکہ غیر جانبداری کے ساتھ ہمیں خود فیصلہ کرنا چاہیے۔ اور بہت سی ایسی دشواریاں ہیں جن کا میں نے ذکر نہیں کیا ہے اس لئے مجبوراً ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ معاہدہ یا سمجھوتہ بھی معاہدوں کے عام نظریے کے مطابق نہیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاص قسم کا معاہدہ ہے جس میں فریقین عام معاہدوں کی بہت سی شرطوں اور دفعات میں ردّ و بدل کرنا مناسب جانتے ہیں اور خود اپنے ضابطے بنا لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر معاہدہ کھوکھلا ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی فیصلہ یا نتیجہ اخذ کیا گیا تو در اصل وہ حالات کے تقاضوں کے مطابق ہوگا گو اُسے اس کھوکھلے معاہدے پر مبنی کہا جا رہا ہے۔

معاہدے کے نظریے پر اعتراض یہ ہے کہ ہر قانونی استدلال کی طرح اس میں اصل مسائل سے چشم پوشی کی گئی ہے اور ان کا سامنا کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ضابطوں کے جس نظام پر ہم بحث کر رہے ہیں وہ بھی لازماً آئینی قانون[لے] ہی کی ایک شاخ ہے جو دستور ملک کی حدود کے باہر مگر نوعیت میں اُسی کے مماثل فروغ پاتی رہی ہے۔ یہ آئینی قانون اِس مفہوم میں ہے کہ اس میں ہمارے معاشرے کے مختلف اداروں کے درمیان قانونی اختیارات کی تقسیم و تخصیص کی گئی ہے، یعنی ضابطوں کی تشکیل و تعمیل کرانے کے با اختیار ادارے گو کم اختیار والے اور بھی ہیں اور وہ ایسے فیصلے کرنے کے مجاز ہیں جو متعلقہ افراد کے لئے قابلِ قبول ہوں اور وہ اُن کی پابندی کریں۔ اس طرح کی آئینی

[لے] اِس بحث میں مترجم نے عام طور پر نجی ضابطوں اور قاعدوں کے نظام کو آئین اور ملک کے بنیادی تشکیلی قانون کو دستور یا دستور ملک لکھا ہے۔

قانون نے ہمارے تحریری دستور ملک کے باہر ضرور نشوونما پائی ہے لیکن اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ جس وقت ہمارے دستور ملک کے مسودے تحریر کئے گئے تھے اس وقت مسودہ نگاروں کو اس کا سان و گمان بھی نہ رہا ہوگا کہ بعد میں معاشرے میں اتنے بے شمار ادارے ہیں اور تنظیمیں وجود میں آجائیں گی۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں ذہنی فضا کچھ اس قسم کی تھی کہ لوگوں کی رضاکارانہ طور پر قائم کردہ تنظیموں اور با اقتدار انجمنوں اور اداروں کے وجود کا تصور ہی نہ تھا۔ نہ ان کے ضابطوں اور قاعدوں کو کوئی حیثیت دی جا سکتی تھی۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھکر کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے کہ ہمارے پاس غیر تحریری آئینی قواعد بھی موجود ہیں۔ اگر ہمیں کچھ اُلجھن محسوس ہو تو وہ ویسی ہی ہے جیسی برطانیہ والوں کو ہو سکتی ہے جن کا آئین غیر تحریری ہے۔ لیکن ۱۹۳۱ء کے ویسٹ منسٹر کے قانون کے بعد سے انھیں جزواً تحریری دستور کی ایک ابتدائی شکل مل ہی گئی ہے۔ غرض دونوں ملک تحریری اور غیر تحریری آئین کے ساتھ بلا تکلف زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگر قانون اسی نظام کو کہیں جسے نافذ کرنے والی صرف حکومت ہو اور قانون کو ایسا ہر نظام نہ سمجھا جائے جو انسانی عمل کے لئے مدوّن کیا جائے تو ہمیں الفاظ کے اکثر ایسے مفاہیم لینے پڑتے ہیں جو زبان کے مطابق مگر حقیقتِ حال سے بعید ہوں گے کیونکہ نجی قواعد بھی عمل کو پابند کرتے ہیں۔ اس کا ازالہ کرنے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ اس لازمی مشابہت کا لحاظ رکھیں، جو دونوں نظاموں میں ہے۔ مثلاً یہ دیکھکر حیرت نہ ہونی چاہیے کہ لیبر یونین یا یونیورسٹی کے لئے جو نظام ضوابط رائج اور نافذ ہوتا ہے وہ بعض اوقات انسان کی زندگی پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے بہ نسبت عدالت کے فیصلوں کے۔ اس طرح ہمیں یہ سمجھنے میں بھی مدد ملے گی

کہ قانون کے نظام خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے، ان میں ایک ہی سی خامیاں اور عدم استقلال ہوا کرتا ہے۔ انصاف رسانی کی سعی کتنی ہی درجۂ کمال پر کیوں نہ پہنچ جائے وہ انسانی استعداد سے بڑھکر نہیں ہوسکتی کیونکہ انسان ہی ہر تجویز کا خالق اور ہر قانون کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اداروں کو اپنے قاعدے اور ضابطے نافذ کرنے کا اختیار ضرور ہونا چاہیئے اور ہوتا ہی ہے، لیکن جب کہیں زیادتی اور ناانصافی ہو تو عدالت معاملے کی سماعت اور فیصلے کر کے اپنا صحیح منصب انجام دیتی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے اور اداروں کو ضابطوں کے مطابق انصاف کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا رہے تو اس طرح عدالتیں اپنی کارگزاری سے اس قسم کی انجمنوں اور اداروں میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے میں مدد دے سکتی ہیں جن میں عدالتی مداخلت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے[1]

میرے نظریۂ قانون پر جو چوتھا اعتراض کیا جا سکتا ہے اب میں اس کا ذکر کروں گا اور یہ میرے حساب سے آخری اعتراض ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ اس نظریے میں قانون اور اخلاقیات میں کوئی واضح امتیاز قائم نہیں کیا گیا، اخلاقیات کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ بعض ضابطوں اور قدروں کے ذریعے انسانی عمل اور کردار کو قاعدے میں رکھتی ہے۔ اس میں یہی بات مانی گئی ہے کہ قاعدے واضح ہوں، ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوں اور لوگ انھیں سمجھ سکتے ہوں تاکہ انھیں اختیار کر کے عمل کر سکیں۔ اس بنیاد پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قانون اور اخلاق دونوں کی خصوصیات اور لوازمات ایک جیسے بیان کئے گئے ہیں، اس لئے دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

---

[1] اِس موضوع پر ملاحظہ ہو ۷۶۔ ہارورڈ لا ریویو صـــ ۱۱۰۰/۹۸۳ (۱۹۶۳ء) اور ۴۳۔ ہارورڈ لا ریویو صـــ ۹۹۳ (۱۹۳۰ء)

میرا خیال ہے کہ اس اعتراض میں کئی اہم باتوں کو مخلوط کر دیا گیا ہے، ایک بات یہ ہے کہ اگر ہم یہ سوال کریں کہ ہم ضابطوں کے کسی نظام پر غور کرتے وقت یہ فیصلہ کیسے کریں گے کہ اس نظام کو کلی یا جزوی طور پر نظام قانون کہا جائے یا نظام اخلاق - اس کا جواب ایک ہی لفظ میں پوشیدہ ہے اور وہ ہے کوشش یا جد و جہد --- میں قانون کی تشریح کرتے وقت یہ بتا چکا ہوں کہ یہ ایک بامقصد انسانی عمل ہے اور انسانی عمل کو ضابطوں کے تحت لانے کی جد و جہد ہے۔

فرض کیجئے ایک چھوٹی سی جماعت کو کسی جزیرے میں چھوڑ دیا جائے اور وہ وہاں آباد ہو جائے، جہاں وہ اپنے عمل اور طرز عمل کے بعض مشترکہ معیار کے سہارے آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرتی رہے، اور یہ معیار، عام تجربے اور تعلیم کی مدد سے خود بخود مقرر ہو گیا ہو۔ اگر اس معاشرے میں لوگ ایک کمیٹی بنا دیں اور وہ اخلاق و عمل کے مسلّمہ معیار کے بارے میں ایک مستند اعلان تیار کرے تو یہ اس آبادی اور معاشرے کا پہلا قانونی تجربہ کہلائے گا۔ گویا یہ کمیٹی قانون سازی کی بامقصد جد و جہد کا آغاز کرے گی۔ کیونکہ سابقہ معیاروں میں جو تضاد ہو گا، اور جو غیر معروف اور نادیدہ عناصر ہوں گے۔ وہ منظر عام پر لائے جائیں گے اور تضاد دُور کیا جائے گا۔ یہ خیال بھی آئے گا کہ بعض افراد نے الفاظ کے جو مفہوم سمجھ رکھے ہیں، ان میں تبدیلی کئے بغیر قانون سازی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ کمیٹی یہ بھی کر سکتی ہے کہ ان افراد کی غلط فہمی کی رعایت کر کے اعلان میں بیان کردہ معیار کا اطلاق اور نفاذ زمانہ سابق سے ضروری نہ قرار دے جب اس معاشرے میں نظام قانون کے دوسرے لوازمات مثلاً جج اور مجلس قانون ساز وغیرہ شامل ہو جائیں گے تو وہ قانون کی جد و جہد میں اور زیادہ مصروف و

مشغول ہو جائے گی۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ قاعدوں اور ضابطوں کا کوئی مستند اعلان کرنے کے بجائے معاشرے کے لوگ کسی ایک آدمی کا تقرر کردیں اور سارے فیصلے اسی پر چھوڑ دیں۔ بہر حال معاشرے کے لوگ خواہ کوئی طریقہ اختیار کریں مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ وہی عمل کریں گے جس کو میں نے قانون کی بامقصد کوشش یا جد و جہد کا نام دیا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ قانون اور اخلاق کے بعض تقاضے مشترک ہیں۔ مثلاً یہ کہ دونوں کے قاعدے اور ضابطے بالکل واضح ہونے چاہئیں۔ لیکن جب یہ تقاضے ایک واضح ذمہ داری اور پابندی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو نظامِ قانون کی تخلیق و تشکیل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اخلاقیات میں اصول کی عمومیت ایک مسلمہ خصوصیت سمجھی جاتی ہے اور یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن یہ ایک مسئلہ بلکہ ٹراسنگین مسئلہ اُس وقت بن جاتا ہے جب ایک جج کسی آدمی کو سزائے قید دیتا ہے لیکن اپنے فیصلے کے جواز اور تعبیر کے لئے کسی عمومی اُصول کی تشکیل و اظہار سے قاصر رہتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اِن مشاہدات سے اُس خاص نقطے کا تعین نہیں ہوتا جہاں پہنچتے ہی یہ اعلان کیا جا سکے کہ نظامِ قانون وجود میں آگیا۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ حقیقت جس رنگ اور جس ڈھنگ سے نظر آتی ہو اُسے حقیقت تسلیم کرنے میں تامّل نہیں ہونا چاہیے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہمیں ہر چیز پوری اصطلاحات کے ساتھ ہی ملے، مثلاً یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ہم قانون کا وجود صرف اسی صورت میں تسلیم کریں گے جب عدالتوں کا وجود ہو۔

اصولِ قانون سازی کی کتابوں میں قانون اور اخلاق کے فرق پر بڑی بحث ہوتی رہی ہے، لیکن عملاً یہ کوئی بہت اہم سوال نہیں ہے۔ اصل اور مشکل مسئلہ یہ ہے کہ مسلّمہ نظامِ قانون اور اخلاق کے عام معیار کے درمیان رشتہ د

رابطہ کی صحیح طور پر تعریف اور وضاحت کس طرح کی جائے۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے پر بحث کرتے وقت یہ تو نہ کہا جائے گا کہ میں نے قانون کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں اہم مسائل سے کسی طرح بھی پرہیز کیا گیا ہے، یا انہیں توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔

اس کے برعکس میرا خیال یہ بھی ہے کہ میں نے قانون کے خارجی اور داخلی اخلاقیات میں جو امتیاز قائم کیا ہے اس سے بات اور واضح ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر ان مسائل کو لیں جو کسی جج کو قانون کی تشریح و تفسیر کرتے وقت پیش آتے ہیں۔ جہاں تک قانون کے خارجی مقاصد کا تعلق ہے جج کے منصب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مقدمے اور قانون کے اخلاقی معاملوں کے بارے میں حتی المقدور کامل غیر جانبداری سے کام لے۔ مثلاً دیق، ضبطِ تولید، قماربازی، یا سرکاری استعمال کے لئے نجی املاک کے حصول جیسے معاملوں میں، وہ خود کوئی اپنا پسندیدہ معیار اختیار نہ کرے، بلکہ غیر جانبدار رہے۔ جس طرح قانون کے خارجی مقاصد کے بارے میں جج کو غیر جانبدار رہنا لازم ہے اسی طرح اُسے قانون کے داخلی اخلاقی تقاضوں کی بیہم اور دانستہ پابندی بھی ضروری ہے۔ مثلاً اُس کے منصب کا تقاضا ہے کہ کسی بھی قانون کی تشریح اس طرح کی جائے کہ ہر عام شہری کے امکان میں ہو کہ وہ قانون زیر بحث کی تعمیل کر سکے نہ کہ تعبیر قانون بھی اس طرح کی جائے کہ قانون کی دفعات پر عمل کرنا اس کے بس کی بات ہی نہ رہے۔ یہ قانون کے داخلی اخلاق کا تقاضا ہے اور اس بارے میں فاضل جج غیر جانبدار نہیں رہ سکتا، اُسے ایک ہی تشریح کو درست کہنا ہوگا۔

قانون کی خارجی اور داخلی اخلاقیات کے درمیان امتیاز فی الواقع تجزیے کا ایک معاملہ اور ذریعہ ہے، اور اُسے فیصلہ صادر کرنے کا بدل تصور نہیں کرنا چاہیئے۔

میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دونوں اخلاقیات کے دائرۂ کار میں بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں بیک وقت دونوں کے تقاضے یکساں ہوتے ہیں۔ بہرحال دونوں طرح کی یہ اخلاقیات کئی طریقوں سے ایک دوسرے کا عمل اور ردعمل ہوتی ہیں۔ میں ان طریقوں کا آخری باب میں تجزیہ کروں گا۔ فی الحال یہی کہنا کافی ہے کہ جب قانون کی دو متوازی تعبیریں کی جا سکتی ہوں تو جج کو ایسی راہ اختیار کرنی چاہیے جو حق و باطل کے مروجہ اور مسلمہ اصول کے مطابق ہو۔ حالانکہ اس نتیجے کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ قانون سازی کا اصل مقصد کیا رہا ہوگا۔ لیکن اس بنیاد پر بھی اس کا جواز ہو سکتا ہے کہ اس طرح بے گناہ لوگوں کو زد میں لانے کا امکان بہت کم رہتا ہے اور اس طرح قانون کے داخلی اخلاق کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

"اخلاقِ عامہ کی قانونی تشکیل" بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر مسلسل بحث ہوتی رہی ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے اس سوال پر بڑی گرما گرم بحث ہوتی رہی کہ "جنسی جرائم" خصوصاً امرد پرستی اور ہم جنسی کی علت کا قانون کے ذریعہ انسداد ہونا یا نہ ہونا چاہیے۔ اس بارے میں دونوں ہی قسم کے دلائل بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں اور دلائل کی بنیاد ابتدائی مفروضات پر رہی اور دلائل میں ان کی وضاحت نہیں کی جا سکی۔

بہرحال میں بڑی آسانی سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اگر بالغ افراد باہمی رضامندی سے پرائیوٹ طور پر ہم جنسی کا ارتکاب کریں تو قانون کی نظر میں اُسے جرم نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کسی قانون کا نفاذ ممکن نہیں اور اگر محض قانون کی کتابوں میں اسے باقی رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بیشتر ناکردہ گناہ اشخاص کو دھونس دے کر رقم لینے کی ایک اور صورت باقی رکھی گئی ہے۔ اِس طرح قانون کے اصول اور اس کے عملی نفاذ میں فرق اور عدم مطابقت رہے گی۔ میری رائے یہ ہے کہ بہت سے

دوسرے متعلقہ مسائل بھی اسی انداز سے طے کئے جا سکتے ہیں، اور اس کے لئے متعلقہ اخلاقی مسائل پر پہلے ہی متفق ہونا ضروری بھی نہیں ہے۔[۱]

---

[۱] یہ فاضل مصنف کی ذاتی رائے ہے اور ایک لادینی ذہن کی غمازی کرتی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں بعض بنیادی اخلاقی قدروں کا احترام بہرحال لازم ہے اور ہماری قدریں، حق و باطل کے معاملے میں واضح اور اٹل ہیں۔ ہمارا جو غلط فعل بلکہ خیال تک پولیس، قانون اور عدالت کی نظر سے اوجھل رہتا ہے، وہ خدا کی نظر میں بہرحال ظاہر رہتا ہے۔ کوئی فعل، جو قانون کی گرفت میں نہ آسکے، جائز اور حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قانون کے داخلی اخلاق کی طرح خود اخلاق کا بھی ایک داخلی پہلو ہوتا ہے جو نظر نہ آنے کے باوجود، اپنی جگہ درست یا غلط ہوتا ہے اور قانون میں بھی اصولی طور پر اس کا اعلان و اظہار ہونا لازم ہے۔ انگریزی ادب جو لادینی ہے اور اس موضوع سے بطور خاص متعلق ہے حسب ذیل کتابوں میں ملے گا:۔

بی۔اے۔ڈیولن "دی انفورسمنٹ آف مارل لا" (۱۹۵۹)۔ "لا اینڈ مارلس" (۱۹۶۱)

ایچ۔ایل اے ہارٹ "لا، لبرٹی اینڈ مورلیٹی" (۱۹۶۳)

ہارٹ کا نظریۂ قانون

اب تک میں نے اس اہم کتاب کا تذکرہ نہیں کیا ہے جس سے میں نے مذکورۂ بالا عنوان مستعار لیا ہے۔ یہ کتاب جو ایچ۔ ایل۔ اے۔ ہارٹ کی تصنیف ہے[۱]، بلاشبہ اصول قانون سازی کے موضوع پر ایک گراں قدر کتاب ہے، اور ایک طویل عرصے کے بعد ایسی اچھی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ محض چند مضامین کا مجموعہ نہیں جسے کتاب بنا کر پیش کر دیا گیا ہو۔ نہ یہ مروجہ مفہوم میں کوئی درسی کتاب ہی کہی جا سکتی ہے بلکہ اس میں مصنف نے محدود پیمانے پر اپنی بحث و تمحیص کے دوران اصول سازی کے بڑے بڑے مسائل کا حل تلاش کیا ہے۔

اِس کتاب میں بے شمار خوبیاں ہیں، نہایت دلکش انداز میں لکھی ہوئی ہے معلومات سے پُر ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ البتہ اس میں قانون کے تصور کا جو بنیادی تجزیہ پیش کیا گیا ہے اُس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔

ہارٹ نے قانون کے داخلی اخلاق کے بارے میں جو اندازِ فکر اختیار کیا ہے میں اُس پر ایک تنقیدی تبصرہ اس کتاب کے آخری باب میں کروں گا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہارٹ کا سارا تجزیہ اِس انداز سے آگے بڑھتا ہے کہ میں نے دوسرے باب میں جن مسائل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے انھیں بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے[۲]۔

فی الحال میرا اختلاف "تسلیم کرنے کے اُصول" (Rule of recoqnition) سے ہے۔ اِس تصور یا نظریے کو ہارٹ کی کتاب میں بنیادی موضوع

---

[۱] "دی کنسیپٹ آف لا" ایچ۔ ایل۔ اے ہارٹ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ء ص ۲۔ باب دوم

[۲] باب دوم، "اخلاق جو قانون کی بنیاد ہے"۔

بتایا گیا ہے اور یہی اس کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے ہارٹ کہتا ہے کہ فرائض سے متعلقہ قاعدوں، اور قانونی اختیارات سے متعلق قاعدوں میں فرق کرنا چاہیے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ اس فرق کو سبھی جانتے ہیں خصوصاً اس ملک میں جہاں ہوہفلڈ (Hohfeld) نے اسی کو اپنے تجزیے کی بنیاد بنایا ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ مندرجۂ ذیل دونوں قسم کے احکامات میں بڑا فرق ہے :-

(۱) تم کسی کو ہلاک نہیں کرو گے۔

(۲) اگر تم جائز وصیت نامہ چھوڑنا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ وہ تحریری ہو، اور تین گواہوں کے سامنے اس پر دستخط کئے جائیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ امتیاز بعض صورتوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کا غلط اطلاق اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ انتہائی آسان مسائل بھی اس طرح اُلجھ کر رہ جائیں کہ ان کے حل کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ ہوہفلڈ کے تجزیے کی بنیاد پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بعض میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

آئیے ہم مثالوں کے ذریعے اس امتیاز کے ابہام اور ذو معنویت کا ذرا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اس قاعدے کی قسم مقرر کرنے کی دقتوں کو لیتے ہیں جس کی عبارت یوں ہو کہ "جب کوئی متولی، ٹرسٹ کی املاک سے قابل وصول کوئی رقم اپنی جیب سے ادا کر دے تو اسے یہ حق حاصل رہتا ہے کہ وہ اپنے قبضے میں رہنے والے ٹرسٹ کے فنڈ میں سے اپنی رقم وصول کر سکتا ہے"۔ لفظ 'حق' اس بات کا بھی اظہار ہے کہ صاحب جائداد پر اتنا ہی فرض بھی عائد ہوتا ہے لیکن متولی کو اِس

---

[1] ملاحظہ ہو "ییل لا جرنل (۱۹۱۹) ص ۱۶۳/۱۶۷ اور "فنڈامنٹل لیگل کنسپیشن" (۱۹۲۳) ہوہفلڈ۔

فرض کا نفاذ کرانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی مدد آپ کے اُصول کے تحت، وہ ٹرسٹ کے فنڈ میں سے اپنی مطلوبہ رقم اپنے حساب میں منتقل کرلے گا۔ چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہاں ہم جس ضابطے کا ذکر کر رہے ہیں وہ اختیار کی منتقلی کا ضابطہ ہے نہ کہ فرائض عائد کرنے کا۔ لیکن فرض کیجیے جس دستاویز کے تحت ٹرسٹ بنایا گیا ہے اس میں صاحب جائداد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ عمر کو پہنچنے پر ٹرسٹ کی املاک خود اپنے نام براہ راست منتقل کرا سکتا ہے، اب مزید فرض کیجیے کہ صاحب جائداد اپنے اختیارات استعمال کرلیتا ہے قبل اس کے کہ متولی کو ٹرسٹ کے فنڈ سے اپنی رقم منتقل کرنے کا موقع مل سکے۔ اب ایسی صورت میں جائداد والے کا یہ قانونی فرض ہے کہ وہ متولی کو اس کی رقم ادا کردے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں بنیادی اُصول وہی ہے یعنی یہ کہ متولی کو صاحب جائداد کی املاک میں سے اپنی رقم وصول کرلینے کا حق ہے خواہ اسے یہ حق خود استعمال کرنے کا اختیار حاصل ہو یا صاحب جائداد سے وصول کرنے کا حق ہو، یہ دونوں باتیں نتیجے کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

میری دوسری مثال کا تعلق ایک عام اصول سے ہے جس کی بنیاد پر عدالتیں ہرجانے کی مقدار میں کمی کردیتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ الف اور ب ایک معاہدہ کرتے ہیں کہ الف، ب کے لئے ایک خاص ڈیزائن کی مشین تیار کرے گا، اور جب کام کی تکمیل ہوجائے گی تو ب اُسے دس ہزار پونڈ ادا کرے گا۔ چنانچہ الف نے مشین بنانے کا کام شروع کردیا لیکن ب نے اپنے معاہدے کی تنسیخ کردی۔ اب بات صرف اتنی ہے کہ ب کو ہرجانے کا ذمہ دار قرار دیا جائے، اور اس سے کہا جائے کہ معاہدے کی تنسیخ تک الف نے جو مصارف کئے ہیں اور پورے کام کی تکمیل پر اُسے جو فائدہ حاصل ہوتا وہ سب اُسے ادا کیا جائے۔

اس معاملے کا اہم نکتہ یہ ہے کہ آیا الف، ب کے تنسیخ معاہدہ کو نظر انداز کر سکتا ہے اور مشین تیار کرنے کا کام جاری رکھ سکتا ہے اور کام پورا ہونے پر پوری قیمت وصول کر سکتا ہے۔ قانون یہ کہتا ہے کہ جس دن ب نے معاہدہ منسوخ کر دیا، اس کے بعد سے جو بھی اخراجات اور مصارف ہوں گے انھیں ب سے وصول نہیں کیا جا سکتا، خواہ الف مشین پر کام جاری رکھے یا بند کر دے۔ وہ صرف اتنی ہی رقم وصول کر سکتا ہے جتنی کا اس وقت حق دار تھا جب معاہدہ منسوخ ہونے کا اعلان کیا گیا تھا۔ عدالتوں میں عام طور پر ایسے معاملوں میں قانونی نکتہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ معاہدے کے تنسیخ ہو جانے پر الف کا یہ فرض ہے کہ وہ ہرجانے کو کم کرنے کے لئے مشین پر کام روک دے، اگر اس نے عین اسی وقت یہ عمل نہیں کیا تو گویا اپنے فرض میں کوتاہی کی، اور اس کی خلاف ورزی کی، چنانچہ فرض کی خلاف ورزی کر کے وہ ہرجانے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اس نظریے پر شدید تنقید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس میں فرائض عائد کرنے والے قاعدے، اور قانونی اختیار دینے یا لینے والے قاعدے میں تمیز نہیں کی گئی ہے۔ اگر ب کی طرف سے معاہدے کی تنسیخ کے بعد بھی الف اپنی حماقت سے کام جاری رکھتا ہے تو ب کو بہر حال یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی "فرض" کے نفاذ کے لئے الف کے خلاف قدم اٹھائے۔ الف پر جو نام نہاد فرض ہرجہ کم کرنے کا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ اگر الف کام جاری رکھے تو وہ فسخ معاہدہ کے بعد کی لاگت اور اخراجات ب سے وصول نہیں کر سکتا۔ تنسیخ سے پہلے الف کو یہ حق قانونی طور پر حاصل تھا کہ وہ ایک ایک دن کام جاری رکھ کر اپنے حقوق اور ب کی ذمہ داریاں بڑھا رہا ہے، اب وہ اس حق سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال اس سے ملتی جلتی ہے جیسی دھوکہ دہی

اور جعل سازی کے قانون (اسٹیچوٹ آف فراڈس) کے نفاذ سے پیدا ہو گئی ہے۔ اِس قانون سے پہلے لوگوں کو زبانی معاہدے کرنے کا اختیار تھا، لیکن جب قانون نافذ ہو گیا تو بعض خاص قسم کے معاہدوں کے بارے میں یہ اختیار چھن گیا اور وہ معاہدے تحریری ہونے لگے۔ ہوہفلڈ کے تجزیے کی بنیاد پر کچھ اسی قسم کا استدلال کیا جاتا ہے[۱]۔

یہ دلیل خاصی وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں مشین والے اور اِسی قسم کے دوسرے مقدمات میں عدالتوں کا استدلال یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ الف کو کام بند کر دینا چاہیے، کیونکہ کام جاری رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اور معاشرے کے وسائل ایک ایسی چیز پر ضائع کر رہا ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ عدالتیں جب یہ کہتی ہیں کہ الف کا فرض ہے کہ وہ نقصانات کم کرے اور ہرجانے کو حد سے نہ بڑھائے تو ان کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ بے ضرورت چیز پر وسائل کیوں ضائع کئے جائیں۔ ب کو یہ موقع نہیں ہے کہ وہ الف کے کام روکنے کے فرض کی خلاف ورزی پر مقدمہ دائر کرے، اُسے اِس کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ تنسیخ کے بعد جو کام کیا گیا ہے اس کا اسے معاوضہ دینا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اگر الف مسلسل کام جاری رکھے تو ب کے گھر سے کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جعل سازی کے قانون میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا یہ نہیں کہا گیا ہے کہ سارے معاہدے تحریری ہوں۔ اِس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ اگر بعض قسم کے معاہدے زبانی ہی کر لئے گئے ہوں تو قانونی طور پر اِن کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ اس قانون کی دفعات سے جو پارٹیاں واقف ہوں گی، ان کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ تحریری معاہدے سے گریز کریں اور ذمہ داریوں کو صرف شریفانہ مفاہمت تک رکھنا

---

[۱] ملاحظہ ہو ۵۔ کاربن۔ "فراڈس" دفعہ ۱۰۳۹ صفحہ ۲۰۵ (۱۹۵۱)

پسند کریں۔

مشین اور قانون کے جو دو معاملات مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں ان میں "معاہدے کی بے اثری" کے اصول کا عملی اطلاق ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک میں الف سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ وہی کرے جو اسے کرنا چاہیئے اور اپنے ہرجے میں تخفیف کردے، دوسرے میں کہا گیا ہے کہ مسلمہ معاہدوں کی تکمیل اور پختگی کا یقین دلایا جائے، تاکہ دھوکہ دہی اور یادداشت کی غلطیوں کا سدِ باب کیا جاسکے۔

فرائض کے ضابطوں اور اختیارات کے قاعدوں میں قانوناً امتیاز کی وجہ سے جو بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، یہاں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب دلائل کسی مثال اور نظیر کے حوالے سے دبے جا رہے ہوں۔ بہرحال جو سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے اُس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اِس امتیاز کو روا رکھنے کی ضرورت ہے اور ہر دو قسم کے احکام کے الگ الگ معیار ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کا مقصد یہ ہے کہ قانون سازی کے بنیادی مقصد کا سراغ لگایا جائے (یعنی عملاً شخصی اور معاشرے کے ہرجے کو روکا جائے) اور دوسرے میں اس قانونی مشینری سے بحث کی جاتی ہے جس کے ذریعے سے (اہم معاہدوں کو تحریر میں لاکر) مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو ان دو مختلف معیاروں کو سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے وہ ہوہفلڈ کے تجزیے کو عملی شکل میں ثابت کرتے وقت بہت اُلجھ گئے ہیں۔

اس کے برعکس اگر ہمیشہ کوشش یہ رہے کہ قانونی مظاہر کے پس پشت اصل مقصد اور منشا کا سراغ لگایا جائے تو اس امتیاز کی اہمیت باقی نہیں رہتی اور پھر ہوہفلڈ کے تجزیے کا بھرم کھل جاتا ہے۔ ہوہفلڈ کا قانونی تجزیہ بڑے

جوش اور شدومد کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور اس کی بڑی دھوم تھی لیکن میرا تجربہ مایوس کن رہا ہے ۰ اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہارٹ نے جو امتیاز قائم کیا ہے اس کی مدد سے ماہرین قانون اور سیاسی مفکرین کی اُلجھنوں کا کس طرح مؤثر طور پر ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو "کنسپٹ آف لا" ص ۹۵)

جب ہم ہارٹ کے "تسلیم کرنے کے قاعدے"

پر آتے ہیں تو ہمارے یہ شبہات یقین میں بدل جاتے ہیں۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس کا کیا مفہوم لیا ہے۔ میں اس کے لئے ایک مثال کا سہارا لوں گا تاکہ بات واضح ہو جائے فرض کیجئے ایک چھوٹے سے ملک میں ایک بادشاہ سلامت کی حکمرانی ہے۔ ملک کے اندر اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ اعلیٰ ترین قانونی اختیارات بادشاہ سلامت ہی کو حاصل ہیں۔ مزید وضاحت کے لئے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہاں کے ہر بالغ شہری نے ایک اعلان پر برضا و رغبت دستخط کئے ہیں۔ اس اعلان کی عبارت یہ ہے:۔

"میں اس بات کا اقرار و اعلان کرتا ہوں کہ "میرے ملک میں بادشاہ سلامت ہی تمام قوانین کا سرچشمہ ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس بادشاہت میں ایک مسلّمہ قاعدہ ہے جس کے مطابق

بادشاہ سلامت کو آخری طور پر یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کس چیز کو قانون سمجھا جائے۔ ہارٹ صاحب اسی چیز کو تسلیم کرنے کا اصول قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسا کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہارٹ کا قدم اور آگے بڑھتا ہے اور وہ اصرار کرتا ہے کہ اس اصول میں ایک حدِ امتیاز بھی قائم کی جائے اور وہ دو قسم کے قاعدوں کی نشان دہی کرتا ہے ایک وہ جو فرائض عائد کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اختیارات تفویض کرتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ تسلیم کرنے کا یہ قاعدہ اختیارات دینے کا قاعدہ ہے، یہ بات بھی قریب تحصیل حاصل ہی ہے۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہارٹ اس جائزہ اور تجزیے سے ایک اور نظریہ پیدا کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ کہ اس قاعدے میں کوئی ایسی شق شامل نہیں کی جا سکتی نہ واضح الفاظ میں نہ معناً جس کا مقصد یہ بتانا ہو کہ جو اختیارات اس کی رُو سے تفویض کئے جاتے ہیں وہ اس بنا پر واپس لئے جا سکتے ہیں کہ اُن کا استعمال غلط طریقے پر ہو۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ لاقانونیت کے رُجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے وہ ضرور اس تصور کی تائید کریں گے تاکہ قانون کا سرچشمہ باقی رہے اور ہوبس (Hobbes) نے اس ضمن میں بڑی تائیدی بحث کی ہے۔ لیکن ہارٹ کا خیال ہے کہ وہ محض ایک منطقی استدلال کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ مشروط نہ ہو۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ فرائض

کے قاعدوں اور اختیارات کی منتقلی کے قاعدوں میں واضح خطِ امتیاز قائم رہے تو پھر وہ اِس تجویز سے خوش نہ ہوگا۔ کہ اگر تسلیم کرنے کے اُصول کے تحت ایک دفعہ قانون سازی کے اختیارات دے دیئے جائیں تو انھیں واپس لینا بھی ممکن ہے۔ اگر بادشاہ سلامت رعایا کی نظر سے قوانین کو مخفی رکھیں اور اس بنا پر انھیں تخت و تاج سے محروم کر دیا جائے تو پھر یہ سوال احمقانہ ہوگا کہ آیا انھیں اس بنا پر برطرف کیا گیا ہے کہ ایک فرض کی ادائیگی میں ناکام رہے، یا پھر اس لئے کہ اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کر کے انھوں نے اپنے کو منصب کا اہل نہ رکھا اور ان کے وضع کردہ قوانین بے اثر اور کالعدم ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ جس قاعدے کے تحت اختیار دیا جاتا ہے اور اُصولاً یا عملاً واضح کیا جاتا ہے کہ اگر اختیار کا ناجائز استعمال ہوا تو اختیار ختم ہو جائے گا تو اس شرط کے اضافے سے صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ قانون کی دونوں متذکرہ قسموں میں یعنی "ترکِ فرض" اور "تجاوزِ اختیار" میں کوئی خاص امتیاز بہ مشکل باقی رہ سکتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر ہارٹ اِس امتیاز کو باقی رکھنا چاہتا ہے تو اسے یہ فرض کرنا ہوگا کہ قانون سازی کے اختیار کو قانوناً ختم نہیں کیا جا سکتا۔ تسلیم کرنے کے اصول کے سارے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ ہارٹ بھی حسبِ معمول اسی اُلجھن اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہے جو اصولِ قانون سازی کے سلسلے میں ہم سب کو بہت پریشان رکھتی ہے۔

ہارٹ بلاوجہ اُن اخلاقی اور عملی تقاضوں سے، جن سے کسی نہ کسی طرز کے قانونی نظام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نتیجتاً ایسا نظام وجود میں آتا ہے جو علم اصول قانون کے وہ نظری امتیازات متعلق کرنا چاہتا ہے جو صرف برائے بحث ہوتے ہیں اور جب عملی انداز میں دیکھے جائیں تو بے معنی ثابت ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظام قانون کا سرچشمہ یہ شعور ہے کہ حق کو حق تصور کیا جائے اور قانون کے برحق ہونے کا یقین رہے، بہرحال یہ شعور نہایت نازک اور معنوی توقعات اور قبولیت سے جو اخلاق اعلیٰ کا پرتو ہیں پیدا ہوتا ہے لیکن ان تقاضوں اور توقعات کو باقاعدہ ذمہ داری اور اہمیت کے رنگ میں بمشکل بیان کیا جا سکتا ہے۔

وٹگنسٹین (Wittingenstein) کی پیش کردہ ایک مثال کا سہارا لے کر میں فرض کرتا ہوں کہ کوئی خاتون دوپہر کو سینما شو دیکھنے جا رہی ہے وہ اپنے بچوں کی خادمہ سے کہتی ہے کہ "جب میں گھر سے باہر رہوں اُس عرصے میں تم بچوں کو کوئی کھیل سکھانا۔" فرض کریں کہ خادمہ بچوں کو جوا کھیلنا یا چاقو چلانا سکھاتی ہے۔ اب اس کی حرکت پر خاتون اپنا فیصلہ دیتے وقت کیا اس سوال میں اُلجھے گی کہ خادمہ نے ایک وعدے کی خلاف ورزی کی ہے یا محض اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ ان سوالوں میں اُلجھنا پسند نہیں کرے گی بلکہ وہ اور ہی طریقے سے سوچے گی۔ یقیناً وہ دیانت کے ساتھ کہہ سکتی ہے کہ میری مراد ایسے کھیل سے ہرگز نہ تھی مگر فہم، اخلاق کے تقاضے کی بات تھی مفروضے کی نہیں کہ اس کے بچوں کو اس قسم کے کھیل کھلائے جا سکتے ہیں۔" انسانی روابط اور اعمال میں بعض ایسے نتائج سامنے آتے ہیں کہ شعوری طور پر ان کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ یہی حال موجودہ دور میں

پارلیمنٹ کا ہو جائے اگر پارلیمنٹ یہ بھول جائے کہ اس کا اصل کام قانون سازی ہے اور پھر وہ روحوں کی نجات اور سائنسی حقائق کے انکشاف پر اُتر آئے۔ پارلیمنٹ سے جو توقعات وابستہ کی جاتی ہیں وہ قانون سازی سے متعلق ہوتی ہیں اور اگر اس نے تجاوز کا اندیشہ ہو تو کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ایوان پر کچھ بندشیں عائد کی جائیں۔ بااختیار ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبر شراب کے نشے میں چور ہو کر من مانی قانون سازی کرتے رہیں۔ اِسی طرح پارلیمنٹ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جو قوانین منظور ہوں وہ متعلقہ لوگوں کی نظر اور علم سے پوشیدہ نہ رہیں اور دیدہ و دانستہ ایسے مُغلَق اور مبہم نہ ہوں کہ لوگوں کی سمجھ ہی میں نہ آسکیں۔

ہارٹ دراصل یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قانون کا تصور، جبر اور طاقت کے ذریعے حکم چلانے کے تصور سے الگ چیز ہے۔ اس کا قول ہے کہ نظامِ قانون یہ نہیں ہے کہ طاقت کے بل پر جو جی میں آئے منوا لیا جائے لیکن اگر "عام تسلیم" کے قاعدے کے تحت کسی بااختیار ادارے نے جو حکم وضع کیا ہے وہی قانون ہے تو پھر اس صورت میں اس کا نفاذ طاقت اور جبر سے کیونکر بے نیاز ہو گا کیونکہ طاقت کا قاعدہ مقررہ کی حد میں استعمال اس سے بہتر ہے کہ شہریوں کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بننے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اگر کوئی شخص پستول دکھا کر یہ کہے کہ روپیہ نکالو ورنہ گولی مار دُوں گا تو عام توقع یہی ہوتی ہے کہ اگر اُسے روپیہ دے دیا جائے تو جان بخشی ہو جائے گی لیکن اگر وہ رقم بھی اینٹھ لے اور جان سے بھی مار دے تو میں کہوں گا کہ اس کا یہ اقدام نہ صرف معلمینِ اخلاق کے نزدیک قابلِ مذمت ہے بلکہ سمجھ دار رہزن اور ڈاکو بھی اس کی مذمت ہی کریں گے۔ غور کیجئے تو اس معنی میں "غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنا" بھی دراصل غیر مشروط نہیں رہتا لیکن ہتھیار ڈالنے والے

کو اس امر کا یقین ہونا چاہیے کہ وہ اذیت وایذا کے بدلے مرگ ناگہاں کا سودا نہیں کر رہا ہے بلکہ حکم جبری سہی، مان لینے پر وہ بچ جائے گا۔

ہارٹ نے شمشیر بکف حکم چلانے اور نظام قانون پر عمل کرنے میں خود ہی جو امتیاز قائم کیا ہے اِس میں قانون کی حد تک حاکم اور محکوم کے مابین عمل کے توازن اور لین دین کا تصور نہیں بلکہ امتیاز صرف رسمی اور ظاہری صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ہارٹ کہتا ہے کہ تلوار بکف ڈاکو تو کسی ایک آدمی کے روبرو دھمکی دیتا ہے لیکن قانون کے تحت 'مستقل اور عام احکامات جاری ہوتے ہیں اور شائع بھی ہوتے ہیں لیکن رعایا اور قانون ساز کے درمیان دوبدو کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ظاہری امتیاز یہ ہے کہ قانون پر عمل کرانے کا معیاری طریقہ ہے اور وہ یہ کہ عام قاعدے اور ضابطے عام قانون کے اعلان کی شکل میں جاری ہوتے ہیں جس کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ کسی بھی معاشرے میں اتنے زیادہ سرکاری ملازم نہیں رکھے جا سکتے کہ وہ گھر گھر جا کر ایک ایک فرد کو ہر ہر قانون کی اطلاع دیتے رہیں۔ ہارٹ کے خارجی تجزیہ تصور قانون میں جو انداز اختیار کیا گیا ہے اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال ہی کو ترک کر دیا جائے کہ شہریوں کو بھی جائز طور پر کچھ ایسی توقعات ہو سکتی ہیں جن کی قانون ساز خلاف ورزی کر سکتے ہیں۔

میں یہاں اس مسئلے سے بحث نہیں کروں گا کہ اگر ہارٹ کے نظریے کا ترقی یافتہ آئینی جمہوریت پر اطلاق کیا جائے تو اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس معاملے میں صرف تسلیم کرنے کا ایک قاعدہ نہیں بلکہ ایسے بہت سے پیچیدہ قاعدے، ضابطے، روایات تسلیم کر لینی پڑتی ہیں جن کے تحت قانون سازوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جو

کی صلاحیت اور معیار قابلیت مقرر ہوتی ہیں اور یہ طے ہوتا ہے کہ کس چیز کو قانون سمجھا جائے اور کسے نہیں۔ اور ایسی ہی بہت سی چیزوں کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عام شہریوں کی اکثریت قانونی نظام کا صحیح شعور اور علم نہیں رکھتی۔ نہ تو وہ قانونی ڈھانچے کو سمجھتے ہیں اور نہ معیارِ قانون کو پرکھنے کے ہی اہل ہوتے ہیں۔ ہارٹ نے آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ قانون کے عام قواعد اور قانون سازی کے اختیارات دینے کے قواعد بہ الفاظ دیگر دستور کے قواعد کے درمیان ہمیشہ خطِ امتیاز کھینچنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اس پر مُصر ہے کہ مسلّمہ قاعدہ "تسلیم" جو بادشاہ بہ اجلاس پارلیمنٹ کو قانون سازی کا سرچشمہ گردانتا ہے اُس میں وہ تمام قاعدے اور ضابطے جذب اور شامل ہو سکتے ہیں جن کی مدد سے وکلا اور قانون دان حضرات سینکڑوں مختلف قسم کے حالات میں قانون کا باضابطہ اجرا اور نفاذ تسلیم کرتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ معاملے کا یہ پہلو قانون دانی کا کوئی ایسا عنصر نہیں جو خارجی طور پر مسلّط کر دیا گیا ہو اور نہ ہی پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا اظہار ہے جو نظام کے اندر پیدا ہونے والے تنازعات کو بھی طے کرا سکے، بلکہ ایسی چیز ہے کہ جو حکومت کے روزمرّہ کے عمل کے مشاہدات سے ثابت ہے۔

بہرحال میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ سب کچھ کیونکر ہو سکتا ہے "پارلیمنٹ" تو محض ایک ادارے کا فقط نام ہے اور صدیوں سے اس کی حیثیت اور نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی کا اظہار آج بھی اس شاندار کہاوت میں موجود ہے کہ "پارلیمنٹ میں خود قانون سازی نہیں کرتی بلکہ پارلیمنٹ سمیت ملکہ کرتی ہے[1]" اصول "تسلیم" حکم کو قانون کا سرچشمہ اور جواز سمجھنا اور اسی چیز کے متعلق جو لگاتار

---

[1] حالانکہ بیچاری ملکہ کو سوائے توثیق کے کوئی حقیقی اختیار نہیں۔

تغیر پذیر ہو، میرے خیال میں کچھ اس قسم کی بات ہے جیسے یہ کہنا کہ کسی بھی ملک میں قانون وہ ہے جو ہر با اقتدار شخص حکم دے کر چلا دے جبکہ کبھی یہ اختیار واقتدار کبھی مطلق العنان حکمران کے ہاتھ میں ہو، اور دس بیس سال کے بعد منتخب شدہ حاکم کے پاس آجائے، اور کسی دور میں سابق حکمران کے بیٹے کو مل جائے اور کبھی کبھی فوج، کلیسائی ادارے اور مزدوروں کی انجمن سب مل کر "سہ شخصی" حکومت بنالیں۔ ان کے احکام، احکام ہوں گے مگر از خود قانون کے اخلاقی تاثر سے بے نیاز ہوں گے۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہارٹ نے "مسلمہ حکم" کا جو نظریہ قانون کے سرچشمہ کے بارے میں دیا ہے وہ بدلتا رہتا ہے لیکن کیا خبر اس کا منتہائے نظر اور تغیر و تبدیلی کا یہ دائرہ کس قدر وسیع ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنا یقیناً جبکہ اقتدار اعلیٰ کا مرکز ہر وقت بدل سکے سیاسی مصلحت کے خلاف ہے اپنے ملک کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے تو یہ اچھا معلوم ہوگا کہ تغیرات اور انقلابات کے باوجود سرچشمہ قانون میں ایک قسم کا تسلسل پایا جاتا ہے لیکن جب مسلّمہ اصول کو تجزیے کے مؤثر ذریعے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ کہاں اور کس وقت اس میں تغیر اور تبدیلی رونما ہوئی ہے اور قانون محض جبری حکم ہو گیا۔ آپ اپنی حد تک تسلسل سمجھئے لوگ انقلاب کہیں گے جیسے نازی قوانین میں جکڑی ہوئی قوم انھیں قانون سمجھتی تھی اور ہم لاقانونیت کہتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہارٹ کے پورے تجزئیے میں ایک بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ اس اصول کی مدد سے ایسے سوالات کے قانونی جوابات دینا چاہتا ہے جو لازمی طور پر سماجی اور عمرانی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ استقلالِ قانون کی بحث میں اس اصول کا غلط اطلاق صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

فرض کیجئے کہ شہنشاہ پنجم اپنے والد شہنشاہ چہارم کی وفات پر تخت نشین ہوتا ہے۔ بظاہر اقتدار کی ذات بدل گئی یعنی فرد بدل گیا لیکن مرحوم بادشاہ کے قوانین اس وقت تک حسب معمول جاری و ساری رہتے ہیں جب تک شہنشاہ پنجم خود ان میں کسی تبدیلی کا اعلان نہ کر دے۔ یہی وہ عمرانی مسئلہ ہے جس کی وضاحت ہارٹ صاحب کرنا چاہتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں، پورٹیلس (Portalis) ڈیڑھ صدی پہلے اس کی نشان دہی کر چکا ہے۔ ہارٹ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ "تسلیم" کا اصول کسی فرد کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ منصب کی کرتا ہے اور اس میں قانونی حق وراثت کا اصول شامل ہے۔ ہارٹ کی رائے میں اسی "اصول تسلیم" سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا ۱۷۳۵ء کا بنایا ہوا قانون ۱۹۴۴ء میں بھی کس طرح قانون ہی رہتا ہے؟ غرض اصولِ تسلیم یہ ہوا کہ اقتدار اعلیٰ کا حکم جو بھی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ یہی قانون ہے اور جائز طریقہ پر ملا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لئے فرض کریں کہ شہنشاہ پنجم اپنے باپ کی جگہ تخت نشین نہیں ہوتا بلکہ بروٹس اول ہو جاتا ہے اور وہ بلا تکلف مسلمہ قانون وراثت کی خلاف ورزی کر کے تخت و تاج شہنشاہ پنجم سے چھین کر مالک بن جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ اس صورت میں املاک، معاہدات، اور شادی بیاہ کے قانون منتقلی اقتدار میں بے ضابطگی کی وجہ سے لازماً اور یکسر کالعدم قرار پائیں گے ہارٹ یہی کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن تاریخ اس کی گواہی نہیں دیتی۔ شاید ہارٹ صاحب یہ کہیں کہ بروٹس اول کی خاموشی سے پرانے قوانین ہی چلتے رہیں گے لیکن یہ وہ دلیل ہے کہ جس پر خود ہارٹ صاحب ہوبس، بینتھم اور آسٹن کے سلسلے میں نکتہ چینی کر چکے ہیں: اور یہ ایسی دلیل ہے جو ہارٹ کے تجزیئے میں غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ پرانے طرز کے فوجی اور غیر نظریاتی انقلاب

یا بغاوت اس کی واضح مثال اور نمونہ ہے کہ حاکمِ اعلیٰ ایں کس طرح تبدیلی ہو جاتی ہے اور سرچشمۂ قانون بدل جاتا ہے گو اس سے قانون کے استقلال اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ موجودہ دَور کے نظریاتی انقلاب ملک کی قانونی اساس کو بدل کر لائے جاتے ہیں اور اس سے ایسی بنیادی تبدیلی کا اظہار ہوتا ہے جس سے یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ سابقہ قوانین (مثلاً کلیساؤں کو محصولات سے مستثنیٰ رکھنے کا قانون) نافذ العمل بھی رہیں گے یا نہیں۔ جہاں تک قانون کے استقلال اور تسلسل کا معاملہ ہے، اصول تسلیم ایک غلط وجہ اور غلط پیمانہ ثابت ہوتا ہے۔

ہارٹ کے اس اصول کی افادیت اس وقت بھی مشکوک ہو جاتی ہے جب وہ یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ قدیم معاشرہ غیر مہذب مرحلے سے گزر کر کس طرح قانون اور تہذیب کی نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے، جو معاشرہ قانون کے عہد سے پہلے کا ہے اس میں تو صرف ذمہ داریوں کے بنیادی اصول ہی پائے جاتے ہیں اور انھیں فرائض والے قاعدے سمجھنا چاہیے۔ اس قسم کا نظام کئی اعتبار سے ناقص ہوتا ہے۔ اس میں شکوک اور تضاد دور کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا، اور بالارادہ تبدیلیاں کرنے کا بھی کوئی طریقہ نہیں ہوتا۔ اس کے قاعدوں کا انحصار سماجی تقاضوں کے لحاظ سے رواجوں کے اثر سے ہوتا ہے۔ قانونی دنیا میں قدم رکھنے کا عبوری دَور اس وقت آتا ہے جب معاشرے کو پہلے پہل یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک قاعدے کے ذریعے اختیار دیا جائے کہ جو فرائض عائد کئے گئے اور قاعدے نافذ ہیں وہ کیسے تبدیل کئے جائیں۔ معاشرے کے لئے ایسی نئی چیز کا سراغ لگا لینا اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا پہیئے کی ایجاد۔ ایسا قاعدہ دستور سازی کی ابتدا ہے۔ مگر یہ نظریہ بھی، جو آسٹن سے ماخوذ ہے، جزوی طور پر ہی صحیح ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس تصور کے تحت پھر قانونی امتیازات کا غلط اطلاق کیا گیا ہے، مثلاً کسی ایسے معاشرے میں جہاں لوگ طلسمات پر یقین رکھتے ہوں اور دنیا کی تخلیق اور مظاہر فطرت منتر اور جادو سے پیدا سمجھے جاتے ہوں وہاں فطری اور قانونی اختیارات میں تمیز کرنا بہت ہی مشکل بات ہے۔ خدا کا نمائندہ شہنشاہ قانون سازی کے لئے کسی انسان کے بنائے ہوئے اصولِ تسلیم یا اصولِ "قبول عام" کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اُسے قانون بنانے کے اختیارات اس عقیدے کی بنا پر ہوتے ہیں کہ قدرت کی جانب سے یہ اختیارات ودیعت کئے گئے ہیں "تسلیم عام" کے اصول تو صدیوں کے بعد پیدا ہوئے جب پرانے عقائد کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور قانون سازی کا اختیار موروثی نہیں بلکہ عطیہ عوام سمجھا گیا۔ اس تبدیلی کی تکمیل سے بہت پہلے قدیم معاشرہ کا وجود ہی ختم ہو چلتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تصورات کی یہ تبدیلی میں صدیاں لگتی ہیں اور پلٹ پلٹ کر اُن ہی قدیم عقائد و نظریات کے ابھرنے کا امکان بہرحال باقی رہتا ہے فرد اور شخصیت کا عمل اور اثر ہمارے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہا ہے، یعنی قدیم دور کی تو بات ہی الگ ہے جدید دور میں بھی ہم شخصیت کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکے ایسی شخصیت جو قانون پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی مشکوک ہے کہ آیا قدیم معاشرے میں ایسی کوئی چیز موجود بھی تھی جسے آجکل ہم نظریہ فرائض کے طور پر جانتے ہیں۔ کم از کم یہ بات قابل بحث ضرور ہے کہ اختیار اور فرائض کی کشمکش میں اختیار و اقتدار کا تصور زیادہ قدیم ہے۔ جس چیز کو آج ہم "سزا" کہتے ہیں وہ قدیم معاشرے میں جہاں جادو اور طلسمات پر عقیدہ تھا کسی اور شکل میں موجود تھی اور معاشرے کی تطہیر کے لئے مجرم پر جادو کا منتر پڑھا جاتا تھا، ناپسندیدہ لوگوں

کو ذات سے خارج کر کے بھی معاشرے کی تطہیر کی جاتی تھی، پرانے زمانے میں فرض کا کوئی عمومی تصور تو نہ تھا لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اُس دور میں بھی کچھ باتوں کی اجازت اور کچھ کی ممانعت تھی، کچھ درست تھیں اور کچھ نادرست۔ ابتدائی قانونی طریقۂ کار کسی جرم کے عدالتی فیصلے سے نمودار نہیں ہوا بلکہ اپنی مدد آپ کے اُصول پر سامنے آیا۔ ہر غلط کام کی اصلاح کے لئے یہ ضروری تھا کہ کوئی خاص اور واضح چارۂ کار مقرر کیا جائے۔ فرض کا ایک عمومی تصور اس وقت پیدا ہوا ہوگا جب کسی ایک فرض کی کوتاہی کے کئی دادرسیاں اور علاج تجویز کئے گئے ہوں یا ایک ہی چارہ کئی قسم کے فرائض ترک کرنے کی تلافی کو مقرر ہو۔ لیکن جب کسی غلط کاری کے نتائج کے انسداد کے لئے باضابطہ صرف مقررہ سزا یا تاوان مقرر ہو تو ہمیں یہی سمجھنا چاہیئے کہ ہم فرض نہیں بلکہ اقتدار کے نظریئے سے دوچار ہیں۔ اس فرق کو مثالوں سے سمجھئے۔ قتل کی سزا حکومت دے گی یہ اقتدار کا اظہار ہوا۔ ناجائز قبضے کی تلافی دخل ملنے سے اور ہر جے سے ہوئی یا کئی خلاف قانون اعمال کا معاوضہ یکساں ٹھہرے تو یقین اور فرائض کا تصور اُبھرے گا۔

بہتر ہوگا کہ ہم ہارٹ کے اس مفروضے کا بھی تجزیہ کر کے دیکھیں جس کا تعلق "قانونی دنیا" میں قدم رکھنے کے عبوری دور سے ہے۔ حالانکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بالکل جدید زمانے میں بھی قدیم تہذیب کے لوگوں نے عبوری مرحلے سے گزرنے کا عمل ظاہر کیا ہے۔ یہ تجربہ ایسے لوگوں کا ہے جس کی مثال مارگریٹ میڈ نے بعض برطانوی جزائر کے مخصوص طبقے کے باشندوں سے پیش کی ہے[۱]

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ان جزائر کے لوگوں کو اپنے آسٹریلوی حکمرانوں

---

[۱] ملاحظہ ہو مارگریٹ میڈ "نیو لائیوز فار اولڈ" (۱۹۵۶) ص ۳۰۶-۳۰۷

سے یہ معلوم ہوا کہ تنازعات سے نمٹنے کا ایک ایسا طریقہ بھی ہوتا ہے جس کا انہیں پہلے علم نہ تھا۔ یہ عدالتی فیصلے کا طریقہ کار تھا۔ اس سے پہلے وہ لڑ جھگڑ کر اور پھر تاوان ادا کرکے یا دوسری تقریبات منعقد کرکے صلح و صفائی کیا کرتے تھے اب انہیں معلوم ہوا کہ کسی غیر جانب دار ثالث کے سپرد کرکے بھی معاملہ کا تصفیہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عدالتی فیصلے کا رواج شروع ہو گیا اور خود ان کے بزرگوں نے جج کے فرائض انجام دئے۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ جو لوگ جج بن گئے تھے خود انہیں آسٹریلوی حکومت کی طرف سے کوئی مسلّمہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ ان کے اختیارات میں کسی اصول قبول عام کی کارفرمائی نہ تھی محض یہ کہ خود جزائر کے لوگوں نے قطعی غیر رسمی اور بے ضابطہ طور پر انہیں حَکَم تسلیم کر لیا تھا۔

اس طریق انصاف کے بارے میں عام لوگوں کا رویہ کیا رہا، یہ خود مس میڈ نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"نیوگنی کے مقامی باشندوں کی بڑی خواہش تھی کہ اُن کا معاشرہ ہموار بنیادوں پر استوار ہو اس لئے وہ پورے نظام قانون کو نہایت جدید اور دلکش تصور کرتے ہیں اور اُسے ایک شاندار ایجاد سمجھتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ہوائی جہاز کی ایجاد۔ نیوگنی کے اندرونی علاقوں میں اس قسم کی غیر قانونی عدالتیں رواج پا رہی ہیں۔

اگر مس میڈ کا بیان درست ہے تو پھر یہ سمجھنا چاہئے کہ جزائر کے لوگوں میں تسلیم اور قبولِ عام کا اُصول کسی ایسے انسانی ادارے کے حق میں نہیں تھا جسے قانون بنانے کا اختیار دے دیا گیا ہو بلکہ صرف ایک طریقۂ کار کے لئے تھا۔ اور جب اس نظام کو پہیے یا جہاز کی ایجاد کی سی اہمیت دی جاتی ہے تو

یہ سمجھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہمیت ایک مقررہ ضابطہ کار کے زیادہ شایاں ہے نہ کہ کسی کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے واقعے کو جو عارضی یا مجبوراً بھی ہو سکتا ہے۔

قانون: مقصدی عمل یا معاشرتی قوت:

اِس باب میں جو مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں اُن کی مختلف انداز سے مخالفت کی جا سکتی ہے، اور یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ در اصل ان میں اختلاف ایک ہی موجود ہے، اس بنیادی اختلاف کی تشریح کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے۔ میں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ قانون کو ایک با مقصد عمل تصور کیا جائے اور اس کی کامیابی کا انحصار قانون پر عمل کرانے والوں کی قوتِ کار، ذہانت، تدبّر، اور احساسِ فرض پر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں کے نہ ہونے یا کم ہونے کے سبب وہ بہترین نتائج کبھی حاصل نہیں ہو سکتے تو قانون کا مطمعِ نظر ہوتے ہیں۔ اِس خیال کی مخالفت میں یہ کہا جاتا ہے کہ قانون کو معاشرتی اختیار یا قوت کا مظہر تصور کرنا چاہیئے، اور اس کا مطالعہ یہ سمجھ کر کیا جائے کہ قانون کیا ہے اس کا عمل کیا ہے نہ یہ کہ قانون کا مقصد کیا ہے اور اس کی شکل کیا ہونی چاہیئے۔

اِس بنیادی اختلاف سے بحث کے دوران میں ان امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جن کی بنا پر میری رائے کے برعکس صرف معاشرتی قوت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ میں فریقِ مخالف کی جانب سے بولنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا اِس لئے میرا بیان فرضی نوعیت کا ہوگا۔ بہر حال میں چاہتا ہوں کہ پوری

قوت اور استدلال کے ساتھ مخالفوں کی وکالت کروں۔

یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی قوانین کی تشریح و تفسیر میں مقصد کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے۔ قانوناً لازماً ایک بامقصد چیز ہے جو بعض ضروریات پوری کرتا ہے' اس پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ یہ نہیں ہے کہ مخصوص قوانین کے ساتھ مقاصد کیوں وابستہ ہیں بلکہ یہ کہ مجموعی طور پر قانون کے ساتھ کوئی معیار اور مقصد کیوں وابستہ کر دیا جائے۔ قانون تعلقات کو منضبط کرے یہ صحیح' مگر قانون کا یہ مقصد کیوں ہو کہ اخلاق کی اصلاح کرے۔

ایسا نظریہ جس کے تحت کسی مکمل اور پیچیدہ ادارے کے ساتھ کچھ مقاصد وابستہ کیا کئے جائیں نہایت خطرناک ہوتا ہے اور فلسفۂ تاریخ میں اس کی بڑی مثالیں موجود ہیں' اس موقع پر مجھے جرمن اور برطانوی نظریات پسندوں کی زیادتیاں یاد آتی ہیں۔ ان سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اگر ہم قانون کے مقصد کے بارے میں بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیں گے تو وہ ریاست کے مقصد پر جا کر رُکے گا۔ اس بحث سے تو خطرہ ہے کہ ہیگل کی روح دوبارہ زندہ ہو جائے گی اور شاید ایسا نہ ہو سکے تو بھی بہت سی ناگوار صورتیں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر مجھے تھامس جیفرسن کی وہ سنجیدہ بحث یاد آ رہی ہے جو اُس نے امریکن فلاسوفیکل سوسائٹی میں اپنے ساتھیوں سے کی تھی اور اس کا موضوع تھا دلدل کا مقصد (Purpose of Swamps) ۔ مقصد کے حصول کے لئے اگر سائنسی اور معروضی بحث کی جائے تو درست ہے ورنہ کج بحثی سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

اگر اس نظریے کی تاریخی مثالیں زیادہ بری نہ ہوں تو بھی کوئی نظریہ

ایسا ممکن نہیں ہے جس میں پورے ادارے کے ساتھ مقصد وابستہ کر دیا گیا ہو۔ اداروں کی تشکیل ہزاروں افراد کے عمل سے ہوتی ہے اور اعمال میں سے بہت سے عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور بے مقصد ہوتے ہیں۔ اور جو افراد مقصد رکھتے ہیں اُن کے سامنے بھی اتنے مختلف مقاصد ہوتے ہیں کہ شمار کرنا مشکل ہے۔ جو لوگ اداروں کی تشکیل کرتے ہیں اُن کے ذہن میں بھی ادارے کے مقاصد کی نوعیت اور کیفیت ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں ———

——— یہ ہوئیں میرے نظریہ قانون کے خلاف دلیلیں۔

اِن اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے قانون کے ادارے سے جو مقصد وابستہ کیا وہ نہایت سنجیدہ اور محدود مقصد ہے اور وہ یہ کہ انسانی عمل کو عام اصولوں کا تابع بنایا جائے، اس قسم کے مقصد کے پیشِ نظر ہیگل کے اعلیٰ اور ناقابلِ حصول مقاصد کی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔ اگر قانون سازی پر اس محدود مقصد کا بار سلیقے سے ڈالا جائے تو کسی خطرے کا امکان نہیں جیسا کہ میں دوسرے باب میں وضاحت کر چکا ہوں۔

قانون میں میری پیش کردہ مقصدیت کی اہمیت مسترد تو کی جا سکتی ہے لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہو گا کہ اس حقیقت سے انکار کرنا کتنا مہنگا سودا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ہم ایسا کریں تو پھر قانون کے قانون ہونے یا نہ ہونے کا کوئی معیار باقی نہیں رہتا۔ اگر قانون محض معاشرتی قوت اور اقتدار کا مظہر ہی ہے تو پھر ہم خواہ خاص قسم کے قوانین کے انصاف اور ناانصافی کا قصہ بیان کرتے رہیں لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی نظامِ قانون کسی حد تک قانون کے اعلیٰ تصورات پر پورا اُترتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم نے

قانون کا دائرۂ کار متعین کر رکھا ہے تو ہم مقصدیت کے معیار کو ترک کرنے کے بعد یہ وضاحت کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ بہ نسبت دوسرے ملکوں کے فلاں ملک کا نظامِ قانون بہتر ہے اور قانونی تقاضے پورے کرتا ہے۔ بامقصد ہونے کی صفت کو نظر انداز کرنے کی صورت میں ہم قانون میں تضاد کی بات تو کر سکتے ہیں لیکن ہمارے پاس یہ جانچنے کی کوئی کسوٹی نہیں رہ جاتی کہ یہ تضاد کہاں ہے۔ ہم زمانۂ سابق سے نافذ ہونے والے قوانین کا رونا رو سکتے ہیں لیکن ہم یہ بتانے سے قاصر رہیں گے کہ اگر کسی نظامِ قانون کی تمام تر بنیاد ہی ایسے قوانین پر ہو تو کیا خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اگر ہم صرف یہ نظریہ بنا لیں کہ عامۃ الناس پر قانون کا نفاذ اور اطلاق کرنے کے لئے عام قاعدے اور ضابطے درکار ہوتے ہیں اور مقصد کو خیرباد کہہ دیں تو قانون سازی کا جواز صرف یہ ماننا پڑے گا کہ اعلیٰ ترین قانونی حاکم یا ادارہ ہر گلی کوچے میں اتنے کارندے تعینات نہیں کر سکتا کہ وہ لوگوں کو بتلاتے رہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ دوسرے باب میں میں نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے وہ نہ تو اُٹھائے جا سکتے ہیں اور نہ ان کا حل ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر واقعی قانون سے متعلق باب دوم کے متذکرہ مسائل ایسے ہیں جن کی اس طرح ترتیب ممکن نہیں کہ ہم اُنھیں حل کرنے کے قابل ہو سکیں تو پھر ہمیں جرأت سے کام لے کر اس حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے اور خود کو دھوکا دینے سے فائدہ نہیں اور یہ مسائل اور قباحتیں قانون کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اصل بات سامنے آتی ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کون سا نظریہ ہموار اور تسلی بخش ہے بلکہ یہ کہ کون سا درست ہے اور حقیقت سے ہمکنار ہے۔ آئندہ باب میں میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا

کہ جس نظریے میں قانون کی مقصدیت نظر انداز کر دی جاتی ہے اور اُسے سماجی قوت کا مظہر سمجھ لیا جاتا ہے اس کی حقیقت پسندانہ تائید نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ حقیقت کی غلط تاویل کر کے مفروضات پر عمارت کھڑی کی جائے۔

میں جس نظریے پر تنقید کر رہا ہوں اُس میں قانون کی حقیقت کا ادراک اور مفہوم "قانون سازی کے ایک مسلّمہ ادارے کے وجود سے لیا جاتا ہے۔ یہ ادارہ جس چیز کو قانون کہہ دے وہی قانون ہے" اس میں درجہ بندی کا کوئی سوال نہیں، اور کوئی اس کے ساتھ "کامیاب" یا "ناکامیاب" کی صفات منسلک نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ان صفحات میں پیش کردہ خیالات کی مخالفت میں جو نظریہ پیش کیا جاتا ہے" اس کا خلاصہ یہی ہے۔

میرے خیال میں یہ نظریہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کے حقیقی تصور میں سے ہم دو عناصر خارج کر دیں" پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلّمہ ادارہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ قانون کیا ہے" خود بھی کسی قانون ہی کی پیداوار ہوتا ہے جدید دور میں قانون کی تخلیق مشترکہ طور پر یا اجتماعی طور پر کی جاتی ہے" مثلاً مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ میں ـــــ چنانچہ مشترکہ عمل کے لئے لازم ہے کہ طریقۂ کار کے ضابطے متعین کر دیئے جائیں تاکہ متعلقہ افراد ان کی پابندی کر کے قانون "منظور" کر سکیں۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ قانون سازی کا یہ ضابطہ اُن آٹھوں خرابیوں کا شکار ہو جس کا میں ذکر کر چکا مگر پھر بھی پارلیمنٹ ضابطے کی پابند تو ہوئی اور محض سماجی قوت کا مظہر تو نہ رہی۔ چنانچہ ہم جب کہتے ہیں کہ برطانیہ میں پارلیمنٹ کو اس بات کے فیصلے کا قطعی اختیار ہے کہ قانون کیا ہے اور کیا نہیں؟ تو گویا ہم قانونی عمل کا پہلا زینہ طے کر رہے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ پارلیمنٹ ایک مشترکہ

یا اجتماعی ادارہ ہے جس کا "مقصد" قانون پر حتمی رائے قائم کرنا اور اُسے معین کرنا ہے۔ جن ملکوں میں قدیم زمانے سے جمہوری روایات چلی آرہی ہیں وہ اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم واقعی حقیقت پسند ہیں تو یہ ماننا ہوگا کہ پارلیمنٹ کی قانون سازی کی اہلیت بھی ایک مقصدی کوشش کا نتیجہ اور کارنامہ ہے کیونکہ پارلیمنٹ آسمان سے نہیں ٹپک پڑی۔ قانون کو صرف سماجی قوت کا مظہر کہنے میں حقیقت سے دوسرا انحراف یہ ہے کہ اس طرح ایک حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار و اختیار کا باضابطہ ڈھانچہ، کسی قانون یا حکم کے تحت نہیں بلکہ ایک مقصد کے لئے انسانی عمل اور کوشش کا محتاج ہوتا ہے۔ ویبر (Weber) نے لکھا ہے کہ تمام رسمی معاشرتی ڈھانچے، خواہ وہ روایت کے ذریعے وجود میں آئیں یا تحریری آئین کے تحت تشکیل پائیں، خامیوں سے مبرّا نہیں ہوتے لیکن ان کے نقائص اس لئے بھی ظاہر نہیں ہوتے کہ اِن خامیوں اور قانونی خلا کو پُر کرتے ہوئے لوگ جو عمل کرتے ہیں وہی بہترین سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کا احساس بھی نہیں کیا جاتا کہ متبادل طریقہ بھی موجود تھا۔ بہر حال عام طور پر لوگ ایسی احمقانہ باتیں نہیں کرتے جس سے ان کے سارے کام پر پانی پھر جائے، خواہ جن اختیارات کے تحت وہ کام کر رہے ہوتے ہیں، ان میں احمقانہ حرکات کی گنجائش ہی کیوں نہ ہو۔[1] دوسرے لفظوں میں قانون ساز ادارے خود مختار ہونے کے باوجود معقولیت اور مقصدیت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور عوام قانونی خامی کے باوجود غیر معقول عمل سے بچتے ہیں۔

قانون کے ڈھانچے میں جو خلا رہ جاتا ہے اس کی ایک اچھی مثال امریکہ

---

[1] ملاحظہ ہو ویبر "لا اِن اکانومی اینڈ سوسائٹی" ص ۳۱

کے آئین میں ملتی ہے۔ قانون سازی کا سب سے اہم اور لازمی تقاضا غالباً یہی ہوتا ہے کہ قوانین کو شائع کیا جائے۔ یہ ایک ایسا تقاضا یا مطالبہ بھی ہے جسے رسمی طور پر اُسی "آئین" میں مقرر کر دیا جاتا ہے کہ ہر قانون یوں شائع ہو گا۔ تاہم امریکی آئین میں قوانین کی اشاعت کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ایک خامی یا خلا ضرور ہے لیکن میرے خیال میں امریکی کانگریس کے کسی ممبر کے ذہن میں بھول کر بھی یہ بات نہ آئی ہو گی کہ اگر وہ کوشش کر کے قوانین کو شائع نہ ہونے دے تو بڑی آسانی سے ٹیکس دہندوں کو ادائیگی محصول سے بچایا جا سکتا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آئین میں اشاعت کی شرط تو نہیں ہے لیکن اس کا منشاء یہی ہے اور آئین کی روح اس کا تقاضا ضرور کرتی ہے ورنہ امریکی آئین کے کئی واضح احکام بھی نظر انداز اور بے معنی ہو جائیں گے۔ لیکن اصل نکتہ یہ ہے کہ کسی نے اس بحث میں اُلجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور عام طور پر یہی ذہن نشین رہا کہ قوانین کی اشاعت ہونی چاہیے۔

ممکن ہے دانشور حضرات "قانون کو بامقصد کوشش اور جدوجہد" ماننے سے انکار کریں اور اسے سماجی قوت کا مظہر ہی قرار دیں۔ لیکن یہ قوت جن لوگوں کے پاس ہوتی ہے وہ فطرتاً یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک بامقصد جدوجہد کر رہے ہیں اور ایسی کارروائیاں اپنے مقاصد میں کامیابی کے لئے کر رہے ہیں۔ ان کے عمل چونکہ مقررہ ضابطے کے تحت نہیں بلکہ فہم و فراست کے ذریعے ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے کامیابی کے درجے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ ضابطہ مقرر مگر فہم و فراست توفیقی چیزیں ہیں۔

اب رہا ہارٹ کا "قانون کے تسلسل اور استقلال" کا مسئلہ، تو

سماجی قوت کے مظہر کے نظریہ کی رُو سے جب شہنشاہ چہارم کی جگہ شہنشاہ پنجم تخت نشین ہو گیا تو بھی شہنشاہ چہارم (سابقہ سرچشمۂ قانون) کا بنایا ہوا قانون کیونکر قائم اور رائج رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی دراصل ظاہری ڈھانچے میں خلا کی ایک مثال ہے جو عملاً محسوس نہیں ہوتی۔ حکومت کی تبدیلیوں کے باوجود قانون کے تسلسل کی ضرورت اس قدر واضح ہے کہ عام طور پر ہر شخص یہی فرض کر لیتا ہے کہ حکومت بدلتی رہے گی لیکن قوانین باقی رہیں گے۔ البتہ جب قانون کو رسمی ادارے یا حاکم کا مظہر سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو حاکم کی تبدیلی اور قانون کی بقا میں تضاد معلوم ہوتا ہے اور اس طرح قانون کا مقصد سے تعلق اور انسانی فیصلے اور تدبر کے امکانی تقاضوں کو عملاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اِس نظریے میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کہ اعلیٰ ترین قانون ساز اقتدار کے ادارے کی واضح تعریف و تشریح ہونی چاہیے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نظام قانون کی بنیاد ہی کھوکھلی رہ جائے گی۔ دوسرے یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ محض اقتدارِ اعلیٰ کے صادر کردہ احکام کسی طرح بھی دانشمندانہ باشعور بامقصد قانون سازی کا بدل نہیں ہو سکیں گے۔ دیکھئے تو سہی کہ انصاف کرنے والے معمولی سطح کے افسر بھی جو اس زبان کو ہی نہیں سمجھ سکتے جس کے ذریعہ ان کے قانونی دائرۂ عمل کی حدود متعین کی جاتی ہیں، اتنا تو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے اختیارات ایک وسیع تر نظام کا جزو ہیں اور ان میں اتنی سوجھ بوجھ ضرور ہو گی کہ وہ احتیاط سے قدم اُٹھائیں گے۔ نظام قانون کے مختلف عناصر میں رابطہ اور تعاون ایسی چیز نہیں جو حکماً نافذ کی جا سکتی ہے، بلکہ یہ ارادتاً صورت پذیر ہوتی ہے اور فہم و فراست سے کام لے کر اس کا یقینی انتظام کیا جا سکتا ہے کہ قانونی ڈھانچے میں خامی اگر ہو بھی تو اس تعاون پر اثر انداز نہ ہو[1]۔

---

[1] یہ عام مشاہدہ ہے کہ عدالتیں بڑی احتیاط سے اپنے مقررہ اختیارات کے اندر رہنے کی کوشش کرتی ہیں اور خیال رکھتی ہیں کہ دوسری عدالتوں سے تصادم نہ ہو۔

میرے خیال میں ایسا نظریہ عجیب نظر آتا ہے جس میں مجموعی طور پر قانون اور مقصد کے لازم و ملزوم ہونے سے انکار کیا جاتا ہے، خواہ یہ مقصد کتنا ہی شریفانہ اور محدود کیوں نہ ہو۔ ابھی تک کسی مکتبۂ فکر نے یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ حقیقت کو کسی پیکر، متعلقات مثالوں کے متن میں محسوس کے بغیر تجریداً سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے چاروں طرف گرد و غبار اور غیر متعلقہ اشیاء جمع ہوں تو ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ کسی چیز کے بارے میں مربوط گفتگو کر سکتے ہیں، لیکن جب ہم قانون کو ایک "حقیقت واقعہ" قرار دیتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک مخصوص نوعیت کی "نوعیت اور واقعہ" ہے اور اس میں کچھ ایسی نمایاں باتیں ہیں جو اُسے دوسری حقیقتوں سے اور واقعات سے تمیز کرتی ہیں —— بڑے بڑے قانون داں حضرات نے یہ سمجھانے کی زبردست کوشش کی ہے کہ اس حقیقت کی نوعیت کیا ہے؟ یہ شمشیر بکف انسان کا حکم چلانے والی حقیقت نہیں بلکہ اس حقیقت کا سراغ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ انسانی عمل اور طرزِ عمل کو عام اصولوں کا کسی طرح تابع کر کے معاشرے کو منظم کیا جائے۔ قانون کیا ہے؟ اس کی خصوصیات اور لوازمات کیا ہیں؟ ان سوالوں کے جواب کامیابی سے دئے جا سکتے ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ وجہ ظاہر ہے بات یہ ہے کہ تقریباً ہر معاشرے میں انسان نے یہ ضرورت محسوس کی ہے کہ انسان کے بعض اعمال کو قاعدے اور ضابطے کا تابع ہونا چاہیے اور جب انسان نے اس مقصد کے حصول کی جد و جہد شروع کی تو اس نے دیکھا کہ اس جد و جہد اور عمل میں خود داخلی طور پر بھی ایک منطق اور اصول موجود ہے اور اس کے کچھ تقاضے ہیں جو بہر حال پورے کرنے چاہئیں چاہے اس میں دشواری کا سامنا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ بغیر اس کے مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں کتنے ہی مختلف معاشرے ہیں مگر ہر معاشرے کے لوگ عام طور پر ان تقاضوں کی حمایت کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں، اس لئے

تمام مہذب معاشروں میں نظام ہائے قانون میں بعض بنیادی مشابہتیں ہیں جو قانون کے داخلی تقاضوں کے وجود کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

مختصر بات یہ ہے کہ قانون ایک بامقصد عمل اور کوشش ہے اور اسی لئے مختلف قانونی نظاموں میں اصولی مشابہت اور تنظیم کا تسلسل ہوتا ہے۔ یہ تنظیمی تسلسل ایسا ہوتا ہے جس کا ادراک اور انکشاف ہر مفکرِ قانون کر سکتا ہے اور وہی ان میں مطابقت اور یکسانیت کی نشان دہی بھی کر سکتا ہے۔ مفکرِ قانون جب ان حقیقتوں کا انکشاف کرتا ہے تو وہ خود اُس سائنس داں سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے جو مظاہرِ فطرت میں مطابقت اور یکسانیت کا سراغ لگا کر اُچھل پڑتا ہے۔ جب کوئی مفکرِ قانون اپنی فکر و نظر کے حقائق پر بار بار غور کرے گا تو اُسے اپنے افکار کے انکشافات سے ایک طرح کی انسیت پیدا ہو جائے گی اور وہ محسوس کرے گا کہ محض الکٹرون کی دریافت ہی نہیں بلکہ قانون کی تخلیق کا عمل بھی ایک قابلِ فخر کارنامہ ہوتا ہے۔

۴- قانونؔ کے اصلی مقاصد

"قانون پسند دانشوروں کا قول ہے کہ" قانون بذاتِ خود صحیح ہوتا ہے نہ غلط"
(ڈبلو- ایچ- آڈن)

"ہمیں ایک اچھے آئین کی توقع اس وجہ سے نہیں رکھنی چاہیے کہ اس کے مرتّب کرنے والے اخلاق پسند افراد ہیں- حقیقت اس کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ اچھے آئین کی وجہ سے ایک ایسے معاشرہ کے قیام کی اُمید کی جاتی ہے جو با اخلاق افراد پر مشتمل ہوگا۔" (ایمیو نوئیل کانٹ)

ہومز (Holmes) کے فلسفۂ قانون کا مرکزی خیال یہ تھا کہ قانون اور اخلاقیات میں واضح امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے، تاہم وہ اپنے مقالے "دی پاتھ آف لا" "The path of the law" میں لکھتا ہے:-

"میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی اور ایسا وسیع تر نقطۂ نظر ممکن نہیں جس کے تحت قانون اور اخلاقیات کا امتیاز ثانوی اہمیت اختیار کرلیتا ہے، ریاضیات میں بھی یہی ہوتا ہے کہ "لا انتہا" کے تصور پر پہنچنے کے بعد تمام ریاضیاتی امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔" ؎۲

اب ضرورت یہ ہے کہ نقطۂ منتہا کا عنصر ذہن میں رکھے بغیر اس بیان کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ آیا ایسے حالات پیش نہیں آتے جن میں وہ امتیازات

؎۱ اصلی قانون بالعموم "حقوق" منضبط کرتا ہے۔ "ضابطہ" صرف طریقہ کار۔
؎۲ ملاحظہ ہو ۱۰- ہارورڈ لا ریویو صفحہ ۴۵۷ (۱۸۹۷ء)

جن پر پہلے اصرار کیا گیا تھا ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اب تک جن دو بڑے امتیازی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں، یعنی اخلاقِ فرائض اور اخلاقِ طبعی کا امتیاز، اور قانون کی داخلی اور خارجی اخلاقیات کے درمیان امتیاز۔

قانون کے اصلی مقاصد اور داخلی اخلاق

میں نے قانون کے داخلی اخلاق کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ وہ بہت سی صورتوں میں قانون کے اہم اور ٹھوس مقاصد سے بے نیاز سا ہوتا ہے بلکہ دراصل بیشتر مقاصد کی تکمیل میں مدد دیتا ہے۔ آجکل ایک اخلاقی مسئلہ بہت زیادہ قابلِ بحث بنا ہوا ہے اور وہ ضبطِ تولید کا مسئلہ ہے۔ اب یہ بات تو ظاہر ہے کہ قانون سازی میں جو اندرونی اخلاق اور ضابطہ ملحوظ رکھنا ہوتا ہے وہ اس مسئلے کے حل کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہ بھی واضح ہے کہ کوئی بھی نظامِ قانون، خواہ اس میں ضبطِ تولید کی ممانعت کے لئے یا حوصلہ افزائی کی غرض سے قاعدے بنائے گئے ہوں، قانون سازی کے اندرونی ضابطوں کو ملحوظ رکھنے سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو مگر اصولِ قانون سازی کو مقصد سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ لیکن اگر قانون کی داخلی اخلاقیات سے بہت سے ٹھوس مقاصد کو تائید ملتی ہے یا تقویت پہنچتی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ قانون سازی کے اہم تقاضوں کو زک دینے والا کوئی بھی مقصد اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض حالات میں یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ضبطِ تولید پر قانونا بندش لگائی جائے تو اس سے قانون سازی کے اُصول ہی متاثر ہونے لگیں۔ اگر ضبطِ تولید کے آلات کی فروخت پر پابندی

لگانے والے قوانین محض اُصولی طور پر کتابوں ہی میں محدود اور محفوظ رہتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ وہ نہ تو نافذ کئے جائیں گے اور نہ کئے جا سکتے ہیں تو اس صورت میں ایسا قانون، اصول قانون سازی کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے اور اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ یہی اندازِ عمل دوسرے قوانین کے اعلان و نفاذ کے سلسلے میں بھی اختیار نہیں کیا جائے گا۔ بدقسمتی سے سیاست دانوں کی یہ ایک عام چال ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک طبقے کو ہموار اور خوش کرنے کے لئے قانون پاس کرا دیتے ہیں اور دوسرے طبقے کی خوشنودی اس طرح حاصل کر لیتے ہیں کہ ان قوانین پر عمل نہیں ہونے دیتے۔ یہ قانون سازی کے ضابطے اور قانون کے اندرونی اخلاق پر کڑی ضرب ہے۔

اس باب میں ہم عام طریقے پر اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قانون کی داخلی اور خارجی اخلاقیات کا عمل اور ردِّ عمل کیا ہوتا ہے۔ اس تجزیے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے خلاف ایچ۔ ایل۔ اے ہارٹ نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی تشریح کرتا چلوں۔ اپنی کتاب "قانون کا تصور" (The Concept of Law) میں انھوں نے قانون اور اخلاقیات کے باب میں تحریر کیا ہے:-

"اگر قانونی ضابطوں کے ذریعے سماجی کنٹرول کے عمل کو جاری رکھنا مقصود ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ ضابطے بعض شرائط پوری کرتے ہوں۔ یہ ضابطے قابلِ فہم ہونے چاہئیں اور بیشتر لوگوں کے لئے عمل کے قابل ہونے چاہئیں اور ان کا نفاذ عام حالات میں زمانۂ سابق سے نہیں ہونا چاہیئے البتہ استثنائی صورتوں میں ایسا ہو سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ضابطے کی یہ خصوصیات، انصاف کے تقاضوں سے گہری مطابقت رکھتی ہیں اور

قانون داں حضرات ان ہی کو قانون سازی کے اصولوں کی پابندی یا "قانونیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ البتہ نظریہ "حکم بمنزلۂ قانون" کے ایک نقاد نے قانون سازی کی ان لازمی شرائط میں کچھ ایسی چیزیں دیکھ لی ہیں جس سے قانون اور اخلاق کے تعلق کا سُراغ ملتا ہے اور اس نقاد کا کہنا ہے کہ انھیں "قانون کا داخلی اخلاق" کہنا چاہیے۔ اب اگر قانون اور اخلاق کے تعلق کا یہی کچھ مفہوم ہے تو ہم اس خیال کو تسلیم کر سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ تعلق بہ دقت ہی قائم ہوتا ہے۔"

اس آخری جملے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ قانون کے داخلی اور خارجی اخلاقیات کے عمل اور ردِ عمل سے انکار کرنے کی نہایت واضح مثال ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں یہ کچھ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں۔ کیا ہارٹ صاحب صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تخیل کا دائرہ وسیع کر کے ہم ایک ایسے مطلق العنان بادشاہ کا تصور پیش کر سکتے ہیں جو نہایت قبیح مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہے لیکن ساتھ ہی وہ "قانون سازی کے داخلی اخلاق اور اصول کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہتا ہے۔ کیا ان کے خیال میں قانون اور اخلاق کا تعلق اس قدر بعید ہے۔ اگر یہ بات ہے تو یہ بات اس کتاب کے دائرۂ بحث سے خارج ہونی چاہیے جس کا انھوں نے نام "قانون کا تصور" رکھا ہے اور جسے زندگی کے اخلاقی مسائل سے لازماً بحث کرنی چاہیے۔ کیا ہارٹ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تاریخ میں ایسی حکومتوں کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جنھوں نے انصاف کا خون روا رکھا اور انسانی فلاح و بہبود سے حد درجہ بے نیازی برتی لیکن اس کے ساتھ ہی

لہ "حکم بمنزلۂ قانون" یعنی اقتدارِ اعلیٰ جو حکم دے وہ قانون ہے۔ "یہ سماجی قوت کے اظہار کا نام قانون ہے" کے نظریہ کا ہی نام ہے۔ اس نظریہ کے جس نقاد کا ہارٹ نے تذکرہ کیا ہے وہ اس کتاب کے مصنف فلر صاحب ہیں۔ ملاحظہ ہو "دی کنسپٹ آف لا" ص ۲۰۲

ساتھ وہ قانون کے داخلی اخلاق اور میرے بیان کردہ قانون سازی کے اصولو سختی سے پابند رہیں. اگر ہارٹ کا یہ خیال ہے تو انہیں تاریخ سے ایسی مثالیں پیش کر کے ہمیں شکریے کا موقع دینا چاہیے کیونکہ اسی طرح مفید بحث کی جا سکتی ہے.

ہارٹ کا خیال ہے کہ قانونیت کے مسائل پر محض سرسری توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے، اور اُن کے اس خیال کی اہمیت اور نوعیت صرف اُن چند جملوں سے نہیں ہوتی جن کا میں نے حوالہ دیا ہے بلکہ مجموعی طور پر اُن کی پوری کتاب میں اس کی تفصیل دیکھنی چاہیے.

ہارٹ نے "فطری قانون (Natural Law) کے نظریے میں عقل و شعور کی کارفرمائی" کے عنوان کے تحت جو بحث کی ہے اس میں قانون کے ٹھوس مقاصد پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے اور انگریزوں کے اعلیٰ روایتی قانونِ اساس (Fundamental Law) کو نظر انداز کر دیا گیا ہے. حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی ایسی روایت ہے جو قانون سازی کے قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے بعد جب وہ "نظامِ قانون کے عوارض" کے عنوان سے بحث کرتا ہے تو اس کی بحث اس سوال کی سطح تک گر جاتی ہے کہ "اقتدارِ اعلیٰ بہر حال اقتدارِ اعلیٰ ہے".

بحث کی آخری بات یہ ہے کہ جنگ کے بعد جرمنی میں نازیوں کے دور کی اخلاقی غلاظتوں اور قانونی بے قاعدگیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے جو مہم چلائی گئی اس پر ہارٹ تبصرہ کرتے وقت اس بات کا بالکل ذکر نہیں کرتا کہ ہٹلر کے دور میں قانونی اخلاقیات ہی نہایت ابتر ہو چکی تھی — مختصر یہ کہ ہارٹ صاحب اپنی بحث اور تجزیے میں یہ تو مانتے ہیں کہ اس قسم کی کوئی چیز ضرور ہے جسے قانون کا داخلی

اخلاق کہہ سکتا ہے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علم اصول قانون کا یہ کوئی اہم جزو نہیں۔

ہارٹ کا یہ خیال جدید دور کے مفکرین قانون سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اب میں آئندہ بحث میں یہ چاہوں گا کہ قانون کے داخلی اخلاق اور فلسفۂ قانون کے دوسرے اہم مسائل کو مربوط کرنے والے عوامل کی نشاندہی کی جائے۔

با اصول قانون سازی اور اُس کی تاثیر

میں دوسرے باب میں اس امر کی کافی وضاحت کر چکا ہوں اور اس دلیل کو دُہرانا ضروری نہیں کہ قانون کا داخلی اخلاق جس چیز کو کہا گیا ہے وہ کوئی ایسی شے نہیں جسے قانون میں اضافہ کہا جائے یا اس پر مسلط کر دیا جائے بلکہ اصل یہ ہے کہ قانون کی قوت میں داخلی اخلاق کی پابندی کو بڑا دخل ہے۔ یہ بات قابل قبول ہو تو پھر پہلی شرط یہ ہے کہ اچھے قانون کے لئے قانون آداب کا لحاظ ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی ہوشیار اور ماہر بڑھئی چوروں کے کام آنے والی جھگی اور یتیم خانے کی چھت یکساں مہارت اور چابک دستی سے تیار کرے گا۔ لیکن یتیم خانے کی تعمیر میں مدد لینی ہو تو پھر بڑھئی کا فقط بڑھئی ہونا کافی نہیں بلکہ اگر اس کے اوزار اچھے ہیں اور وہ اپنے فن میں مہارت رکھتا ہے تب ہی بہتر چیز تیار کر سکے گا۔ اسی طرح آداب قانون سازی کا لحاظ رکھنے سے اچھا قانون اور بھی مؤثر اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

فرض کیجئے کہ بڑھئی نایاب ہیں تو ہم سب سے پہلے کیا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ ہم مکان، اسپتال یا یتیم خانے کا نقشہ اور ڈیزائن تیار کرنے اور اس کے اچھے بُرے پہلوؤں پر بحث کرنے کے بجائے پہلے بڑھئی کی تلاش کریں گے اور اُسے کام

سکھائیں گے۔ بالکل اسی مفہوم میں ابھی تک دنیا کو قانون کی زیادہ ضرورت ہے، بہ نسبت اچھے قانون کے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امریکی اعلانِ آزادی میں شاہ انگلستان پر جو الزامات لگائے گئے اُن میں نہ صرف غیر منصفانہ قوانین نافذ کرنے کا الزام شامل تھا بلکہ اتنی ہی شدومد کے ساتھ یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ وہ "غیر منصفانہ قانون" چلاتا تھا۔ "اُس نے ایسے قوانین کی منظوری دینے سے انکار کر دیا جو مفادِ عامہ کے لئے اہم اور ضروری تھے .... اس نے اپنے گورنروں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ ضروری اور اہم معاملات کے طے کرنے کے لئے قانون نہ بنائیں ...... اُس نے نمائندہ ایوانوں کو اکثر معطل اور منسوخ کر دیا ہے، اور عرصے تک دوسرے ایوانوں کو منتخب ہونے سے روک رکھا، اُس نے عدالتی اختیارات دینے والے قوانین کی منظوری دینے سے انکار کیا، اور انصاف کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اُس (معناً) نے امریکہ کی حکومت سے دست بردار ہو کر ہمیں بے آسرا چھوڑ دیا۔ کیونکہ ہمارے خلاف جنگ چھیڑ دی"

—— جس زمانے میں یہ الفاظ لکھے گئے تھے امریکی عوام نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں مصروف تھے —— امریکہ والے اِس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ ہم نے اپنے برطانوی اتالیقوں سے قانون کی ضرورت اور اہمیت سمجھ لی تھی اور اس کی صداقت اور قوت کے قائل تھے ——

آج دنیا انصاف کے لئے پریشان ہے لیکن وہ اس قسم کے تلخ تجربے سے نہیں گزری۔ اسی دور میں یہ حقیقت بھی ہمیشہ سے زیادہ واضح ہو کر رہی کہ قانون محض ایک سماجی قوت کا مظہر نہیں ہوتا ہے۔ اس دور میں حق اور قانون کی محض یہی تعریف قبول کرنا بہت پُر خطر تھا کیونکہ پھر ہر زور آور سرچشمۂ قانون بن جاتا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس سیدھی سی بات پر اس قدر زور دے رہا ہوں کہ قانون کے مؤثر ہونے کے لئے قانون اخلاقیات سے وابستگی لازم ہے، میں اس وجہ سے اس پہلو پر اتنا زور دیتا ہوں کہ اکثر جہاں اس کی انتہائی اہمیت اور ضرورت ہوتی ہے، اِس پہلو کو بڑی سرسری طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مَیں یہ عرض کروں گا کہ اس کی ایک قابلِ ذکر مثال خود ہارٹ صاحب کی وہ بحث ہے جو اپنی کتاب میں اُنھوں نے "نظامِ قانون کی خرابیاں" والے باب میں کی ہے۔ انھوں نے جن صورتوں سے بحث کی ہے اس سے یا تو قطعی با اختیار اقتدارِ اعلیٰ ایک نزاعی معاملہ اور غیر معین معلوم ہوتا ہے۔ یا قزاقی اور غنڈہ گردی کے مقابلے میں منظم قانون کی ناکامی دکھائی گئی ہے اور "حکومت" کا وجود ہی ساقط کر دیا گیا ہے۔ یہاں بھی ہارٹ نے قانون کو اس کے ظاہری سرچشمۂ نفاذ کی روشنی میں دیکھنا چاہا ہے اور اس بات پر توجہ نہیں دی کہ قانون ایک پیچیدہ عمل ہے جس میں کامیابی کے کئی مرحلے اور درجے ہو سکتے ہیں۔ اس نے اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ قانونی قوت کا کوئی واحد ذریعہ اور سرچشمۂ نفاذ ایسا بھی ہو سکتا ہے جسے عوامی قبولیت مسلسل حاصل رہی ہو لیکن اس قوت کا استعمال غلط طریقوں پر یا بد دیانتی سے کرنے کی وجہ سے مؤثر نظامِ قانون قائم ہی نہ ہو سکے۔ اس بات کا بھی اعتراف نہیں کیا گیا کہ ہر نظامِ قانون میں، خواہ وہ کتنا ہی مثالی نظام کیوں نہ ہو، بعض خامیاں بہر حال رہ جاتی ہیں اور ان کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی ایک قانونی قوت کے رسمی منبع سے دوسرے کو اختیارات منتقل ہونے کی صورت پیدا ہو تو بھی قانونی اخلاقیات کے مسائل کو نظر انداز کر کے کوئی حقیقت پسندانہ نظام پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اکثر قانون کے تحت قائم شدہ باضابطہ حاکم تبیں قانون

ہی کے نام پر توڑ دی گئیں۔ غیر قانونی انقلاب کے خطرہ کی وجہ سے قانون پسند حکومت کے انسدادی اقدامات میں بھی قانونیت کا برقرار رکھنا اکثر مشکل ہو جاتا ہے[۵]۔ اگر صرف یہ کہہ دیا جائے کہ شروع میں پہلا ایکٹ ہوا اور پھر دوسرا ایکٹ سامنے آیا۔ تو تاریخ کے حقائق اور عوامل جو اس وقت رونما تھے اُن کا صحیح تصور اور نقشہ نظروں کے سامنے نہیں آتا۔ اس لئے "مقتدرِ اعلیٰ کا حکم قانون ہے" یہ بڑا جامد سا نظریہ قرار پاتا ہے۔

قانون اور انصاف

اکثر اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ "قانون اور انصاف میں گہری مطابقت اور مفاہمت ہوتی ہے، خود ہارٹ نے بھی واضح طور پر اسے تسلیم کیا ہے۔ اس مطابقت کی وجہ یہ ہے کہ دونوں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ قانون اور انصاف دونوں کے تقاضے مسلّمہ اصول اور ضابطے کے تحت پورے کئے جاتے ہیں۔ قانون کے داخلی اخلاق کا یہ تقاضا ہے کہ قاعدے بنائے جائیں اور ان قاعدوں اور ضابطوں کی تشہیر کی جائے اور ان کا نفاذ کرنے والے عملاً ان کا احترام کریں اور ان کے پابند رہیں، جہاں تک قانون کے خارجی مقاصد کا تعلق ہے، یہ تقاضے اخلاقاً بالکل فطری اور لازمی معلوم ہوتے ہیں، تاہم جس طرح اچھے قانون کی پہلی شرط خود قانون ہے اسی طرح حقیقی انصاف کا کوئی مفہوم بھی اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب یہ طے ہو کہ مسلّمہ اصولوں کے مطابق ہی عمل درآمد کیا جائے گا۔ اگر کوئی غیر قانونی اور غیر محدود قوت اور اختیارات والا اپنے احکام اس طرح جاری کرتا رہے کہ وہ غیر متوقع ہوں

---

[۵] یہاں ۱۹۵۳ء کا وہ زمانہ یاد کیا جا سکتا ہے جب مرحوم غلام محمد گورنر جنرل اور پہلی آئین ساز اسمبلی کے باہمی اختلافات ان احکام کی صورت میں رونما ہوئے جن کے ذریعہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اور اُن کی نوعیت اور وقت کے بارے میں کچھ کہا نہ جاسکتا ہو اور اُن احکام و قوانین سے انسانی عمل میں وقت بے وقت مداخلت ہوتی ہو تو اسے اس مفہوم میں غیر منصفانہ کہا جائے گا کہ وہ واضح اور مسلّمہ اصول کے تحت عمل نہیں کر رہا ہے کسی اور مفہوم میں اسے غیر منصفانہ کہا جا سکتا۔ البتہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی پوشیدہ اور ناجائز مقصد کے تحت یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے تو بات مختلف ہو جائے گی۔ اچھے اور منظم نظام قانون کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ عوام کو یہ بتا دیتا ہے کہ ان کے طرزِ عمل کو جانچنے پرکھنے اور ان میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے کن اصولوں کے تحت کام کرے گا تاکہ لوگ قانون کے مقصد اور طریقۂ کار سے واقف ہیں اور اپنی راہِ عمل متعین کر سکیں۔

عام طور پر یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ جرمنی میں نازیوں کے دور میں ان کے اپنے مقاصد کو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے کیا ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں بہت سی جرمن دوکانوں پر ایک بورڈ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ "Judisches Geschaft"

کسی قانون کے تحت ایسا بورڈ لگانے کی پابندی نہیں تھی۔ یہ بورڈ نازی پارٹی کے کارکنوں کی "درخواست" پر لگا دئے جاتے تھے، یہ لوگ اس قسم کے بورڈ مناسب جگہوں پر لگانے کے لئے دوکانداروں کو تقسیم کرتے پھرتے تھے۔ اس طریق کار کی وضاحت جرمن شہری یوں کرتے تھے کہ اگر تشہیر اور عام اعلان کے ذریعہ باضابطہ قانون نافذ کیا گیا تو غیر ملکوں میں اس قسم کے قوانین کے نفاذ پر نکتہ چینی کی جائے گی، یہ چال کامیاب بھی رہی۔ جب غیر ملکیوں کی آمد کا کوئی موقع ہوتا مثلاً کوئی تقریب یا میلہ تو پارٹی کے کارکنوں کی دوبارہ "درخواست" پر یہ بورڈ ہٹا دئے جاتے تھے۔ برلن میں ہر وقت غیر ملکیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس لئے وہاں

ایسے بورڈ لگائے ہی نہیں گئے۔ اس کے بجائے یہودی دکانداروں کو ہدایت کی
گئی تھی کہ اپنی دکانوں کی دیواروں پر ایک نمایاں قسم کا رنگ استعمال کریں اس
رنگ کے بار بار استعمال پر غیر ملکیوں کی نظر پڑتی ہوگی لیکن کبھی کبھی آنے والے لوگ
اس کی اہمیت سے ناواقف ہی رہتے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایک خاص حکم اور قانون
کے تحت یہ کچھ ہو رہا تھا لیکن اس قانون کا کبھی علانیہ نفاذ نہیں کیا گیا۔

خود امریکہ میں بھی بعض سرکاری اداروں کے طریق کار ایسے اصولوں کے تابع
ہوتے ہیں جن کی نہ تو کبھی اشاعت کی جاتی ہے اور نہ وہ تحریر میں لائے جاتے ہیں۔
بعض اوقات یہ قاعدے بالکل بے ضرر ہوتے ہیں اور سوائے اس کے کہ شہریوں
کو اس ادارے سے معاملہ کرنے میں کچھ دشواری ہو، اور کوئی خاص فرق نہیں پڑتا
لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ پوشیدہ ضابطے نہایت مضر اور خطرناک ہوں، کچھ ہی
عرصہ ہوا۔ بوسٹن میں ایسے ہی ایک مہلک ضابطے کا انکشاف ہوا۔ پتہ چلا ہے کہ جب
کسی کو ایک رات بھر کے لئے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے تو عام قاعدہ یہ ہے
کہ اس سے ایک کاغذ پر دستخط کرائے جاتے ہیں جس میں اس کی گرفتاری اور نظر بندی
سے تعلق رکھنے والے اقدامات کے سلسلے میں پولیس کو تمام شہری ذمہ داریوں
سے بری قرار دیا جاتا ہے۔ حراست سے نکلنے کے لئے اس کاغذ پر دستخط کرنا شرط
ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے پولیس افسروں نے نہایت دیانت اور شرافت
سے اس طریق کار پر عمل کیا ہے اور کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا اور اسے باضابطہ
سمجھا لیکن اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی قانون ساز ایسا بھی
ہوگا جو علانیہ قانون کے ذریعے اس طریق کار کو نافذ کرنے کا حامی ہو۔

ایک تک میری بات کا مفہوم تو صرف یہی ہے کہ قانون اور انصاف
میں تعلق کا سبب یہ ہے کہ قاعدوں اور ضابطوں کی تشہیر کر دی جاتی ہے

تاکہ عوام اس کی صداقت اور درستی کے قائل ہو جائیں۔ لیکن دراصل اس تعلق کی جڑیں اور گہری ہیں۔ اگر کسی شخص کو صرف اپنے ہی ضمیر کے سامنے جواب دہ ہونا ہو تو بھی وہ ذمہ داری زیادہ محسوس کرے گا اگر اسے یہ بتانا پڑ جائے کہ وہ کن قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق کام کر رہا ہے۔ بہت سے صاحبِ اختیار لوگ اپنے ماتحتوں کے ساتھ غیر مساویانہ برتاؤ روا رکھتے ہیں اور ان کا یہ رویہ بھی غیر تحریری ضابطے کی شکل اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر شکل میں یہ کہنا مشکل ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس نامناسب حقیقت کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ کہاوت ہے کہ دنیا میں گھونسے مار کر اتنی زیادہ ناانصافیاں نہیں کی گئیں جتنی کہنی مار کر کی جاتی رہی ہیں۔ جب مُکّہ مارتے ہیں تو اُس کا مقصد واضح ہوتا ہے اور ہم اپنے اور دوسروں کے سامنے اس کے جوابدہ ہوتے ہیں، لیکن ہماری کہنی تو آگے پیچھے چلتی ہی رہتی ہے' اگر ہم بس میں بیٹھ کر کہنی ہلاتے رہیں اور اپنے ساتھ بیٹھنے والے کو اس کی سیٹ سے دُور سرکاتے رہیں، تو بھی ہم صاف بچ سکتے ہیں کیونکہ یہ عمل آسانی سے قابلِ گرفت نہیں ہو سکتا۔ قانون پسندی کے اُصولوں پر کاربند رہنے والے حکمران کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ نہ صرف مُکّے مارنے بلکہ کہنی مارنے کی حرکت پر بھی نگاہ رکھے اور اس کی ذمہ داری قبول کرے۔

قانونی اخلاقیات
اور غیر واضح بُرائیوں کے انسدادی قانون

یہ مطالبہ بظاہر بالکل فطری معلوم ہوتا ہے کہ قوانین کے مقاصد کے حصول کے لئے انھیں سادہ اور قابل فہم الفاظ میں وضع کیا جائے۔ اگر ہارٹ کے الفاظ میں قانونی اخلاقیات کا کوئی اُصول شدید ناانصافی کا موجب بھی ہو سکتا ہے تو وہ یہی معلوم ہوتا ہے ——— تاہم اگر کوئی قانون ساز بعض بُرائیوں کو دُور کرنا چاہتا ہے لیکن اپنے ہدف کی صحیح اور واضح نشان دہی نہیں کر سکتا تو ظاہر ہے کہ اسے واضح قانون وضع کرنے میں دُشواری ہو گی۔ میں اس نکتے کی پہلے بھی اس موقع پر وضاحت کر چکا ہوں جہاں میں نے ایسے قوانین سے بحث کی ہے جو اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ بُرانے زمانے کے مینڈے پھر واپس نہ آجائیں لیکن وہ تمثیل احمقانہ قانون سازی کی تھی نہ کہ سراسر ناانصافی کی۔

ان قوانین کا معاملہ بالکل الگ ہے جو نسل کی بنیاد پر مرتّب کیے جاتے ہیں۔ آجکل کے زمانے میں اس کی مثال جنوبی افریقہ سے دی جاتی ہے وہاں کی حکومت قانون کی بڑی پابند ہے لیکن ایسے قوانین بناتی ہے جو ظالمانہ اور غیر انسانی ہوتے ہیں۔ دنیا کا یہ خیال یوں پیدا ہوتا ہے کہ اقتدار کے ادارے اور اُصول قانون سازی سے وفاداری کے مابین فرق نہیں کیا جاتا۔ جنوبی افریقہ میں جس قانون سازی کے نظام کے سہارے نسلی امتیاز روا رکھا جاتا ہے اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ وہاں قانون کے داخلی اخلاق کے تقاضوں سے سر تجاوز گردانی کی جا رہی ہے۔

جنوبی افریقہ میں جو نسلی قوانین نافذ کئے گئے ہیں ان کا توجہ اور غیر جانب داری کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد مندرجہ ذیل تبصرے پیش کیے جاتے ہیں :-

قوانین تضاد سے پُر ہیں، چنانچہ مختلف قوانین کی رُو سے ایک ہی شخص کو مختلف نسلوں کے طبقے میں شمار کیا جا سکتا ہے ....

۲۲۔ مارچ ۱۹۵۷ء کو وزیر داخلہ نے بیان دیا تھا کہ مردم شماری کے ڈائریکٹر کے دفتر میں تقریباً ایک لاکھ ایسے آدمیوں کا معاملہ زیر غور ہے جن کی نسل کا فیصلہ نہ ہو سکا اور وہ کسی بھی نسل میں شمار کئے جا سکتے ہیں ...... جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ قانون میں یکسانیت اس لئے نہیں ہے کہ نسل کی تعریف الگ الگ کی گئی ہیں اور اس میں کسی معقولیت سے کام نہیں لیا گیا۔ آخری بات یہ کہ مجلس قانون ساز ایسی چیزوں کی تشریح کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو ناقابل تشریح ہیں۔ ———— حد یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کا جج بھی مروجہ قوانین کی یک طرفہ تعبیر اور تشریح کرتے وقت یہی تکلیف محسوس کرتا ہوگا اور اگر اس میں اپنے پیشے کے اصولوں اور تقاضوں کا احترام باقی ہے تو اس کا قانونی ضمیر ضرور تامل کرتا ہوگا حالانکہ وہ اپنی نجی زندگی میں ان تمام تعصبات کا علمبردار ہے جن کی بدولت ایسے قوانین وجود میں آئے جن کی روشنی میں اُسے انصاف کرنے کا فرض سونپا گیا ہے۔ تاہم یہ سمجھنا درست نہیں کہ ایسی غلط کاریاں صرف جنوبی افریقہ کے نظامِ قانون میں پائی جاتی ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں کیلیفورنیا کے سپریم کورٹ نے ایک ایسے قانون کو خلاف آئین قرار دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "کسی گورے شخص کی شادی نیگرو، حبشی یا منگولیا اور ملایا کی نسل والوں کے ساتھ کرنے کا لائسنس جاری نہ کیا جائے۔" یہ قانون اس بنا پر بھی کالعدم

قرار پایا کہ یہ دستور کے اس تقاضے کے منافی ہے کہ "قانون واضح ہونا چاہیے اور اس کے معنی و مفہوم کو وہ لوگ سمجھ سکتے ہوں جن کے حقوق و فرائض پر اس کا اثر پڑتا ہو"۔ [۱]

امریکہ میں حصول قومیت کے قوانین میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو نسلی امتیاز کی بنا پر حقوق قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ اب سپریم کورٹ کو اس بحث میں خواہ مخواہ اُلجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی جیسا کہ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں ہو چکا ہے [۲] سپریم کورٹ ایک مقدمے میں اس قانون پر اپنا فیصلہ دے چکی ہے جس کی رُو سے صرف "گورے افراد" کو حقوقِ قومیت حاصل تھے۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ صرف رنگ کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک ہی نسل کے افراد کے رنگ میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ اس بندش کو اور جامع بنانے کی خاطر عدالت نے یہ تفسیر کی کہ گورے افراد سے مراد کاکیشین نسل کے لوگوں سے ہے۔ اِس عدالتی تشریح اور فیصلے کے چند ماہ بعد، اعلیٰ ذات کے ایک ہندو (برہمن) نے شہریت کے لئے درخواست پیش کی۔ اس کے وکیل نے یہ وزنی دلیل دی کہ علم الانسان کے ماہرین نے جن معنوں میں یہ اصطلاح استعمال کی ہے، اس کی روشنی میں برہمن مذکور کو کاکیشین قرار دیا جائے گا، اور اُسے قومیت کے حقوق ملنے چاہئیں ——— عدالت نے توجیہہ کی کہ "۱۷۹۰ء میں جن حضرات نے دستور مرتب کیا تھا وہ کاکیشین کی اصطلاح سے واقف نہ تھے اور علم الانسان میں یہ اصطلاح جس مفہوم میں استعمال کی گئی ہے وہ پُوری طرح واضح نہیں اور قانون کی زبان

---

[۱] ملاحظہ ہو بیپرز بنام شارپ ۳۲۔ کیلیفورنیا۔ ۲۔ ڈی ۔ ۱۱۷

[۲] یونائیٹڈ اسٹیٹس سٹیزن شپ ایکٹ۔ ٹائیٹل ۸۔ دفعہ ۱۴۲۲۔ ۲۶۰ اور یونائیٹڈ اسٹیٹس ۱۷۸ (۱۹۲۲ء) اور ۲۶۱۔ ۲۰۴ یونائیٹڈ اسٹیٹس ص ۲۰۴ (۱۹۲۳ء)

کے لئے اس کا سائنسی مفہوم لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ ایک اُلجھن دُور کرنے کے چکر میں دوسری اُلجھن مول لی جائے...... قانون بنانے والوں نے اسے مروجہ عام معنوں ہی میں استعمال کیا ہے اور صرف وہ لوگ شامل ہیں جنھیں ہم گوری نسل کہتے ہیں۔ اسی طرح کی دشواری اسرائیلی ہائی کورٹ کو اس قانون کی تشریح و تاویل میں پیش آئی ہے جس کی رُو سے ایسے تارکانِ وطن کو جو یہودی ہیں، اسرائیل میں داخلے سے خود بخود شہری حقوق مل جاتے ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء کو عدالت کی ایک بنچ نے بہ غلبۂ آراء یہ فیصلہ دیا کہ اس قانون کی نظر میں رومن کیتھولک پادری کو یہودی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کے وکیل کا کہنا تھا کہ مدعی کے والدین یہودی ہیں اس لئے وہ بھی نسلاً یہودی ہے، عدالت نے کہا کہ یہ تو درست ہے لیکن یہ معاملہ مذہبی قوانین سے تعلق نہیں بلکہ اسرائیل کے شہری قوانین سے تعلق رکھتا ہے اور اُس قانون کی رُو سے مدعی اب یہودی نہیں رہا کیونکہ وہ عیسائی مذہب قبول کر چکا ہے۔

قانونی اخلاقیات میں انسان کا مقام

اب میں ایک اہم ترین پہلو کی طرف توجہ کروں گا، اور یہ بتاؤں گا کہ وہ کون سی صورتیں ہیں جن میں قانونی اخلاقیات کے تقاضوں کا لحاظ رکھا جائے تو انسانی زندگی کے وسیع تر مقاصد کی تکمیل میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان قانون کے داخلی اخلاق کے لحاظ سے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ بہت سے اخلاقی مسائل اور معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے سلسلے میں قانونی اخلاق کو غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ البتہ خود انسان کے بارے میں یہ بے نیازی قائم نہیں رہ سکتی۔ انسان اور انسانی طرزِ عمل

کو قواعد اور ضوابط کا پابند بنانے کی کوشش کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اس نظریے کو مانتے ہیں کہ انسان ایک ایسا ذمّے دار فرد ہے یا ہو سکتا ہے جو قواعد و ضوابط کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا جواب دِہ ہوتا ہے۔

اگر قانون کے داخلی اخلاق سے انحراف کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ذمّہ دار فرد کی انسانی عظمت پر شک کیا گیا اور حرف لایا گیا۔ اگر آپ اس کے اعمال و افعال کو غیر اعلان شدہ اور اَن جانے قوانین کا تابع بنانا چاہیں یا اس سے ناممکن العمل باتوں کا تقاضہ کریں تو دراصل آپ یہ ظاہر کریں گے کہ اس کے احساسات ذمّہ داری وخود داری اور اس کی صلاحیتوں کا آپ کو کوئی لحاظ اور فکر نہیں۔ ہاں اگر آپ یہ تسلیم کرلیں کہ انسان ذمّہ دارانہ افعال کا اہل نہیں، پھر تو قانونی اخلاق کے وجود کا جواز ہی نہیں رہتا۔ ایسی نامناسب صورت میں یہ قابل بحث نہیں رہے گا کہ انسانی افعال کو غیر مطبوعہ اور اَن جانے قوانین کا تابع کیوں بنایا گیا۔ جب آپ اُسے ذمہ دار ہستی ہی نہیں مانتے تو اس کے ساتھ انصاف کرنے اور انصاف کے لئے منظم قوانین کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ مگر میرے نظریہ داخلی اخلاق قانون میں انسان کی عظمت و اہمیت برقرار رہتی ہے۔ آجکل بہت سے ایسے رویّے اور نظریات پائے جاتے ہیں جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان میں قوت ارادی نہیں ہے اور وہ ذمہ داری سے اپنے فرائض کو سمجھنے اور انجام دینے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ اس غلط فہمی کے مختلف اسباب ہیں اور جن خیالات کی بنا پر ایسا نظریہ پیدا ہوا ہے وہ ادنیٰ و اعلیٰ دونوں قسم کے ہیں۔ ایسے نظریات کی ایک لہر تو سائنس کی طرف سے آئی ہے، اس کے علاوہ معاشرتی علوم کے بعض مکاتیب نے بھی اس نظریے کی پرورش کی ہے۔ ہم یہاں ممتاز ماہر نفسیات بی۔ الف۔ اسکینر (B. F. Skinner) کا ایک

اقتباس پیش کرتے ہیں :-

"اگر ہم انسانی امور و معاملات میں سائنسی طریقے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو یہ فرض کرنا ہوگا کہ انسانی رویّہ قانونی اور بلحاظ حالات مقرر ہے، ہم کو یہ ماننا ہوگا کہ انسان کا عمل خاص حالات کے تابع ہوتا ہے اور اگر یہ حالات معلوم ہو جائیں تو انسانی عمل اور رویّے کے بارے میں پہلے سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ اس تصور کے مخالف ہیں کیونکہ پرانی روایات کے مطابق انسان کو آزاد اور خود مختار تصور کیا جاتا رہا ہے۔ مغربی تہذیب کے ماحول میں رہنے والے انسانی رویّے کے بارے میں سائنسی نظریات کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتے"۔

فرد کی آزادی اور خود مختاری کا تصور ہماری زبان و ادب کا جزو ہے اور ہمارے نظریات و عقائد پر اسی کی چھاپ ہے، عام طور پر لوگ اسی کو درست سمجھتے ہیں اور یہ روش اتنی فطری بن گئی ہے کہ کوئی اس کا تجزیہ بھی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس سائنسی تجزیہ نئی اور عجیب چیز معلوم ہوتا ہے۔

ہم انسان کے فطری اعمال و حرکات پر حرف گیری نہیں کرتے۔ مثلاً اگر کسی کو دوران وعظ کھانسی آجائے تو یہ ایک فطری عمل ہو سکتا ہے، البتہ اگر وہ دیدہ و دانستہ ایسی حرکتیں کرتا رہے تو اس کی ذمّہ داری اس پر ضرور عائد ہوگی۔ مثلاً وہ وعظ کے بیچ میں سرگوشیاں کرتا پھرے، یا کھانسی کے وقت بھی اپنی جگہ پر کھڑا رہے اور کھانستا ہی رہے۔ لیکن ان معاملات میں بھی مختلف حالات اور صورتیں سرگوشی کو جائز کر سکتی ہیں۔ بہر حال اس سے انسان کی آزادی اور خود مختاری کے نظریئے پر روشنی پڑتی ہے۔ ہجوم میں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ رشتے رابطے میں انسان کی کچھ ذمّہ داریاں ضرور ہوتی ہیں اور بعض ایسی باتوں کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے جن سے ذمّہ داری کا شعور پیدا ہو۔ لیکن جب غیر ذمّہ دارانہ

حرکتیں بھی بعض حالات میں قابلِ معافی ہوں تو ذمہ داری مشروط اور محدود ہوتی جاتی ہے[1]

یہ خیالات جو پیش کئے گئے ہیں سائنس کے زیرِ اثر آتے ہیں اور دوسروں کا تو ذکر ہی کیا خود پروفیسر اسکینر بھی یہ نہیں سمجھتے کہ انھیں انسانی اعمال کی مستقل بنیاد تسلیم کیا جاسکتا ہے، تاہم ان خیالات میں جزوی طور پر صداقت ضرور ہے۔ اِس بیان میں حالات کی "غلامی" کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے اور اس کے حدود متعین نہیں کئے گئے جس کی وجہ سے ایک ایسے رویے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جس میں ذمّہ داری کے تصور سے بے نیازی برتی جاسکتی ہے اور قانون کے بہت سے معاملات میں ذمّہ داری نمایاں طور پر مطلوب ہوتی ہے۔ خود پروفیسر صاحب نے بڑی جاں فشانی کے ساتھ جن مقاصد کے لئے اتنی بحث کی ہے وہ بھی اس تجزیے سے پورے نہیں ہوتے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پروفیسر صاحب محض ذمّہ داری کے تصوّر کے جواز پر شبہ نہیں کرتے بلکہ سماجی کنٹرول کا ایک متبادل طریقہ بتانا چاہتے ہیں۔ آسان لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کو یہ کہنے کے بجائے کہ وہ اچھا بنے، ہم ایسے حالات پیدا کرتے رہیں کہ وہ اچھا بن جائے۔ اِس تصور میں جو خامیاں یا خوبیاں ہوں، اس سے ایک اچھے قانون ساز کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایسے قوانین کی مدد سے کام کو آسان بنانا چاہتا ہے جن میں غلطی یا نیت کے ثبوت سے قطع نظر مجرمانہ ذمّہ داری کا یقین کیا جاسکے۔ بہ الفاظِ دیگر انسان کو ایک ذمّہ دار ہستی سمجھا جائے۔

میں نے کہا تھا کہ ذمّے داری کے تصوّر کو اُلجھانے میں بعض "نیک ارادے"

---

[1] ملاحظہ ہو "سائنس اینڈ ہیومن بی ہیویر" از بی۔ ایف۔ اسکنر (۱۹۵۳ء) صفحات ۶-۷، ۱۱۵-۱۱۶۔

والے لوگ شامل ہیں - اور یہ لوگ وہ ہیں جو قوانین فوجداری میں اصلاح پسندی اور مجرموں کی اصلاح کا نعرہ لگاتے ہیں . جیسا کہ فرانسیسی ایلین نے ثابت کیا ہے اگر اس نظریے کو غلط انداز سے بروئے کار لایا جائے تو قوانین فوجداری (جن کو زیادہ بہتر اور انسانیت نواز بنانا مقصود ہے) اور بھی بہیمانہ بن سکتے ہیں، قانون فوجداری کا واحد مقصد یہ لیا جائے کہ مجرموں کی اصلاح ہونا چاہیئے تو جرم کا صحیح تعین، ضابطۂ سزا کی مکمل پابندی جو فوجداری انصاف کی جان ہیں پس منظر میں رہ جائیں گے - اگر مدعا علیہ کو سخت ترین سزا بھی دی جا سکتی ہے کہ وہ سرکاری خرچ پر اپنی اصلاح کرلے تو پھر منصفانہ اور غیر جانبدارانہ مقدمہ چلانے کی زحمت اُٹھانے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے[۱]

پروفیسر ایلین نے اپنے مضمون کی اشاعت کے وقت جو اندیشے ظاہر کیے تھے، بعد میں ان کی تصدیق بھی ہو چکی ہے اور اس کا اظہار سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس کلارک کے ایک فیصلے میں ہوا ہے[۲] عدالت نے عام طور پر یہ مسئلہ اُٹھایا کہ آیا نشہ آور دواؤں کا عادی ہونا، آئین کی رُو سے جرم ہے جبکہ عادت اور لت غیر ارادی اور معصومانہ طریقے پر پڑ سکتی ہے - عدالت کے اکثر ججوں نے یہ رائے دی کہ اس طرح غیر ارادی طور پر نشہ کی حالت میں پایا جانا جرم نہیں ——— لیکن مسٹر جسٹس کلارک نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ دلیل دی کہ "متعلقہ قانون کو اصلاحی قانون ہی سمجھنا چاہیئے - چونکہ یہ امر مسلّمہ ہے کہ ریاست کسی بھی مدہوش کو اسپتال بھیج سکتی ہے تاکہ وہاں اس

---

[۱] ملاحظہ ہو ۵۰ - جرنل آف کریمنل لا اینڈ کریمنالوجی ص ۲۲۶/۲۳۲ (۱۹۵۹ء)

[۲] ملاحظہ ہو ۳۷۰ یونائیٹڈ اسٹیٹس ص ۶۶۹/۶۸۶ (۱۹۶۲ء)

کا علاج کیا جا سکے اس لئے میرے خیال میں ایسے آدمی کو چھ مہینے کے لئے جیل بھیجنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ وہاں بھی منشیات اس کی پہنچ سے باہر رہیں گی اور اس طرح اس کی اصلاح کا پہلو نمایاں رہے گا۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون فوجداری کے اس نظریے میں قانون کے کن اُصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کیا اصلاحی اقدامات کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ باضابطہ قوانین کے تابع ہوں اور قانون کے ذریعے ان کا نفاذ کیا جائے۔ اور پھر یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ کن حالات میں کس قسم کے اقدامات کی ضرورت پڑے گی۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ مخدوش حالات پیدا ہونے سے پہلے ہی اصلاحی اقدامات کر لئے جائیں خواہ مخواہ قانون کو اصلاح کا ذریعہ کیوں بنایا جائے جبکہ اس کا مقصد ہی الگ ہے۔ یہ یقین کرنے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ نشے کی علت کے بارے میں ہمارا رویہ غلط تھا اور یہ کہ طبّی اور اصلاحی اقدامات سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے بہ نسبت اس کے کہ انسداد کے لئے قوانین فوجداری کا نفاذ کیا جائے۔ لیکن اگر ایسا کوئی پروگرام کامیاب بنانا ہو تو اس کے لئے اصلاحی ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ مگر اصلاح کا یہ کام دوسرے اداروں کے حوالے کرنا جو دیگر مقاصد کے پیشِ نظر قائم کئے جاتے ہیں اور جن کے مقاصد متعین ہوتے ہیں درست نہیں ہے۔ آپ جیل کو اسپتال کہہ کر اسے اسپتال نہیں بنا سکتے، اسی طرح آپ فوجداری مقدمے کو ڈاکٹری معائنہ قرار نہیں دے سکتے کیونکہ یہ دونوں چیزیں الگ ہیں اور ان کے مقاصد الگ ہیں۔

قانون میں کچھ دوسرے رجحانات بھی ایسے ہیں جو شہریوں کو ذمہ دار افراد کے طور پر عمل کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ مثلاً محصولات کا معاملہ لیجئے۔ انسان ٹیکسوں کے جال میں گرفتار ہے اور اُسے قانون کے سہارے کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں ٹیکسوں کے ذریعے بہت سے مختلف مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان سب مقاصد کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ مثلاً ٹیکسوں کے

ذریعے کاروبار کے اُتار چڑھاؤ اور کاروباری طبقے پر قابو رکھا جا سکتا ہے' پیشہ ور جواریوں کی تخصیص و تعریف کی جا سکتی ہے' شراب نوشی اور شراب فروشی پر پابندی لگائی جا سکتی ہے اور خواتین غیر فطری بناؤ سنگھار پر کی جو گراں قیمتیں ادا کرتی ہیں اس میں تاجروں کے ساتھ حکومت بھی حصہ لگا سکتی ہے۔ ٹیکسوں کے ذریعے سفر کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے' وفاقی دائرۂ کار وسیع تر کیا جاتا ہے اور خدا جانے اس کے علاوہ کتنے مقاصد ہیں جو ٹیکسوں کے ذریعے پُورے کئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی آسان معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکس کے قوانین کے ذریعے بہت سے ایسے قانون شکنوں کو سزا دلائی جائے جو کسی اور جائز طریقے سے ممکن نہیں۔

ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ جو لوگ ان محصولات کی زد میں آتے ہیں وہ بعض اوقات بڑی اُلجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ آگے آگے جانے کیا کچھ ہونے والا ہے۔ بڑے بڑے دولت مندوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں اور وہ نفع اندوزی کے احساسِ جرم کے ساتھ ساتھ اس خوف سے بھی سہمے رہتے ہیں کہ کہیں حکومت ان کی زائد دولت پر ہاتھ نہ ڈال دے۔ غالباً اُنھیں یہ ڈر تو نہ ہوگا کہ حکومت ان پر اس بنا پر کوئی جرمانہ کر دے گی کہ ان کا وزن ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے لیکن یہ اندیشہ تو بہرحال لگا رہے گا کہ کہیں کل کوئی خصوصی ٹیکس اس بنا پر عائد نہ کر دیا جائے کہ حکومت کی امداد سے چلنے والی ہوا کمپنی کے جہازوں پر ان کے سفر کرنے کے اخراجات بہت زیادہ ہو سکتے ہیں' اس لئے ٹیکس لگے گا' باوجود اس حقیقت کے کہ وہ ہوائی سفر نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا آدمی خود سے یہ سوال کرے کہ آخر ٹیکس اور جرمانے میں فرق ہی کیا ہے۔ اگر سپریم کورٹ کا کوئی فاضل جج یہ کہا کرتا ہو کہ درحقیقت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو بھی ٹیکس دہندوں کو کیا خوشی حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ جو بار ان کے سر پر

حکومت نے ڈالا ہے اُسے تو برداشت کرنا ہی ہوگا۔

جدید نظام قانون کی ان بے اعتدالیوں پر میں زیادہ بحث نہیں کروں گا بلکہ میں یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ اگر ذمہ داری کا تصور کبھی ہمارے نظام قانون سے یکسر ناپید ہوگیا تو کس قدر نقصان عظیم ہوگا۔ قانون اور فیصلے کے عمل میں ہمیشہ سے دو ہی معیار پیشِ نظر رکھے گئے ہیں اور وہ ہیں غلطی اور نیت۔ قوانین فوجداری کے سلسلے میں اِن دو امور پر بڑی لمبی چوڑی فلسفیانہ بحثیں ہوتی رہی ہیں اور طرح طرح کے دلائل دئیے جاتے رہے ہیں ان میں وہ دلیل بھی شامل ہے جس کا تعلق انسانی ارادے کی آزادی سے ہے۔ لیکن معاہدوں، املاک اور سودوں کے سلسلے میں بھی اِن دونوں امور کا برابر کا حصّہ رہتا ہے۔ قانون کے جس شعبے اور دائرے میں بھی ان کا باریکی سے تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ بڑے ہی مشکل اور مخصوص نظریے کے رنگ اختیار کر لیتے ہیں لیکن اگر ہم اِن دونوں عوامل کو نظرانداز کردیں تو پھر ہمارے سامنے کوئی معیار باقی نہیں رہ جاتا اگر ان میں سے کسی کا ایک صحیح صحیح تعین نہیں ہوسکتا تو ہم اس کے قریب تر پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اگر یہ واضح نہ ہوسکے کہ اصل نیت اور منشا کیا تھا تو ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر فریقین کو اس صورت حال کا پہلے سے علم ہوتا جو اب پیدا ہوگئی ہے تو اس صورت میں ان کی نیت کیا ہوتی۔ اور جب کسی ایک فریق پر غلطی کا الزام لگانا مشکل ہو تو ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کس فریق کو اس کا بہترین موقع حاصل تھا کہ وہ نقصان کا تدارک کرتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیں گے کہ کون سا فریق غلطی یا جرم سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ جب یہ دو معیار بے سود ہوجائیں اور ان کے قریب مفروضات بھی کام نہ آسکیں تو کیا صورت رونما ہوتی ہے۔ ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب کسی معاہدے کی تکمیل میں رکاوٹ ہوتی ہے اور اس کی نوعیت بدل جاتی ہے،

اور اس کی وجہ کوئی خارجی واقعہ ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ تخت نشینی کے جلوس کے سلسلے میں ایسا معاہدہ ہوا ہے اور وہ تقریب منسوخ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح املاک کے قوانین میں بھی ہمارے جانے پہچانے اصول اور معیار اُس وقت بیکار محض ہو جاتے ہیں جب قدرت اس میں مداخلت کر دیتی ہے اور اپنا تسلّط جما لیتی ہے۔ مثلاً کسی دریا نے اپنا رخ بدل لیا جس کے سبب الف بیس ایکڑ زمین سے محروم ہو گیا اور یہ زمین ب کے حصے میں شامل ہو گئی۔ ایسی صورتوں میں فریقین مقدمہ پر ذمّہ داری نہیں ڈالی جاسکتی بلکہ وہ تو خارجی اور قدرتی عوامل کے سامنے بے بس افراد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم یہ سوال نہیں کر سکتے کہ الزام کس کے سر ہے؟ یا آخر اس معاملے میں ان کی نیت کیا تھی؟ چونکہ ان حالات میں ہمارے انصاف کے معیار بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں اس لئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ انصاف کا تقاضا کیا ہے؟ اس لئے ثابت ہوا کہ اگر ہم قانون کے سارے عمل میں انسان کو عمل کا مرکز اور ذمّہ دار قرار دینے کا نظریہ فراموش کر دیں تو پھر سارے قانونی مسائل اسی طرح کے بن جائیں گے جس طرح میں نے بیان کئے ہیں۔

مؤثر قانونی اقدام کے حدود کا مسئلہ

اب تک میں نے اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ قانون کی داخلی اخلاقیات اپنی خصوصیات کے اعتبار سے واقعی اس قابل ہے کہ اسے "اخلاقیات" ہی کہا جائے۔ میرے خیال میں اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حصول حق وانصاف کے لئے یہ اخلاقیات خواہ لازمی شرط نہ ہو لیکن یہ بہرحال ضروری ہے اور جب قانونی ضابطوں کا اندھا دھند استعمال کیا جاتا ہے تو یہ اخلاقیات مجروح ہوتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ قانون کی اخلاقیات میں انسانی فطرت

کا اور انسان کی ذمہ دارانہ حیثیت کا ایسا نظریہ سامنے آتا ہے جو قانون اور اخلاق دونوں کے لئے ناگزیر ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قانونی اخلاقیات کی حدود کیا ہیں۔ اس کے علاوہ ان حالات کا جائزہ لینا ہے جن میں اس اخلاق کا اطلاق غیر مناسب اور مضرت رساں ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہمیں ایک ابہام پر توجہ دینی چاہیئے جس کی وضاحت نہ ہونے سے ہمارا موضوع بحث گنجلک رہ جائیگا مِل نے "آزادی" کے موضوع پر اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"اِس مضمون کا مقصد ایک سادہ اصول کی نشاندہی کرتا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ آیا معاشرے پر حکمرانی کے لئے قانونی سزاؤں کی صورت میں عملی طور پر طاقت استعمال کرنا جائز ہے یا رائے عامہ کے اخلاقی دباؤ کی ضرورت ہے۔ اصول یہ ہے کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں کسی فرد کے خلاف طاقت استعمال کرنے کا واحد جواز یہی ہے کہ دوسروں کو نقصان اور ضرر سے بچایا جائے، خود اس کے اپنے مفاد کا تحفظ جبر کا جواز نہیں"۔

اِس کے بعد جیمس فنجیمز اسٹیفن (Jamas Fitzlames Stephen) نے مِل کے نظریے کی مخالفت کی، اور مِل کے "سادہ اصول" پر تنقید کرتے ہوئے بتایا کہ برطانوی شہریوں سے بزور طاقت ایسے ٹیکس بھی وصول کئے جاتے ہیں جن کی آمدنی برٹش میوزیم کو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو عوام کو کسی نقصان یا ضرر سے بچانے کے لئے نہیں بلکہ انھیں بہتر شہری بنانے کے لئے ہے۔

یہاں جو بات کہی گئی ہے اس میں ایک اُلجھاؤ ہے اور وہ یہ کہ قانونی احکامات اور سرکاری اقدامات میں کوئی امتیاز قائم نہیں رکھا گیا ——————

مِل کی دلیل یہ تھی کہ قانونی سزاؤں کی شکل میں طاقت کے ذریعے شہریوں کی اصلاح کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ حکومت ٹیکسوں کی آمدنی کو استعمال نہ کرے (اور ٹیکسوں کے لئے ضروری ہو تو مؤثر اقدامات کرنے ہی پڑتے ہیں، چاہے انجام کار اس کا مقصد شہریوں کی بھلائی اور بہتری ہی کیوں نہ ہو۔)

اسٹیفن صاحب نے مِل پر تنقید کرتے ہوئے جو ابہام اور اُلجھاؤ پیدا کر دیا ہے وہ اس گروہ کے علماء کے نقطۂ نظر میں عام ہے، ایک اور ماہر علم الانسان تحریر فرماتے ہیں:

"قانون کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مجلس قانون ساز کی حکمت اور ہمہ دانی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس بات کی کوششیں کی جا چکی ہیں کہ پوری کی پوری قوم کو قانون کی طاقت سے سنجیدہ اور باشعور بنا دیا جائے لیکن یہ سعی رائگاں ثابت ہوئی۔ نازی جرمنی میں قانون کو ہی آلۂ کار بنا کر پوری قوم کو خونخوار درندوں اور رہزنوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ کوشش بھی بے سود ہو گی۔ اٹلی کا ڈکٹیٹر اپنے ملک کے ذہین، پُرجوش اور امن پسند عوام کو جنگ باز بنانے کی فکر میں ہے، مذہب پرستوں نے اسی یونین کی بعض ریاستوں میں لوگوں کو قانون کے ذریعے خدا ترس اور متقی اور پرہیزگار بنانے کے جتن کئے۔ ایک بہت بڑے کمیونسٹ ملک نے یہ کوشش کی ہے کہ خدا، شادی اور خاندان کے تصوّرات ہی مٹا دیئے جائیں، اور یہ سب کچھ کسی نہ کسی قانون ہی کے سہارے کیا جا رہا ہے۔"

یہ رویہ اب بہت عام ہو گیا ہے کہ لوگ ہر قسم کے جائز و ناجائز سرکاری اقدامات کو قانون کا نام دے دیتے ہیں، اور جب کوئی شخص پاؤنڈ کے الفاظ میں "مؤثر قانونی اقدام کی حدود" سے بحث کرتا ہے تو یہ معلوم کرنا مشکل

ہو جاتا ہے کہ آیا ہم جنسوں کے جنسی تعلقات کے انسداد پر بحث ہوگی یا حکومت کے اس عمل پر کہ وہ کسی دریا کے پانی سے بجلی پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ حکومت کے اقدامات اور قوانین کے بنیادی تقاضوں میں غلط مبحث ہے اور کچھ نہیں۔

قانونی اخلاقیات اور اقتصادی وسائل کی تقسیم

اب تک تو ہم غلط فہمیوں کے ازالے میں اُلجھے تھے، اب اُن حالات کا براہِ راست حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جن میں قانون کی داخلی اخلاقیات اپنے حدود سے باہر نکل جاتی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ پہلے باب میں مَیں نے ایک مثال کے ذریعے بتایا تھا کہ ابتدائی سطح پر ایسے فرائض آتے ہیں جو معاشرتی وجود کے لئے انتہائی لازمی ہیں اور آخری منزل پر پہنچ کر ان مشکل اور اعلیٰ ترین اخلاقی مظاہروں کی تکمیل ہوتی ہے جو انسان کی معراج ہیں۔ میں نے بتایا تھا کہ اس راہ میں ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن یہی وہ نقطہ ہے جہاں فرائض کا دباؤ ختم ہو جاتا ہے اور اعلیٰ قدروں کی پاسداری شروع ہو جاتی ہے مَیں نے اس نقطے کے صحیح تعین کو فلسفۂ معاشرت کا بنیادی مسئلہ قرار دیا تھا۔ اگر فرائض کی سطح بہت نیچی ہے تو اُن خیالات کے زیرِ اثر جو طبعی اخلاق کی اعلیٰ ترین سطح کے متقاضی ہوتے ہیں، تو فرائض کی تعداد کم اور فرائض کا نظریہ خود بخود منتشر ہو جاتا ہے، اور اگر یہ سطح بہت زیادہ بلند ہو تو فرائض کی پابندیوں کی بدولت اعلیٰ قدروں کا شعور اُجاگر نہیں ہوتا ہے اور اعلیٰ اخلاق میں بھی عام فرائض کی طرح بجا آوری کی پابندی جمود اور اُکتاہٹ پیدا کرتی ہے اور ذوق کی تسکین فریضہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

میں نے اس مرحلے اور درمیانی نقطے کی جو مثال دی ہے وہ قانون سازی

کے لئے سرکاری اقدامات کا جائزہ لینے کے لئے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نچلی سطح پر حکومت ہوتی ہے جو انسانی عمل کو ضابطے میں رکھنے کے لئے فرائض کی ایک مسلّمہ فہرست تیار کرتی رہتی ہے، دوسرے سرے پر (مثال کے طور پر) صدر ہوتا ہے جو سینٹ کی منظوری اور مشورے سے غیر ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات قائم رکھتا ہے، اور یہ تعلقات ایسے ہوتے ہیں جو طے شدہ قاعدے اور ضابطے کی مدد سے نہیں استوار ہوتے کیونکہ ان تعلقات کے قیام اور استواری میں ایسے اختیارات سے کام لینا پڑتا ہے جو ہمارے قانون کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں، اور بڑی حد تک اعلیٰ معیارِ اخلاق کا مظہر ہونے چاہئیں۔[1]

دوسرے باب میں میں نے بتایا تھا کہ قانون کی داخلی اخلاقیات خود بھی بڑی حد تک طبعی اعلیٰ اخلاقیات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اس میں منفرد خصوصیت اس بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ اُسی کی بدولت قانونی فرائض کی تشکیل اور اُن کا نفاذ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ بلا امتیاز ہر قسم کے سرکاری اقدامات کے لئے قانون کی داخلی اخلاقیات ضروری نہیں ہوتی اور ہو بھی نہیں سکتی۔ فوج قانون کی پیداوار ہوتی ہے اور ایک لحاظ سے فوجی حکام سرکاری ملازم ہی ہوتے ہیں لیکن اس کا یقیناً یہ مطلب نہیں ہے کہ فوجی احکامات میں بھی لازماً اُن حدود اور احتیاطی پابندیوں کا لحاظ رکھا جائے جو مثال کے

---

[1] یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں اسلام اخلاقِ اعلیٰ کا مکمل اور مثبت نظریہ رکھتا ہے۔ سوائے اُن صورتوں کے جب جہاد واجب ہو جائے اور کسی بین الاقوامی معاملے میں اسلام جبر و تشدد اور جنگ کی اجازت نہیں دیتا۔ برعکس اس کے موجودہ زمانے میں اپنا نجی فائدہ ہر قوم کی بین الاقوامی پالیسی کا سنگِ بنیاد ہے۔ جنگ کو خارجی پالیسی کا ایک مسلّمہ مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام میکاولی کے اُصولوں کا قائل نہیں۔

طور پر عدالتی کارروائیں مناسب سمجھی جاتی ہیں۔ اقتصادی شعبے میں خاص طور پر یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اس قسم کی حقیقت پسندانہ روش سے گریز کیا جاتا ہے۔ یہ بات یاد دلانی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ میں نے پہلے باب میں یہ بتایا تھا کہ نجی اقتصادی سرگرمیاں قانون کے ایک محدود دائرے میں جاری رہتی ہیں، اور املاک اور معاہدات کے قانون اور اخلاق کی پابندیاں ان پر عائد رہتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سرگرمیاں ایسے اُصولوں کے تابع نہیں ہو سکتیں اور نہ ہونی چاہئیں جو قانون کی داخلی اخلاقیات سے مشابہ ہو۔ اقتصادی سرگرمیوں کا تو صرف ایک ہی عام اُصول ہوتا ہے اور وہ یہ کہ محدود وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے۔ یہاں تک کہ جب اقتصادی شعبے میں اس قسم کی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں کہ مزدوروں کی کم سے کم تنخواہ متعین ہونی چاہیے، ان کی ملازمتوں کا تحفظ ہونا چاہیے اور ثالث سے رجوع کئے بغیر کسی کو ملازمت سے برخاست نہ کیا جائے تو بھی اقتصادی عمل کا منتہائے مقصد یہی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ اس قسم کی پابندیاں اور ذمہ داریاں عائد کرنے سے اقتصادی حساب کتاب کا دائرہ کسی قدر سکڑ جاتا ہے لیکن اس کی نوعیت بہرحال وہی رہتی ہے۔

جب خود حکومت بھی براہ راست اقتصادی سرگرمیوں میں شریک ہو جاتی ہے تو بھی وہی اُصول کارفرما رہتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سوشلسٹ بنیادوں پر جو معیشت استوار کی جاتی ہے اس میں قیمتوں کا کوئی معقول نظام قائم نہیں ہو پاتا اور اس راہ میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جب تک ایسا نظام نہ ہو زیادہ سے زیادہ افادہ حاصل کرنے کا اصول بے اثر رہتا ہے۔ لیکن جب افراد اپنے وسائل کا مؤثر ترین استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ افادے کا اُصول باقی

رہتا ہے اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ قاعدے قانون کے ذریعے یہ مقصد پورا نہیں ہوا کرتا۔

ہماری معیشت مخلوط قسم کی ہے اس لئے جب ہم ان معاملات کو جو لازمی طور پر اقتصادیات سے تعلق رکھتے ہیں، قاعدے قانون کی زد میں لاکر حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو مذکورہ بالا معاشی اصول نظر انداز کرنے ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم شہری ہوا بازی کے بورڈ اور وفاقی مواصلاتی کمیشن کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ نظام قانون کے وجود کا تقاضا تو یہ ہے کہ اعلان شدہ قاعدے اور اصول پر عمل کیا جائے اور جن بنیادوں پر عمل کیا جائے ان میں ایک معقول مدت تک تسلسل ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر دلائل بے بنیاد رہ جاتے ہیں اور فیصلے کے تمام روایتی تحفظات (مثلاً مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان نجی ملاقاتوں کی ممانعت) اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔

دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اقتصادی شعبے کا منتظم ان تمام حالات پر نگاہ رکھے جو اس کے فیصلے سے متعلق ہو سکتے ہیں اور خود یہ طے کرے کہ کون سے حالات واقعی اس کے فیصلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالات کے بدل جانے کے ساتھ ساتھ یہ فیصلے بھی قابل تبدیلی ہونے چاہئیں۔ اس کے برعکس جج ان حقائق پر نظر رکھتا ہے جو فیصلے کے مسلّمہ اصولوں کے تحت پہلے ہی سے مقررہ قواعد کے تحت متعلق قرار پاتے ہیں۔ اس کے فیصلے میں محض وسائل اور صلاحیتیں ہی زیر نظر نہیں ہوتیں بلکہ وہ تو یہ بتاتا ہے کہ حق کیا ہے اور حقوق اتنے مستحکم اور اٹل تو ضرور ہونے چاہئیں کہ ایک عرصے تک ان کی صداقت استوار رہے اور وہ حالات اور وقت کے ساتھ ہی تبدیل ہوا کریں۔ چنانچہ جب ہم اقتصادی مسائل کو قانونی ذرائع سے (مثلاً ثالثی یا صنعتی عدالتوں کے ذریعہ) حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو مسائل اور ان کے حل کرنے کے طریقہ کار میں شدید بے آہنگی پائی جاتی ہے

جج ہنری جے فرینڈلی نے اپنے مقالات "وفاقی انتظامی اداروں۔ معیار کی

بہتر تشریح کی ضرورت" (The Federal Administrative Agencies)
("The Need for better Definition of Standards")

یں اس نظریے کی نہایت خوبی سے وضاحت کی ہے۔
اس نے لکھا ہے کہ کانگریس نے وفاقی مواصلاتی کمیشن (Federal Communication Commission) کے سپرد جو کام کیا ہے وہ انتہائی ہمت شکن نوعیت کا ہے۔
آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:-
"کانگریس نے کمیشن کو جو کام سونپا ہے وہ کچھ اس قسم کا ہے جیسے میٹروپولیٹن اوپیرا ایسوسی ایشن کے بورڈ سے یہ کہا جائے کہ وہ کھلی عدالت میں سماعت کرنے کے بعد اور پختہ سوچی سمجھی رائے قائم کرنے کے بعد اس امر کا فیصلہ کرے کہ اگر افتتاحی شب کو سدرلینڈ یا اور مشہور رقاصہ کا رقص پیش کیا جائے تو عوامی مفاد اور ضرورت پوری ہو سکے گی، یا پھر امریکی شوقیہ ممتاز رقاص فنکاروں کی خدمات حاصل کرنے سے یہ مقصد پورا ہو سکے گا۔ اگر اسی طرح کی دقتوں کو کئی سو گنا بڑھا دیں اور یہ بھی اجازت ہو کہ جو شخص بھی اس فنکاری اور اداکاری کے لئے چنا گیا ہو وہ اپنا فرض کسی اور مستند درخواست دہندہ کے حوالے کر سکتا ہے، بورڈ کو منع کر سکتا ہے کہ بہت سے لائق افراد کے مشورہ نہ لے۔ یہ بھی تسلیم کیجئے کہ فیصلہ کرنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ ان کی اس کارروائی سے وہ لوگ خوش یا ناخوش ہوں گے جو انھیں ان عہدوں پر برقرار رکھنے کے ذمہ دار ہیں اور فیصلے ہونے تک کے عرصے میں بھی یہ لوگ اپنے رویے اور رجحانات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان تمام امور کو ذہن میں رکھیں تو

لے ہومز لکچرز "ہنری جے فرینڈلی ہارورڈ یونیورسٹی پریس۔ ۱۹۶۲ء

آپ کو پتہ چلے گا کہ کمیشن کو جو کام سپرد کیا گیا ہے وہ اس کے لئے ایک تقریباً لاینحل مسئلہ ہے۔

فرینڈلی کے لیکچروں میں دوسری جگہوں پر یہ مسئلہ اتنی شدومد کے ساتھ تو نہیں بیان کیا گیا لیکن انھیں وفاقی انتظامی اداروں سے اصل شکایت یہ ہے کہ ان اداروں کے ضابطوں میں قانون کے داخلی اخلاق کا پوری طرح لحاظ نہیں رکھا گیا۔ فرینڈلی کا کہنا ہے کہ ان اداروں کو چاہیے کہ وہ وضاحت کے ساتھ بتا دیں کہ ان کے فیصلے کی بنیاد اور اس کا معیار کیا ہے، اس وضاحت کی ضرورت کے اسباب بتاتے ہوئے انھوں نے وہی باتیں کہی ہیں جو میں نے داخلی قانونی اخلاقیات کی پابندی کی ضرورت کے ضمن میں پیش کی ہیں۔ بلکہ فاضل جج نے ان میں کچھ مفید اضافے ہی کئے ہیں۔

تاہم انھوں نے سارے انتظامی اداروں پر اندھا دھند ان اصولوں کا اطلاق کر دیا ہے اور یہ ضرورت نہیں سمجھی کہ اس قسم کے اداروں کے ضوابط کو داخلی اخلاق کی پابندیوں سے آزاد رکھیں جو ادارے اقتصادی اصول پر چلائے جاتے ہیں، یا جن میں جمالیاتی نکات کا لحاظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔

میں دراصل جس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اقتصادی وسائل کی تقسیم کے مسائل، قانون کی داخلی اخلاقیات کی مقررہ حدود میں رہ کر مؤثر طور پر حل نہیں کئے جا سکتے۔ ان معاملات کو عدالتی اور قانونی طریقوں سے حل کرنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوگی۔ اس سے اخلاقی الجھنیں پیدا ہوں گی اور بے اعتباری اور انتشار بڑھ جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ جج فرینڈلی Judge Friendly نے بھی اسی نظریے کی دبے دبے اور ضمناً تصدیق کی ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ وفاقی مواصلاتی کمیشن اور شہری ہوابازی کے بورڈ کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے کیونکہ

یہ ایسے ادارے ہیں جن کا کام نمایاں طور پر اقتصادی وسائل کی تنظیم سے متعلق ہے۔ انھوں نے نیشنل لیبر ریلیشن بورڈ (National Labor Relation Board) کی بڑی تعریف کی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اس بورڈ نے نہایت وضاحت کے ساتھ بتادیا ہے کہ مزدوروں کے سلسلے میں بدعنوانیوں کا مفہوم کیا ہے اور غلط اور صحیح طرز عمل کی تعریف کیا ہے، گویا ضابطۂ فوجداری کی طرح اس ادارے کے ضابطے نے تمام معاملات کی تشریح کردی ہے اور کوئی بات افسروں کی مرضی اور صوابدید پر نہیں چھوڑی، جبکہ دوسرے اداروں میں وسائل کی تنظیم حکام بالا کے اپنے اختیار کے مطابق اور اقتصادی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے اور کسی مسلمہ ضابطے کی پابند نہیں ہوتی۔ جج فرینڈ لی کے لکچروں میں یہ بات عام طور پر نظر آتی ہے کہ جب وہ تنقید و تحسین کرتے ہیں تو تعریف ہمیشہ ایسے اداروں کی کرتے ہیں جن کے قواعد داخلی اخلاق سے آراستہ ہوں اور تنقید اُن کی جن کے قواعد اقتصادی مصلحتوں سے اس طرح واضح اور معقول نہ معلوم ہوں۔ اس طرح وہ نادانستہ ہی سہی ایک امتیاز دونوں قسم کے اداروں میں قائم رکھتے ہیں۔ ہاں افراد پر ان کا تنقیدی نشانہ اُلٹا پڑتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ادارے کی نوعیت تشکیل پر تنقید کی جائے کیونکہ وہ تو وہی کام سرانجام دیتے ہیں جو ان کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ اس میں افراد کا قصور نہیں ہوتا بلکہ ادارے کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے۔ بہت سے انتظامی ادارے ایسے ہیں جن کے فرائض منصبی اور طریقۂ کار میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔ اس خامی کو دور کرنے کے لئے ہکٹر[1] (Hector) اور ریڈ فورڈ[2] (Redford) نے مختلف انداز میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ عام پالیسیوں کی ترتیب

---

[1] ملاحظہ ہو ۶۹۔ییل لا جرنل (۱۹۶۰) ص ۹۳۱/۹۶۲

[2] ملاحظہ ہو گورمنٹ رپورٹ ۱۹۶۰ء "دی پریزیڈنٹ اینڈ دی ریگولیٹری کمیشن"۔

و تشکیل اور آئے دن کے مسائل کے طے کرنے کے قاعدوں کو الگ الگ دیکھا جائے۔ جج فرینڈلی نے ریڈ فورڈ کی تجویز پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ اسے انھوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے "میرے خیال میں اس سے بدتر خبر کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔" تاہم یہ تو ماننا پڑے گا کہ عام پالیسیاں مرتب کرنے کے فرائض کو علیحدہ کر دینے کی تجویز اچھی اور مخلصانہ ہے اور اس طرح انتظامی اداروں کے قواعد کو صرف پالیسی اور عام اصولوں تک محدود رکھا جا سکتا ہے جس سے اقتصادی معاملات سے نپٹنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر ایک مسئلہ یہ لیجیے کہ کوئلے کی پیداوار بڑھائی جائے — کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا کہ یہ مسئلہ کسی عدالتی طریقہ کار کے ذریعہ اور قواعد نفاذ سے ہی حل کیا جا سکے گا اور اس طریقہ کار کی حدود متعین کرنی ضروری ہیں۔ اس عام پالیسی کو صرف سامنے رکھا جائے گا اور کوئلے کی ہر کان میں جن اقدامات کی ضرورت ہوگی ان کا تعین معاملے کی الگ الگ نوعیت کے لحاظ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ضابطۂ کار مقرر کر کے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہیکٹر اور ریڈ فورڈ کی تجاویز میں اقتصادی حل تو ضرور ملے گا لیکن وسائل کی تنظیم کے سلسلے میں اداروں کی تشکیل اور ان کے ضابطوں اور مقاصد میں ربط اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکے گی، نہ اس قسم کے اداروں کا کوئی مستقل ڈھانچہ اور ضابطہ مقرر کیا جا سکے گا۔ مخصوص حالات میں کس قسم کی عام اقتصادی پالیسی درکار ہوگی؟ اس کا فیصلہ قانون اور عدالت کے پاس نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کوئلے کی پیداوار بڑھانے کے بارے میں جو قومی پالیسی مرتب کی جائے گی اس میں کوئلے کے قومی بورڈ سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی کان سے کوئلہ کم نکل رہا ہے تو اسے بند کر دیا جائے۔ یا اس میں مسلسل کام جاری رکھنے کے لیے اور امداد فراہم کی جانی چاہیے۔ اس سوال کا دانشمندانہ فیصلہ اس امر کی پوری تحقیق کے

بعد ہی کہا جاسکتا ہے کہ کان کنی بند کرنے سے جو افراد بے کار ہو جائیں گے انھیں کہاں کھپایا جائے اور امدادی رقم کے استعمال کے دوسرے ذرائع اور مواقع تلاش کئے جائیں تو کتنا فائدہ یا نقصان ہوگا۔

وسائل کی تنظیم اور ان کے ضابطوں کی خصوصیات کی اہمیت پر اس قدر زور دینے سے میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انتظامی اور عدالتی فرائض کے مختلف درجے نہیں ہوتے یا ان میں امتیاز ممکن نہیں۔ اگر کسی عدالتی فیصلے کے ذریعے کسی ٹیکس کو غیر آئینی قرار دیا جائے تو اس ٹیکس سے بچتے ہی سرمایہ اور سرمایہ کاری اسی صنعت میں بڑھ جائے گی جسے چھوٹ ملی ہے۔ گویہ پہلو اصولاً وسائل کی اقتصادیات اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہے لیکن عدالتی فیصلے میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی انتظامی ٹریبونل ایسے اصولوں پر عمل پیرا ہو سکتا ہے جن کی بنا پر اس کے ضابطوں کے اقتصادی اثرات کو نظر انداز کر دیا جائے —— یہ اصول ایسے ادارے کے ضابطوں میں کارفرما ہوتا ہے جس کے سامنے صرف یہ مقصد ہو کہ سرمایہ کاری کے عوض معقول منافع حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ ادارہ اپنے معاوضے کے صور پر ایسی شرح کا تعین کر دے جس کی وجہ سے مجموعی طور پر متعلقہ صنعتوں میں کافی سرمایہ کاری ہونے لگے تو پھر یہ کام وسائل کی تنظیم کا ہو جاتا ہے لیکن یہ اضافہ بھی اس وقت بے معنی نظر آتا ہے جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صنعتوں میں سرمایہ کاری خود بخود اور معمول کے مطابق ہونی چاہیے نہ کہ غلط لالچ دے کر، جو طریقہ معیشت کا وسیع نظر رکھنے والے حضرات رد کر دیں گے۔ جس فرائض اتفاقاً اقتصادی شکل میں سامنے آتے ہیں لیکن حالات بدلتے ہی وہ پورے طور پر اقتصادی اور صنعتی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً ریاستوں کے مابین تجارت جو پہلے ریلوں سے ہوتی اس کی تنظیم کے لئے کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس

کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ ٹرکوں اور ہوائی جہازوں کے رواج پانے کے بعد ریلوے کو ان سے مقابلہ کرنا پڑا، اور اس کمیشن کے فرائض کی نوعیت بدلتی گئی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جج فرینڈلی نے کمیشن کے بعض پرانے فیصلوں کی (جو صرف سادہ ریل کے ذریعہ تجارت تک محدود تھے اور سادہ ضابطوں میں تھے) تعریف کی ہے مگر بعض حالیہ فیصلوں کی مذمت کی ہے، کیونکہ کمیشن نے ان فیصلوں میں کوئی واضح معیار سامنے نہیں رکھا اور اقتصادی مفاد اور ذرائع حمل و نقل کی پیچیدگیوں کا لحاظ کر کے فیصلے دئے ہیں۔

ایک عرصہ دراز سے یہ مسئلہ چلا آ رہا ہے کہ معیشت پر سرکاری کنٹرول رکھنے کے لئے انتہائی مناسب ادارے کس طور پر وجود میں لائے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ یہ مسئلہ اور بھی وسیع کیفیت اور سنگین صورت اختیار کرے گا۔ مثلاً ریلوے کی ناگزیر سہولتوں کو کسی نہ کسی طرح اقتصادی بدحالی سے بچانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ دوسرے ذرائع حمل و نقل کو امداد دینے سے ریلوے پر جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں اور کوئی بھی اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مزدوروں کے مسائل میں بہت سے تجربہ کار ثالث پہلے لازمی ثالثی کے اصول کے شدید مخالف تھے اب ثالثی کے قائل ہوتے جا رہے ہیں اور بعض تو اس طریقِ کار کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ہم نے دیدہ و دانستہ نہیں بلکہ اَن جانے طور پر اس صنعتی دور میں ایک ایسی مخلوط معیشت استوار کر لی ہے (اور جس کا تعلق ملک کی دفاعی ضروریات سے ہے) جہاں صنعتیں راست مسلح افواج کے ساتھ سپلائی کے بارے میں سودے اور معاہدے کرتی ہیں۔ چونکہ اس نئے کاروباری عمل کو "پرائیویٹ" تصور کیا جاتا ہے اس لئے ایسے کاروبار اور صنعتی معاملات پر وہ نگرانی اور بندشیں عائد نہیں ہوتیں جو براہِ راست سرکاری کاموں کے سلسلے میں

لازمی تصور کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ سمجھنا بھی حماقت ہے کہ یہ کاروبار بازار اور منڈیوں کے طور و طریق کا پابند ہو گا۔ جس وقت بھی اسلحہ اور فوجی ساز و سامان کے اخراجات میں نمایاں کمی کی جائے گی تو صنعتی و حرفتی دنیا میں انتشار پھیل جائے گا اور نئے سرے سے مالی وسائل اور کاروبار کی تنظیم ضروری ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اب خودکار مشینوں کا استعمال بڑھتا ہی جا رہا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ آگے چل کر اس سے کیا صورتِ حال سامنے آئے گی۔

اگر ہم آنے والے حالات کا ادراک کر سکیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آئندہ ہمیں اداروں کی تشکیلی نوعیت کے بارے میں ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا جو انتہائی وسیع اور اہم ہوں گے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے میں ماہرینِ قانون کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہو گا۔ سب سے بڑا خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں ہم بغیر سوچے سمجھے نئے حالات میں بھی اُن ہی پرانے اداروں اور طریقوں سے چمٹے رہیں جن کی خامیاں آشکار ہو چکی ہیں، اور جن کی نوعیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ قانون داں کی حیثیت سے ہماری فطری خواہش یہی ہے کہ حکومت کے ہر عمل کو قانون کے دائرے میں لایا جائے۔ عدالتی طریقۂ کار سے ہم مانوس ہیں اور اس سے ہماری تعمیری صلاحیتوں کو اُجاگر ہونے کا موقع ملتا ہے لیکن ہمیں اس واضح حقیقت کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اقتصادی نظم و نسق اور اقتصادی وسائل کی تخصیص و تنظیم میں سرکاری شرکت اور شمولیت کے معاملے عدالتی طریقۂ کار سے مؤثر طور پر طے نہیں کئے جا سکتے۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر عدالتی کنٹرول اور قانونی گرفت سے آزادی حاصل ہو جائے تو سرکاری محکمے بدعنوانیوں پر اتر آئیں گے اور من مانی کریں گے، لیکن ہر جگہ عدالتی نگرانی اقتصادی مشینری اور کارکنوں کی دیانت پر حملہ

ہے، اور خلوص پر بے اعتباری اور اس اندیشے کی بنا پر کام کرنے والوں کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور وہ بطریقِ احسن اپنا کردار ادا نہیں کرتے۔ آج کتنے ہی ادارے ایسے ہیں جو خلوص مقصد کی دولت سے محروم ہیں اور حاکم ان اداروں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ حرص اور ہوس اقتدار نے انھیں غلط راستے پر ڈال دیا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایسی بدعنوانیوں کے تدارک کا کوئی انتظام ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ صحیح اور پورے طور پر عدالتی طریقہ کار ہی ہو بلکہ مثال کے طور پر سرکاری اداروں کی نگرانی کے لئے فرانس، ناروے، سویڈن اور برطانیہ میں افسر مقرر ہوئے یا کونسلیں بنائی گئیں اور کئی امریکی ریاستوں نے بھی کبھی سنسر بورڈ قائم کر رکھے تھے۔ ان اداروں کا کام یہ تو نہیں تھا کہ وہ نجی اخلاقیات کا درس دیتے پھریں، لیکن وہ سرکاری محکموں کی خامیوں اور خرابیوں پر نظر رکھتے تھے اور ان کی نشان دہی کرتے تھے۔

قانونی اخلاق اور اداروں کی تشکیل کا مسئلہ

قانونی اخلاق کی حدود سے بحث کرتے ہوئے میں نے اب تک یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقتصادی وسائل کی مؤثر تنظیم و تخصیص اس اخلاق کی عائد کردہ حدود میں رہ کر نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے لفظوں میں بات یوں ہوئی کہ عدالتی طریقۂ کار کے ذریعہ یہ کام تسلی بخش طور پر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ میں نے اس نظریے کی تائید میں جن باتوں کو پیش نظر رکھا ہے اُن کا تعلق محض اقتصادی اور معاشی شعبے تک محدود نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اقتصادیات بلحاظ وسعت ہماری زندگی کا ایک عملی جزو ہے اور انسان کی ہر تخلیقی کوشش کسی نہ کسی طور پر اس سے متاثر ہوتی ہے۔

کسی جمہوری معاشرے میں فیصلے کے دو ہی بنیادی طریقہ کار ہوتے ہیں، اول یہ کہ فیصلہ غیر جانبدار ججوں کو کرنا چاہیے' اور دوسرے یہ کہ نمائندوں یا نمائندہ اداروں کو کثرت رائے سے فیصلے کا حق پہنچتا ہے' اور کسی کو نہیں. لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فیصلے کے یہ دونوں ہی طریقۂ کار بے شمار ایسے پیچیدہ مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتے جن کے متعدد حل ہو سکتے ہیں. چنانچہ جب ایک نئے گھنٹا گھر کے بہترین ڈیزائن کے بارے میں کرائسٹ چرچ کالج کے انتظامی شعبے کے ارکان کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے تو چارلس ڈاجسن (Charles Dodgsen) جیسا عظیم ماہر ریاضی بھی ان اختلافات کو دور کرانے کے لئے ووٹنگ کا کوئی طریقہ کار معلوم نہ کر سکا[۵۷] ایسے معاملات میں عدالتی طریقۂ کار اور اکثریتی ووٹ دونوں ہی بعض ایسے ابتدائی اقدامات پر انحصار رکھتے ہیں جن کی وجہ سے اختلاف کا دائرہ تنگ تر ہو جائے اور اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر فیصلے کا اثر پڑتا ہو وہ سب آپس میں مل بیٹھکر باہمی رواداری اور صلح پسندی کے جذبے سے کام لے کر معاملے کو آسان بنانے کی کوشش کریں.

ظاہر ہے کہ قانونی اداروں کے تشکیلی نوعیت اور ان کے ضابطوں کا فیصلہ عدالتی طریقۂ کار سے نہیں ہوا کرتا. یہی وجہ ہے کہ آئین میں ریاستوں کے ری پبلکن طرز حکومت کی ضمانت کے باوجود سپریم کورٹ نے یہ دانشمندانہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے آئینی دفعات کی راست تعمیل اس کے دائرۂ اختیارات سے باہر ہے. عدالت کے فرائض محدود و مخصوص ہوتے ہیں اور وہ نہ تو آئین تحریر کر سکتی ہے' اور نہ اس پر عملدرآمد کی عام انتظامی نگرانی کا فرض سنبھال سکتی ہے.

---

[۵۷] ملاحظہ ہو "دی تھیوری آف کمیٹیز اینڈ الکشنز" بلیک (۱۹۵۸) باب ۲۲

اسی طرح سیاسی مصالحت اور افہام تفہیم سے طے ہونے والے ضوابط کے متعلق سپریم کورٹ کی رائے کہ اس طرح یہ عدالت کے لئے قابلِ نفاذ ہو جائینگے ایک طرح کا جُوا ہے جو کامیاب بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اگر عدالت ایسے ضوابط کے تحت اختلافات اس طور پر طے کرے جو مکمل اور اٹل ہوں تو مصالحت اور مفاہمت کے تقاضے فوت ہوں گے حالانکہ وہ ابتدائی سطح پر ناگزیر ہوتے ہیں، اور اگر فیصلہ بہت ڈھیلا اور لچکدار ہو تو عدالتی نقطہ نظر سے وہ مشکل ہی سے قابلِ قبول ہو گا۔[1]

ان سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اس مفروضے کی بنا پر ہے کہ جس طرح انسانی اعمال کی حدود بہر حال فطری امکانات کی پابند ہیں اور وہ ایک حد سے باہر نکل کر کام نہیں کر سکتا، اسی طرح اپنی سماجی زندگی کی صورتیں مرتب کرنے میں بھی اُسے بعض حدود کے اندر ہی رہنا پڑتا ہے، کیونکہ اس کے سامنے بہت سے راستے نہیں ہوتے اور اُسے اپنے وسائل کے اندر نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے کام کرنا ہوتا ہے۔

اپنے خیالات اور بھی واضح کرنے کے لئے بہتر ہو گا کہ ہم ایک مثال کے ذریعے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ فرض کیجئے ایک گرامر اسکول میں تعلیم پانے والے بچوں کے والدین اُس طریقہ کار سے مطمئن نہیں ہیں جس کے تحت، چند بچوں کو اگلی جماعت میں ترقی دینے سے روک دیا گیا ہے اور اُسی کلاس میں دوبارہ پڑھنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اب والدین کی بے اطمینانی کے دو پہلو ہیں:۔

(۱) والدین کو یہ اطمینان نہیں ہے کہ جو فیصلے کئے گئے ہیں وہ درست ہیں، بلکہ یہ افواہیں بھی سُننے میں آئی ہیں کہ اسکول میں جانبداری اور لاپروائی سے

---

[1] ملاحظہ ہو " بیکر بنام کار" ۳۶۹ سپریم کورٹ آف امریکہ، ص ۶۹۱ (۱۹۶۲ء)

کام لیا جاتا ہے، اور تعلیم کا ریکارڈ درست نہیں رکھا جاتا۔

(۲) والدین کا خیال ہے کہ بچّوں کے ساتھ بہر حال زیادتی ہوئی ہے، اور دوبارہ اسی کلاس میں وقت ضائع کرنا ایک بڑی سزا ہے جو بچوں کو دی گئی ہے۔ پہلے اعتراض کا ازالہ کرنے کے لئے والدین مطالبہ کرتے ہیں کہ ترقی دینے کے خلاف متعلقہ ٹیچروں نے جو سفارشیں کی تھیں وہ سب سینئر اساتذہ کے ایک بورڈ کے سامنے پیش کی جائیں اور یہ بورڈ عدالتی طریقہ کار کے مطابق معاملے کا فیصلہ کرے۔ اِس سلسلے میں بچّوں کے والدین کو بھی بورڈ کے سامنے پیش ہونے کی اجازت دی جائے اور انھیں تمام متعلقہ ریکارڈ دیکھنے کا بھی موقع دیا جائے۔

دوسرے اعتراض کے ازالہ کے لئے والدین چاہتے ہیں کہ ناکامی کی صورت میں بچوں کو اتنی سخت سزا نہ ملے اور جب کوئی طالب علم ناکام رہے تو اس کے بارے میں ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ ترقی نہ دینا سنگین چیز نہ معلوم ہو اور اس کے نتائج و اثرات اتنے زیادہ تکلیف دہ نہ ثابت ہوں۔ اب ان تجاویز میں ایسے عناصر شامل ہیں جن کے درمیان زبردست عدم مطابقت پائی جاتی ہے لیکن ہوشیاری اور چابک دستی سے اس پر عمل کیا جائے تو مزید تلخیوں کے امکانات کم ہو سکتے ہیں لیکن یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ رہے گی کہ غلطی اور جانبداری کے سدِّباب کے لئے جتنی سخت تدبیریں اختیار کی جائیں گی" ناکام ہونے والے طالبعلم کے لئے ناکامی کا احساس اور بھی شرمناک ہوتا جائے گا۔ اور اگر کھلی عدالت کی طرح مقدمہ چلایا جائے تو ناانصافی کا ازالہ ہو سکتا ہے لیکن ناکام طلباء کے لئے اس طفل تسلّی کا آسرا بھی نہ رہے گا کہ جن استادوں نے انھیں نمبر ٹھیک نہیں دئے وہ اصل میں اپنے کام سے ناواقف تھے۔

ہماری سیاسی اور قانونی زندگی میں بھی ایسے مسائل پیش آتے رہتے ہیں

ہیں جن کا اگر ایک حل تلاش کیا جائے گا تو اس میں وہی خامیاں رہ جاتی ہیں، جو کسی اور حل میں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس بات کی ضمانت کے لئے کہ کسی بے گناہ کو کبھی سزا نہ ملے، کتنی کوشش، کیسے مکمل ضابطوں اور کتنی عدالتی جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا یہی جواب ہے کہ ہمیں انتہائی حد تک یہ کوشش کرنی چاہیے بلکہ کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ جب انسان کے بنیادی حقوق کا آزادی کا سوال ہے تو نہایت سختی سے پوری چھان بین ہونی چاہیے چاہے اس میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔ تاہم دوسری بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ صحیح فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگانی چاہیے اور کم سے کم وقت میں یہ کام ہو جانا چاہیے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صحیح فیصلے پر پہنچنے کے لئے بہت زیادہ وقت صرف کرنا زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے اور ملزم کو زیادہ تکلیف دیتا ہے بہ نسبت اس کے کہ غلط فیصلہ ہو اور فوراً صادر کر دیا جائے۔ اگر ہم اب اسی بحث میں الجھ جائیں اور بہ یک وقت یہ بھی چاہتے ہوں کہ اخراجات کم ہوں، فیصلہ ہو، درست ہو، جلد سے جلد ہو اور کم سے کم پیچیدگیاں پیدا ہوں تو ان ساری باتوں میں مطابقت پیدا کرنا آسان کام نہیں، اور ظاہر ہے کہ سب سے کم قابل توجہ مالی اخراجات کی مد ہوگی اور عظیم تر مقاصد کے لئے کوئی خرچ کی پروا نہ کرے گا۔

اپنے اداروں کی نوعیت اور نظم و نسق کے معاملات کو سمجھنے کا یہ طریقہ نہایت غلط ہے کہ اس کے اہم مقاصد کو ایک دوسرے سے موازنہ کر کے دیکھا جائے، کیونکہ ان اداروں کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے اور اس حیثیت اور رتبے کا احترام لازم ہے، انہیں تمام مقاصد میں اتنی ہی ہم آہنگی رکھنی پڑتی ہے کہ مؤثر تصفیے کر سکیں اور کسی ایک مقصد کے نہ ہو رہیں۔ میں نے قانون

کے داخلی اخلاق کے سلسلے میں اس نکتے پر تفصیلی بحث کر کے بتلایا ہے کہ قابل قبول اور مؤثر ہونے کے لئے قانون میں کیا خصوصیات ہونی ضروری ہیں۔ مگر ہنری ایم ہارٹ کے مندرجہ ذیل اقتباس میں اس نکتے کی وضاحت کے ساتھ اداروں اور طریقہ کار کو بھی ذہن میں رکھا گیا ہے، ملاحظہ کیجئے :۔

قانون فوجداری میں بلکہ ہر قانون میں، دادرسی اور تجاویز کے سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا فیصلہ خلا میں نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے ساتھ اداروں کا تصور ضروری ہے کیونکہ یہ سوالات کسی واضح اور مسلّمہ ضابطے کے تعلق سے پیدا ہوتے ہیں، یہ سزائیں یا دادرسیاں یا احکام یا تو کوئی آئینی کنونشن مقرر کرے یا مجلس قانون ساز، یا کوئی عدالت یا ٹربیونل یا بورڈ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ کرنے والا ہر ادارہ اداروں کے نظام کے دائرے میں اپنی حیثیت اور نوعیت کا لازمی طور پر لحاظ رکھے اور پورے نظام کی سالمیت اور کارگزاری کو برقرار رکھنے میں مدد دے! اداروں کے بہت سے مخصوص مقاصد اور نصب العین ہوتے ہیں، اور ان کے سامنے بہت سے ٹھوس معاشرتی مقاصد بھی ہیں، ان سب کا لحاظ اور احترام ضروری ہے۔ یہ بھی لازم ہے کہ ہر ادارہ اپنی حیثیت میں ایسے ہی فیصلے کرے جو اس کے اختیارات اور نوعیت کے مطابق ہوں[1]

اگرچہ اس مقالے میں پروفیسر ہارٹ نے خاص طور پر قانون فوجداری کا ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ جو مسائل بیان کئے گئے ہیں وہ حکومت کے تمام اعمال کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں نے

---

[1] ملاحظہ ہو ۲۳۔ لا اینڈ کنٹمپوریری پرابلمز (۱۹۵۸ء) ص ۴۰۱ پروفیسر ہارٹ کا مقالہ "قانون فوجداری کے مقاصد"

دلیل کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ ہمارے قانونی اداروں کی مناسب تشکیل اور اُن میں رابطہ رکھنے کے یہ مسائل آیندہ برسوں میں اور بھی سنگین بن جائینگے اور اُن سب لوگوں کو متحدہ کوششوں سے یہ مسائل حل کرنے ہوں گے جو انھیں سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کے لئے "وفاق پسندوں کی دستاویزات" (Federalist papers) قسم کی تصانیف تیار کرنی ہوں گی کیونکہ جس جذبے سے یہ تحریریں سپرد قلم کی گئی تھیں وہ نہایت تعمیری اور مفید تھا۔

بد قسمتی ہمارے دانشوروں نے اس وقت جو فضا پیدا کر رکھی ہے اس میں یہ جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ علماء و فضلاء ہیں جو سرکاری اداروں کے تشکیل، ضابطہ، نوعیت اور اختیارات کے مسائل کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرکاری اختیار سے بس زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہیں اور حکومت کے اخلاقی جواز اور مقاصد کے مباحث میں الجھنا نہیں چاہتے۔ وہ یہ بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کسی مرحلے میں معینہ مقاصد کیا ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف جیسا کہ میں نے پیش کیا ہے، وہ لوگ ہیں جو ان مسائل کو طبعی اخلاق کے بجائے قانونی اخلاق سے وابستہ تصور کرتے ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو مقصد حاصل کرنا ہو اور اُس کے لئے جو قانون بنا دیا جائے اس کی پابندی ہی اخلاق ہے۔ وہ اس تجویز کے مخالف ہیں کہ سرکاری اداروں میں تشکیل میں اقتصادی وسائل، اخلاقی مقاصد، عوام اور مفاد عامّہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت بھی پیش نظر رہنی ضروری ہے۔ چنانچہ اپنے خرف نظریہ رکھنے والوں کو یہ لوگ نہ صرف گمراہ تصور کرتے ہیں بلکہ بے اصولا اور لاابالی بھی سمجھتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ان سطور میں، جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے حقیقتاً اتنا شدید اختلاف دونوں میں موجود نہیں۔ امید رکھنی چاہیئے آئندہ چل کر اختلافات کی یہ خلیج ختم ہو جائے گی کیونکہ کسی مہذب معاشرے کی علامت ہی یہی ہے کہ لوگ اچھے ادارے قائم کریں اور ان کے مسائل حل کرنے کے لئے صحیح طریق کار متعین کریں۔ اور لوگوں کی یہی اہلیت ہی وہ سب سے بڑی ضمانت ہے جس کے سہارے اس بدلتی ہوئی دنیا میں تہذیب کا قافلہ آگے قدم بڑھا سکتا ہے۔

اجتماعی اخلاق کا مسئلہ

اب تک اس تمام بحث کے دوران ہم نے ایک بنیادی مسئلہ کو نظر انداز کر رکھا ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ اخلاق سازی اور اخلاقی اجتماعیت میں کون لوگ شامل ہیں؟ یعنی ایک ایسی مقامی اجتماعی زندگی میں جہاں لوگ ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا لحاظ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ سوال ہے کہ ذمہ دار اجتماعی زندگی کے افراد میں کن لوگوں کو شمار کیا جائے۔ یہ ایک مسئلہ ہے جس نے تمام اخلاقی مفکروں کو پریشان کر رکھا ہے۔ جہاں لوگ ایک ساتھ رہتے بستے ہیں اور ایک دوسرے سے مفاد وابستہ ہوتے ہیں وہاں کوئی اخلاقی ضابطہ تیار کر لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے، پورے معاشرے اور معاشرتی زندگی کی خوش حالی کے لئے کچھ اصول اور ضابطے متعین کرنا بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن اس اخلاقی نظام پر اس اعتماد کی کچھ قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسے معقول اصول نہ ہوں جن کی بنا پر یہ طے ہو سکے کہ ایک منظم معاشرے میں کن کن کو داخل سمجھا جائے تو گویا

ضابطہ اخلاق کا تعلق مختصر جماعت کے خیالات تک اپنی مرضی سے محدود کر دیا گیا پھر اس معمّے کا حل کیا ہے؟ اور اگر کوئی حل ہے تو وہ اخلاقی فرائض سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیونکہ یہ اخلاق تو طوعاً و کرہاً ہر کس و ناکس کا اخلاق ہوتا ہے، لوگ ساتھ رہتے ہیں تو باہمی تعاون اور باہمی مفاد کے تقاضوں سے ایک منظم معاشرے کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ مذکورہ مسئلے کا حل طبعی اخلاق سے نکل سکتا ہے اور اس امکان کا نہایت عمدہ اظہار انجیل مقدس میں ہوتا ہے۔ عہد نامۂ عتیق میں اخلاقی فرائض کے باب میں یہ حکم آیا ہے "تم اپنے ہمسایوں سے ایسی ہی محبت کرو جیسی خود اپنی ذات سے ہوتی ہے۔" عہد نامۂ جدید میں ہمیں ایک بحث نظر آتی ہے جو اسی حکم کے سلسلے میں ایک قانون داں اور حضرت مسیحؑ کے درمیان ہوئی تھی۔ قانون داں کو اس حکم میں ایک قانونی سقم نظر آیا اور اس نے حضرت مسیحؑ کی استعداد کا امتحان لینا چاہا، چنانچہ اُس نے سوال کیا کہ میرا ہمسایہ کون ہے، یعنی کسے ہمسایہ تصوّر کیا جائے؟

حضرت مسیحؑ نے سوال کا جواب یہ نہیں دیا کہ "ہر شخص تمہارا ہمسایہ ہے، تمہیں ساری کائنات کے انسانوں سے محبت کرنی چاہیے حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی" اس کے بجائے حضرت مسیحؑ نے نیک نہاد سامریوں کی ایک حکایت بیان فرمائی:-

"کسی آدمی پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور اُسے نیم مُردہ حالت میں چھوڑ کر فرار ہو گئے، اُس کی برادری کے دو افراد اُدھر سے گزرے، لیکن انھوں نے غریب کے حال پر کوئی توجہ نہیں کی، اس کے بعد سامریوں میں ایک شخص جو لازماً اس کی برادری کا نہ تھا، اس طرف آنکلا اور اس نے غریب کا حال دیکھ کر فوراً مرہم پٹی کی اور پوری توجہ کے ساتھ اس کی تیمارداری کی۔ آخر میں حضرت مسیحؑ نے سوال کیا "اب تم خود سوچو ان تینوں میں سے کون اس غریب کا ہمسایہ تھا۔"

میرے خیال میں اس حکایت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اخلاقی برادری میں سبھی کو شامل کر لینا چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ ہمیں ہر موقع پر اس برادری کا دائرہ بڑھاتے رہنا چاہیے، اور آخر کار اس میں اگر ممکن ہو تو اُن تمام لوگوں کو جو نیک نیت اور شریف ہوں شریک سمجھا جائے۔ لیکن ایک دشواری پھر بھی باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ طبعی اخلاقیات میں احکامات نہیں ہوتے بلکہ یہ تعریف و تحسین، ہمت افزائی اور نیک مشوروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیا اخلاقی برادری میں رکنیت کے سوال کا فیصلہ کرنے کی اس سے مستحکم تر کوئی بنیاد نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ ایسی بنیاد ہو سکتی ہے۔ میں ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جو امکانی ہے مگر فرضی نہیں۔ کسی بھی سیاسی معاشرے میں عام طور پر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو مختلف نسل و رنگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ برسوں سے ساتھ رہتے رہے ہیں اور ہر طبقے نے ایک دوسرے کی زبان، ادب، خیالات، موسیقی اور جمالیاتی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں حصہ لیا ہے اور سب نے مل جل کر ایک مشترکہ تہذیب کو جنم دیا ہے۔ کیا کوئی ایسا اخلاقی اُصول نہیں ہے جو ان کے مابین امتیازات برتنے کو، اور ایک طبقے کو اُن ضروری آسائشوں سے، جو سب کے لئے معزز اور باوقار زندگی کے لئے لازم ہیں محروم کرنے کی سازش کو ناپسندیدہ قرار دے کر مسترد کر دے۔ ظاہر ہے کہ اخلاق کا ایسا اصول بالکل واضح ہے چنانچہ ان حالات میں یہ ماننا ہوگا کہ یہ امتیازی برتاؤ اعلیٰ اور طبعی اخلاقیات کے لحاظ سے اتنا ہی نامقبول ہے جس قدر اخلاقی فرائض کی گرفت میں آتا ہے۔ اور اس مرحلے پر آ کر دونوں قسم کی اخلاقیات کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ طبعی اخلاق یا اعلیٰ اخلاق بھی بہر حال انسانوں ہی کا طبعی اخلاق ہے اور اس کے زیر اثر کسی انسان کو انسانی آسائشوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسا

کیا گیا تو خود اخلاق کی تکذیب ہو جائے گی۔

تلمود میں ایک جگہ لکھا ہے "اگر میں اپنا نہیں ہو سکتا تو پھر میرا کون ہو گا، اگر میں صرف اپنے لئے ہوں تو میں کیا ہوں؟" اگر میں اس جملے کو جمع کے صیغے میں بیان کروں تو یوں ہو گا۔ "اگر ہم اپنے نہیں تو ہمارا کون ہو گا اور اگر ہم صرف اپنے ہی لئے ہیں تو ہم کیا ہیں؟" اس آخری سوال کا ہم جو بھی جواب دیں اس کی بنیاد یہی ہو گی کہ بہر حال ہم سب انسان ہی ہیں اور اگر ہم اس میں کوئی نسلی امتیاز شامل کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دوسروں کو آسائشوں اور حقوق سے محروم رکھنے کا جواز پیش کرنے کے لئے ہم خود کو انسانی خصوصیات سے محروم کر لیتے ہیں۔

فطری قانون کا لازمی جوہر

اب تک ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ آیا طبعی اخلاقیات یعنی اعلیٰ اخلاقیات سے مشورے اور حوصلہ افزائی کے علاوہ کچھ ٹھوس اصول اور تقاضے وابستہ کئے جا سکتے ہیں؟ میں نے بتایا ہے کہ طبعی اخلاق بھی لازماً انسانوں کی طبع اور مزاج کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بلا امتیاز سب انسانوں کی صلاحیت اور عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ورنہ خود یہ اخلاق ہی ساقط ہو جائے گا۔ کیا ہم اس سے بھی کچھ زیادہ حاصل کر سکتے ہیں؟ یعنی کیا کوئی اور بھی تقاضے علاوہ محض انسانی بھائی چارے کے ہمیں اعلیٰ اخلاق پر اُکساتے ہیں۔

یہ مسئلہ ایک اور شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ تیسرے باب میں میں نے قانون کی داخلی اخلاقیات سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس میں فطری قانون

کی کئی مماثلتیں نکلتی ہیں۔ البتہ یہ فطری قانون ایسا ہے جس کی نوعیت طریقۂ کار کی سی ہے اور اداروں کی شکل میں رونما ہوتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے قانون کے ذریعہ حاصل ہونے والے مقاصد پر اس کا اثر پڑتا ہے اور یہ فطری رویہ اُن مقاصد کی حدود بھی متعین کرتا ہے یعنی ہر مقصد قانون بنا کر حاصل نہیں کیا جا سکتا، خواہ یہ قانون داخلی اخلاق سے کتنا ہی مزین ہو۔ لیکن آیا ہم خود طبعی اخلاقیات ہی سے فطری قانون کا کوئی ایسا نظریہ قائم کر سکتے ہیں جن کی نوعیت طریقِ کار کی سی نہ ہو بلکہ وہ خاصے ٹھوس اُصول پر مشتمل ہو۔

ایچ۔ ایل۔ اے۔ ہارٹ نے "دی کنسپٹ آف لا" میں ایک بیخ بیش کی ہے جسے انھوں نے "فطری قانون کے لازمی عنصر" کا نام دیا ہے۔ انھوں نے انسان کے بقا کی جدوجہد کا نصب العین سامنے رکھ کر رفتہ رفتہ ایسے اصول اور ضابطے استدراجاً وضع کئے ہیں جنھیں فطری قانون کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی دل چسپ بحث میں ایک نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ اخلاقی فرائض کے کچھ بنیادی اور لازمی عناصر ایسے ہوتے ہیں جن کے احترام کے بغیر انسانیت کا قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اخلاقی فرائض کے ہر نظریے کی طرح اس کم سے کم فطری قانون میں بھی اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ اُس برادری میں کون کون شریک ہوگا جس میں بقا کی خاطر باہمی تعاون اور میل جول کا نظریہ قبول کیا جاتا ہے۔ ہارٹ نے یہ کہا ہے کہ "ہمارا تعلق مسلسل بقا اور وجود کی خاطر، معاشرتی انتظامات سے ہے نہ کہ خودکشی کا ارادہ رکھنے والوں کی کسی انجمن سے" یعنی زندہ رہنے دار انسانوں کے معاشرے

ل (Fundamental Law)

ہیں باہمی تعاون سے کچھ اُصولوں کی پاسداری لازم ہے جنھیں فطری قانون کہا جا سکتا ہے۔

بقائے انسانی کے متعلق اپنی بحث کی تائید میں ہارٹ نے دو[2] قسم کے وجوہ پیش کئے ہیں۔ ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسانی کارنامے اور تسکین کے لئے انسانی بقا لازمی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بارے میں کسی اختلاف رائے کی گنجایش نہیں نکل سکتی۔

لیکن ہر اچھے انسانی عمل میں لئے انسانی بقا کو لازمی شرط قرار دینے کے علاوہ ہارٹ نے کچھ مختلف نوعیت کے اسباب بھی بیان کئے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ بقا کے سیدھے سادے مقصد ہی میں وہ مرکزی اور غیر متنازعہ عنصر پوشیدہ ہے جس سے فطری قانون (نیچرل لا) کی اصطلاح کا شعور اُبھرتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام اخلاقی اور قانونی افکار میں جو عناصر داخل رہتے ہیں اُن میں یہ مفروضہ بھی شامل ہے کہ انسانی عمل کا صحیح مقصد بقا ہی ہے۔ انھوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ انسانوں کی اکثریت یہی سب سے بڑی آرزو رکھتی ہے کہ وہ زندہ رہے۔ حد یہ ہے کہ کربناک اور ناقابل برداشت اذیت میں بھی اس کی یہی خواہش رہتی ہے کہ زندہ رہے"۔

میرا خیال ہے کہ ہارٹ نے یہ بحث اس انداز سے کی ہے جسے مشکوک بھی کہا جا سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ ان کا اندازِ فکر درست ہی ہو۔ کیونکہ بقا کے سلسلے میں ان کا دعویٰ یہ نہیں رہا کہ دوسرے مقاصد کی تکمیل کے لئے بقا لازم ہے بلکہ در اصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تمام انسانی جدوجہد اور کوشش و کاوش کا مرکزی عنصر یہی خواہشِ بقا ہے۔ میرے خیال میں یہ نظریہ قابلِ قبول نہیں ــــ تھامس ایکوینس (Thomes Aquinas) نے بہت عرصہ

پہلے یہ بات کہی تھی کہ اگر کسی کپتان کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد جہاز کی سلامتی ہی ہو تو وہ جہاز کو ہمیشہ بندرگاہ ہی میں لنگر انداز رکھے گا۔" مجھے اس بیان میں بھی شبہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت انتہائی کرب اور مصیبت کے باوجود مرنا نہیں چاہتی بلکہ زندہ رہنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ اور اگر یہ درست بھی ہو تو میں یہ اعتراض کروں گا کہ نظریۂ اخلاق سے اس کا کون سا خاص تعلق ہے۔

ہارٹ صاحب نے انسانی عمل میں ایک مرکزی غیر متنازعہ عنصر کی تلاش کی جو کوشش کی ہے اُس کی کامیابی مشکوک ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہمیں اس بات پر مجبور کیا جائے کہ ہم تمام انسانی تمناؤں کے پس پردہ کار فرما رہنے والے بنیادی اصول کا سراغ لگائیں تو غالباً وہ مقصد یہ ہوگا کہ ہم اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے رشتہ و رابطہ قائم رکھ سکیں۔

ہارٹ کی دلیل کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہمیں پہلی بات تو یہ محسوس ہوتی ہے کہ اب تک انسانی زندگی اور بقا اس وجہ سے ممکن رہی ہے کہ انسان دوسروں سے منسلک اور وابستہ ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ دوسری مخلوق کے مقابلے میں انسان اب تک اسی وجہ سے فاتح رہا ہے ورنہ بہت سی مخلوق ایسی ہے جو انسان سے بہت زیادہ طاقتور ہے اور بعضوں کو زیادہ مؤثر حسیات عطا کی گئی ہیں۔ انسان کی فتحمندی کا سبب یہی رہا ہے کہ وہ علم حاصل کر سکتا ہے اُسے دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اور دوسرے انسانوں کے اشتراک اور تعاون سے اپنی کوششوں کو مربوط اور مستحکم بنا سکتا ہے۔ اب تو انسانوں نے خود ہی اپنی تباہی و بربادی کے سامان مہیا کر لئے ہیں لیکن اگر وہ اپنی ان تباہ کن قوتوں کے باوجود باقی رہا تو

ل ملاحظہ ہو "سماجیات" لوجیکا۔ "کپتان کا واحد مقصد سلامتی ہی نہیں، کیونکہ دراصل جہاز کے اور بھی مقاصد جہازرانی سے وابستہ ہیں۔"

اس کا سبب بھی یہی ہوگا کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں تک اپنی بات پہنچا سکتا ہے اور ان سے مفاہمت پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ آخر میں میں یہ کہوں گا کہ انسان گھاس پھوس کی طرح زندہ و باقی رہنے پر تیار نہ ہوگا، کیونکہ ایسا وجود تو بے معنی ہے جس میں دوسرے انسانوں کے ساتھ بامعنی رشتہ و رابطہ پیدا نہ ہو سکے۔ یہ رشتے و رابطے محض زندہ رہنے کے ذرائع ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہیں۔ یہ زندہ رکھنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ اسی سلسلۂ روابط کی بدولت ہم ماضی کی انسانی کوششوں اور کارناموں سے واقف ہوتے ہیں۔ اسی خیالات کی امید اشاعت کی بدولت ہمیں موت بھی گوارا محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ ہمیں معلوم رہتا ہے کہ آج ہم جو کچھ کریں گے اس سے آنے والی نسلیں فائدہ اٹھائیں گی اور ان کی زندگی میں ہماری کارگزاری کا بھی کچھ حصہ ہوگا۔ خود زندگی کی وسعت اور تنگی کا انحصار بھی اسی بات پر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کب اور کس طرح کے رشتے رابطے رکھتے ہیں۔ وِٹجنسٹین (Wittgenstein) نے کہا ہے کہ "میری زبان کی حدود ہی میری دنیا کی حدود ہیں۔"

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اس چیز کا جسے فطری قانون کا واقعی نام دیا جا سکتا ہے، واحد مرکزی اور قطعی اصول کیا ہے تو میں اس کے جواب میں یہی کہوں گا کہ رابطے کے ذرائع نکالیے، انہیں قائم رکھیے، اور ان کی اہمیت برقرار رکھیے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان اپنے افکار، احساسات اور خواہشات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس معاملے میں طبعی اعلیٰ اخلاق صرف نیک مشورے تک محدود نہیں رہتا بلکہ کوئی اور چیز اس سے بہتر مشعلِ راہ نہیں بن سکتی۔ جتنا اعلیٰ اخلاق برتنے پر آپ آمادہ ہوں گے اتنے مفید اور مستحکم روابط قائم کر سکیں گے۔ یہاں پر یہ طبعی اخلاق اسی حکیمانہ انداز میں سامنے آتا ہے۔

جس انداز میں ہم قانونی اخلاق کو اپنانے کے عادی ہیں اور قانونی اخلاق کے برعکس اگر انسان طبعی اخلاق یعنی انسانی ضمیر کی اس آواز کو سُنیں گے تو یہ مبارک آواز اُن تمام حدود اور رکاوٹوں کو عبور کرتی ہوئی محسوس ہوگی جنھوں نے انسان کو انسان سے الگ اور بیگانہ کر رکھا ہے۔

بدطینت اور خود غرض مخبروں کا مسئلہ

فرض کیجئے کہ آپ تھوڑے سے ووٹوں کی اکثریت سے انتخاب جیت کر اپنے ملک کے وزیر انصاف بن گئے ہیں۔ آپ کے ملک کی آبادی تقریباً دو کروڑ ہے۔ وزارت سنبھالتے ہی ایک سنگین مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل سطور میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔

قصہ یوں ہے کہ ایک عرصۂ دراز سے آپ کے ملک میں ایک پُرامن، آئینی اور جمہوری حکومت قائم تھی، لیکن کچھ ہی عرصہ پہلے حالات بدل گئے اور بُرا وقت آ گیا۔ اقتصادی بحران رونما ہوا جس سے افراتفری پھیل گئی، مختلف طبقوں اور گروہوں کے باہمی اختلافات بڑھتے رہے، اور انھوں نے اقتصادی، سیاسی اور مذہبی خطوط پر اپنے اپنے گروہ بنا لئے۔ اس افراتفری کے عالم میں ایک مردِ آہن نمودار ہوا جو ایک سیاسی پارٹی یا تنظیم کے سربراہ کی حیثیت لئے سامنے آیا اور اس نے اپنے خدائی فوجداروں کی تنظیم کا نام پرپل شرٹ (Purpleshirts) رکھا۔

اس کے بعد نہایت ہنگامے اور انتشار کے عالم میں قومی انتخاب کرائے گئے جس میں اسی مردِ آہن کو جمہوریہ کا صدر منتخب کر لیا گیا اور اس کی پارٹی کو جنرل اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو گئی۔ انتخابات میں اس پارٹی کی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ اُمیدواروں نے بلند بانگ دعوے کئے، خوش آئند نعرے لگائے اور

غلط بیانیوں سے کام لیا۔ اس کے علاوہ خدائی فوجداروں نے دھونس اور دھمکی سے بھی خوب کام لیا اور ایسے لوگوں کو جو پارٹی کے خلاف ووٹ دے سکتے تھے، پولنگ بوتھ تک پہنچنے ہی نہ دیا گیا گویا انھیں خوفزدہ کر کے انتخابات سے الگ رکھا۔

جب خدائی فوجداروں کی یہ پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تو انھوں نے سابقہ آئین یا اس کی کسی دفعہ کی تنسیخ کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ انھوں نے ضابطہ فوجداری اور ضابطہ دیوانی کو بھی جوں کا توں رہنے دیا اور طریقِ کار کے ضابطے میں بھی کوئی ترمیم نہ کی۔ کسی سرکاری افسر کو اس کے عہدے سے برطرف نہیں کیا گیا۔ عدالتوں کے پرانے ججوں میں سے بھی کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ اسی طرح کام چلتا رہا اور وقفے وقفے سے انتخابات بھی کرائے جاتے رہے جو بظاہر منصفانہ معلوم ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود سارے ملک میں دہشت اور بربریت کا دور دورہ تھا۔

اس پارٹی کی مرضی کے خلاف فیصلے صادر کرنے والے ججوں کو مارا پیٹا جاتا تھا اور انھیں قتل بھی کر دیا جاتا تھا۔ ضابطۂ فوجداری کا مفہوم ہی یہ ہو گیا کہ اُلٹی سیدھی توجیہہ سے اس کا سہارا لے کر سیاسی مخالفوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا۔ اس کے علاوہ خفیہ قوانین منظور کئے گئے جن کا علم صرف برسرِ اقتدار گروپ کے سرکردہ لوگوں کو ہوتا تھا۔ سابق العمل قوانین بنائے گئے اور ان کے تحت اُن باتوں پر سزائیں دی گئیں جو رائج الوقت قانون کے مطابق جائز اور نا قابلِ گرفت تھیں۔ حکومت نے آئین اور متعلقہ قوانین کی حدود کا خیال نہیں رکھا بلکہ خود اپنے قوانین کا لحاظ بھی ضروری نہ سمجھا۔ تمام مخالف سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی اور انھیں ختم کر دیا گیا۔ ہزارہا سیاسی مخالفین موت کی نیند سلا دئیے گئے اور اس مہم کے دوران کبھی تو جیلوں میں انھیں کھلا کھلا

کر مارا گیا اور کبھی رات کو اچانک چھاپے مار کر انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور طرہ یہ کہ ملک میں اعلان کر دیا گیا کہ "جن لوگوں نے 'تخریب پسندوں سے مادرِ وطن کا دفاع' کرنے کی بنا پر سزا پائی ہے ان سب کو عام معافی دی جاتی ہے۔" اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی فوجداروں کی تنظیم کے وہ تمام ممبر جو کسی بنا پر سزا پا گئے تھے عزت کے ساتھ بری ہو گئے۔ اس معافی کے تحت ایک بھی ایسا نظر بند رہائی نہ پا سکا جو اس تنظیم میں شامل نہیں تھا۔ گویا یہ اعلان صرف اپنی پارٹی والوں کو چھڑانے کے لئے ہی کیا گیا تھا۔

ان خدائی فوجداروں نے اپنی کارروائیوں کو نہایت ہوشیاری سے منظم کیا تھا اور اُن کے طریقِ کار میں خاصی لچک تھی، کبھی تو پارٹی کے بدمعاشوں کی مدد سے معاملہ طے کر لیتے اور کبھی سرکاری احکامات اور اقدامات کے سہارے اپنے مقاصد پورے کرتے تھے۔ اور یہ بھی آسان کام تھا کیونکہ حکومت ان کی اپنی ہی تھی۔ ان دونوں میں سے کس وقت کون سا طریقۂ کار اختیار کیا جائے، اس کا فیصلہ وقتی مصلحت اور ضرورت کی بنا پر کر لیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جب پارٹی کے اہم ارکان نے یہ فیصلہ کیا کہ نئی حکومت کی شدید مخالف سوشلسٹ ری پبلکن جماعت کے تمام ممبروں کو تباہ و برباد کر دیا جانا چاہیے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ان مخالفوں کی جائداد ضبط کر لینے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

ایک گروپ جو غالباً انقلاب سے پہلے کے تصورات کا ابھی تک حامی تھا، یہ چاہتا تھا کہ یہ کارروائی ایک قانون کے ذریعہ عمل میں لائی جائے اور مجرمانہ حرکات کی بنا پر ان لوگوں کی جائداد اور مال و اسباب ضبط کرنے کا اعلان کیا جائے۔ دوسرا گروپ کہتا تھا کہ قانون کی ضرورت نہیں بلکہ شمشیر کی نوک پر فیصلہ کیا جائے اور زبردستی ساری جائدادیں دستاویزات لکھوا کر منتقل کرا لی جائیں۔ یہ گروہ

قانون نافذ کئے جانے کا اس بنا پر مخالف تھا کہ اس قسم کا قانون بنایا گیا تو بیرونی ملکوں میں اس پر تنقید یں اور اعتراضات کئے جائیں گے۔ آخر کار مرد آہن نے یہ فیصلہ کیا کہ راست اقدام کیا جائے اور پارٹی کے ارکان نے جبراً دستاویزیں لکھوالیں اور پھر ایک خفیہ قانون بنا کر پارٹی کے اقدامات کی توثیق کردی جائے اور دھونس اور دھمکی سے جو کچھ حاصل کیا گیا ہے اُسے جائز قرار دے دیا جائے۔

لیکن حالات نے پھر پلٹا کھایا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ خدائی فوجداروں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہے اور ملک میں جمہوری اور آئینی حکومت بحال ہوگئی ہے، البتہ معزول شدہ حکومت کے چھوڑے ہوئے کچھ مسائل ابھی ایسے ہیں جنھیں حل کرنا ہے۔ چنانچہ اب آپ کا اور حکومت میں آپ کے رفقائے کار کا یہ فرض ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کی راہ نکالیں، ان میں سے ایک مسئلہ بدطینت اور خودغرض مخبروں کا ہے۔

خدائی فوجداروں کے دور میں بہت سے لوگوں نے یہ وطیرہ بنا رکھا تھا کہ وہ انتقاماً اپنے دشمنوں کے خلاف سرکاری پارٹی یا حکومت کو اطلاعات پہنچاتے رہتے تھے اور یہ شکایتیں کچھ اس قسم کی ہوا کرتی تھیں کہ فلاں شخص نجی محفلوں میں برسرِ اقتدار حکومت پر نکتہ چینی کرتا رہتا ہے، غیر ملکی نشریات سُنتا ہے، غنڈوں اور بدمعاشوں سے ساز باز کرتا ہے، مقررہ حد سے زیادہ انڈوں کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، یا شناختی کاغذات کھو گیا تو پانچ دن کے اندر ان کی رپورٹ درج نہیں کرائی وغیرہ وغیرہ۔ اس زمانے میں عدل و انصاف کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا تھا اس کے تحت اس قسم کے جرائم پر موت کی سزا دی جاسکتی تھی۔ بعض اوقات یہ سزا "ہنگامی قوانین" کی آڑ میں دی جاتی اور بعض حالات میں کسی قانونی پروانے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ حالانکہ یہ سب سزائیں انھیں باقاعدہ

ججوں کی طرف سے دی جاتی تھیں جنھیں انصاف کی مسند پر فائز کیا گیا تھا۔

خدائی فوجداروں کی حکومت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد عوام کی طرف سے نہایت زور و شور سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ غلط اطلاعات دینے والے ان بدنیّت مخبروں کو سزا دی جائے۔ آپ کی حکومت کے باضابطہ قیام سے پہلے ایک عبوری حکومت کام کر رہی تھی اور اُس سے بھی یہی مطالبہ کیا گیا لیکن اس نے کوئی خاص توجّہ نہیں دی تھی۔ اس عرصے میں عوام کی بےچینی اور بے اطمینانی برابر بڑھتی رہی اور اب اس معاملے کو ٹالنے کی کوئی صورت نہیں رہی بلکہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ جلد سے جلد اس بارے میں فیصلہ کیا جائے۔ وزیر انصاف کی حیثیت سے آپ کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اس مسئلے پر پوری توجہ دیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے ماتحت پانچ مشیروں سے کہا ہے کہ وہ معاملے پر غور و فکر کریں اور اپنی سفارشات کانفرنس میں پیش کریں۔ کانفرنس میں پانچوں مشیروں نے باری باری تقریر کی اور اپنے خیالات پیش کئے۔

پہلا مشیر "میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہم ان کینہ توز مخبروں کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کر سکتے —— اس وقت جو حکومت ملک کے نظم و نسق کی ذمّہ دار تھی اور اُس نے اس دور میں جو قاعدے اور ضابطے نافذ کر رکھے تھے اُن کی رُو سے وہ تمام حرکات، جن کی اطلاعات مہیا کی گئیں غیر قانونی تھیں اور متعلقہ افراد کو قانون کے اُن اصولوں کے مطابق سزائیں دی گئیں تھیں جو اس دور میں رائج تھے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اصول ان اصولوں سے مختلف تھے جنھیں ہم درست اور قابلِ قبول تصور کرتے ہیں، تاہم اُس زمانے میں وہی ملک کا قانون تھا۔ اُس زمانے کے قوانین اور ہمارے قوانین میں بہت سے اختلافات ہیں، مگر بیّن فرق یہ ہے کہ اُن میں فوجداری مقدمات کے سلسلے میں

ججوں کو بہت زیادہ وسیع اختیارات دئے گئے تھے۔ اس اصول اور اس کے نتائج وعواقب کا ہمیں اتنا ہی لحاظ اور احترام کرنا چاہیے جتنا ان اصلاحات کا جو "خدائی فوجداروں" نے نافذ کیں۔ مثلاً وصیت کے نصاب شہادت میں یہ اصلاح کی گئی کہ تین کے بجائے صرف دو گواہوں کی موجودگی کافی ہے۔ یہ بات کوئی خاص معنی نہیں رکھتی کہ فوجداری مقدمات میں کم وبیش غیر محدود اختیارات جج صاحبان کو دینے کے اصول کو بطور قانون منظور نہیں کیا گیا مگر عملدرآمد کے ذریعہ قبول کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح کی بحث اُس اصول کے بارے میں کی جا سکتی ہے جو اس کے برعکس ہو اور جس کو ہم آجکل قبول کرتے ہیں کہ جج کے اختیارات کی حدود سختی سے متعین ہونی چاہئیں۔ ہم میں اور خدائی فوجداروں میں یہ فرق نہیں ہے کہ ان کی حکومت غیر قانونی تھی اور اصطلاحاً مختلف تھی بلکہ صرف یہ فرق ہے کہ یہ نظریات الگ الگ ہیں۔ میں خدائی فوجداروں کے نظریات کا شدید ترین مخالف ہوں اور ان سے نفرت کرتا ہوں، لیکن ہمارے اور ان کے فلسفہ کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ہم نقطہ ہائے نظر اور نظریات کے اختلافات کی اجازت دیتے ہیں اور مخالفوں سے رواداری برتتے ہیں جبکہ ان لوگوں نے خود اپنا ہی ضابطہ ہر ایک پر مسلّط کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہمارے نظام حکومت میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ قانون میں لچک ہوتی ہے اور وہ مختلف مقاصد کی ترجمانی اور تکمیل میں مدد دے سکتا ہے۔ ہمارے نظام قانون کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ جب کسی قانون یا عدالتی فیصلے میں کوئی مقصد متعین کر دیا جائے تو اسے عارضی طور پر اُن لوگوں کو بھی قبول کرنا ہوگا جو اس سے متنفر ہوں۔ ایسے لوگوں کو اگلے انتخابات تک انتظار کرنا چاہیے یا پھر کسی ایسے عدالتی فیصلے کا جس میں ان کے نقطہ نظر اور مقصد کو جائز تسلیم کیا

گیا ہو۔ اس کے برعکس "خدائی فوجداروں" کی حکومت نے ایسے قوانین کو بالائے طاق رکھ دیا جو ان کے مقاصد کے منافی معلوم ہوتے تھے، بلکہ انھوں نے ایسے قوانین کو منسوخ کرنے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی بلکہ یوں ہی انھیں نظر انداز کر دیا۔

اگر اب ہم اس حکومت کے اقدامات پر خطِ تنسیخ کھینچنا چاہیں اور یہ اعلان کر دیں کہ پرانے فیصلے کالعدم ہوئے، وہ سارے قوانین ناجائز قرار پائے، وہ سزائیں ظالمانہ تھیں اور مسترد کی جاتی ہیں، تو ایسا کر کے ہم بھی دراصل وہی کچھ کریں گے جس پر ہم اُن خدائی فوجداروں کی مذمّت کرتے ہیں، میں یہ مانتا ہوں کہ میں نے جو تجویز پیش کی اُس پر عمل کرنا بڑا کٹھن کام ہے اور ہمیں رائے عامہ کی مخالفت اور دباؤ کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمیں اس بات کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے کہ عوام قانون اپنے ہاتھ میں لے کر "خدائی فوجداروں" کے مظالم کی تلافی میں جو سعی کریں اسے رد کیا جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جرأت سے کام لیا گیا تو کامیابی حاصل ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس مشورے پر عمل کرنے سے ہی ہم قانون اور حکومت کے اُن تصوّرات کا، جنھیں ہم عزیز رکھتے ہیں، بول بالا کر سکیں گے۔"

دوسرا مشیر عجیب بات ہے کہ میں بھی اُسی نتیجے پر پہنچا ہوں جو میرے رفیق کار نے بتایا ہے لیکن ہمارا طریقہ فکر اور استدلال ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، میں سمجھتا ہوں کہ خدائی فوجداروں کی حکومت کو قانونی حکومت قرار دینا بالکل لغو بات ہے۔ کوئی نظامِ قانون محض اس طرح تو قائم نہیں ہوتا اور رہتا ہے کہ پولیس کے سپاہی وردیاں پہنے سڑکوں پر گشت کرتے رہیں اور آئین اور قوانین پر عمل کرنے کے بجائے طاق پر رکھ دیا جائے۔ نظامِ قانون

کے لئے یہ لازم ہے کہ قوانین کا اعلان کیا جائے، وہ لوگوں کے علم میں رہیں تاکہ جن لوگوں پر قوانین اثر انداز ہوتے ہیں وہ اس کی تفصیلات سے مطلع رہیں۔ یہ ضروری ہے کہ قانونی اقدامات میں یکسانیت اور ہم آہنگی ہو اور ایک ہی جیسے معاملات میں ایک ہی جیسے فیصلے کئے جائیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ خدائی فوجداروں کی جماعت جیسی کوئی ایسی غیر قانونی قوت موجود نہ ہو جو حکومت پر بالادستی رکھتی ہو اور جب بھی دیکھے کہ عدالتی فیصلے حکمرانوں کی مرضی کے خلاف جا رہے ہیں تو مداخلت لے جا کر بیٹھے۔ یہ تمام باتیں اور تصورات ایک باضابطہ نظامِ قانون کے لئے بنیادی ضروریات ہیں اور ان کا سیاسی اور اقتصادی ضروریات سے کوئی تعلق نہیں ہے میرا خیال ہے کہ خدائی فوجداروں کے برسر اقتدار آنے کے بعد قانون کا وجود نہایت عام مفہوم میں بھی ناپید ہو چکا تھا، اور قانون کی مٹی پلید کی گئی۔ اس حکومت کے دور میں قانون کی حکمرانی کے بجائے سب ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے، ریشہ دوانیاں اور سازشیں روزمرہ کا معمول بن چکی تھیں، محلوں سے لے کر قید خانوں تک فتنہ و انتشار کا جال بچھا ہوا تھا۔ بدنہاد مخبروں کی سرگرمیاں تو اس فتنہ و فساد کا صرف ایک جزو تھیں اگر ہم ان سرگرمیوں کو مجرمانہ قرار دیں تو یہ اتنی ہی بے تکی بات ہو گی جیسے ہم جہد للبقاء پر عدالتی تصورات کا اطلاق کرنے کی کوشش کریں کیونکہ یہ جنگ و جدال تو ایسی ہی تھی جیسے جنگل میں یا سمندر میں جاری رہتی ہے جہاں طاقتور کمزور کو ہڑپ کر لینے کی فکر میں رہتا ہے۔ ہم کو اپنی تاریخ کے اس تمام تر تاریک اور لاقانونیت کے دور کے بارے میں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم ایک بھیانک خواب دیکھ رہے تھے اور اب وہ ختم ہو چکا ہے۔ اگر ہم نے ان ہی بدیوں اور خباثتوں میں اُلجھنے کی کوشش کی تو خود ہمارا دامن بھی کچھ نہ کچھ آلودہ ہو کر رہے گا، اس لئے میں اپنے معزز

دوست مشیر اول کا ہم نوا ہوں کہ جو ہو سو ہوا، ماضی پر خاک ڈالیے اور ہمیں ان نام نہاد مجرموں کے بارے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں —— جو کچھ انھوں نے کیا وہ نہ تو قانون کے مطابق تھا اور نہ قانون کے منافی ہی۔ کیونکہ وہ جس حکومت کے تحت تھے اس کا کوئی قانون ہی نہ تھا، بلکہ وہ سارا دَور تو لاقانونیت اور بربریت کا دور تھا۔"

تیسرا مشیر

"مجھے اِس طرزِ استدلال سے اتفاق نہیں جس میں" یہ نہیں تو وہ" اور" وہ نہیں تو یہ" والا طریقہ اختیار کیا جائے۔ میرے خیال میں ہمیں نہ تو یہ سمجھنا چاہیے کہ بعض اعتبار سے خدائی فوجداروں کی ساری حکومت ہی دائرۂ قانون سے باہر تھی، اور نہ یہ تصور کرنا چاہیے کہ اس کے تمام اعمال و اقدامات ویسے ہی ہونے چاہئیں جیسے باضابطہ قانونی حکومت کے ہوتے ہیں۔ میرے دونوں ساتھیوں نے نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ ان ہی انتہا پسندانہ نظریات کو اختیار کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس طرح دونوں ہی ایک لغو فیصلے پر پہنچے، ایسا فیصلہ جو اخلاقی اور سیاسی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اُس دور میں سب کے سب ایک دوسرے کے درپئے آزار نہیں تھے۔ اُس طوفانی سمندر کی سطح کے نیچے زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ لوگ شادیاں کرتے تھے، کاروبار کرتے تھے، وصیت نامے اور اقرار نامے لکھے جاتے تھے، اور زندگی کے ان معمولات میں حسبِ معمول فرق بھی آ جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ گاڑیوں کے حادثے بھی ہوتے تھے، لوگ دیوالیہ بھی ہو جاتے تھے، اور وصیت نامے بغیر گواہ بھی نظر آتے تھے، اور اخباروں میں ہتک آمیز اطلاعات بھی شائع ہوتی رہتی تھیں۔ زندگی کے ان تمام معمولات اور مسائل پر خدائی فوجداروں

کے نظریے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اُس دور میں متذکرہ خاص معاملات میں جو قانونی سوالات پیدا ہوئے ان کا تصفیہ عدالتیں اُسی طرح کرتی تھیں جیسے اُس سے پہلے کیا جاتا تھا یا اب کیا جاتا ہے۔ اگر ہم نے یہ اعلان کر دیا کہ اس دور میں جو کچھ ہوا وہ سب کا سب لاقانونیت میں ہوا اس لئے مسترد سمجھا جائے تو پھر ہمیں سخت بحران کا سامنا ہو گا۔ اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پارٹی کے کارکنوں نے سر بازار لوگوں کا جو قتل عام کیا وہ اس بنا پر قانونی ہے کہ پارٹی کو حکمرانی حاصل تھی اور اس کا سرغنہ جمہوریہ کا صدر بن بیٹھا تھا اور اسی کے حکم کے تحت یہ سب کچھ کیا گیا۔ ہمیں پارٹی اور اس کے کارکنوں کی مجرمانہ سرگرمیوں اور حرکتوں کی سختی سے مذمت کرنی چاہیے۔ اگر کوئی اقدام ان کی حکومت کے ذریعہ کیا گیا تو بھی ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے کیونکہ حکومت پر ایک خاص گروہ کا تسلط تھا۔ در اصل وہ قانون کی بالادستی کا زمانہ ہی نہ تھا، بلکہ خدائی فوجداروں کی حکمرانی تھی۔ چنانچہ ہمیں تمام انسانی معاملات کی طرح اس صورتِ حال میں بھی مختلف چیزوں میں امتیاز روا رکھنا ہو گا۔ جہاں جہاں خدائی فوجداروں نے اپنے مقاصد اور طرز عمل سے حصول انصاف میں رکاوٹ ڈالی ہے وہیں ہمیں گرفت کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر قانون کی خلاف ورزی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص کی بیوی سے عشق تھا' چنانچہ اس نے شوہر کو قتل کرا دیا' اور وہ اس طرح کہ اُس نے خدائی فوجداروں کو یہ غلط رپورٹ بھجوائی کہ شخص مذکور مشتبہ ہے اور اس نے پانچ دن کے اندر اپنے کھوئے ہوئے شناختی کارڈ کی رپورٹ نہیں کی۔ اس مجرمانہ حرکت کی بنا پر یہ شخص قاتل ہے۔ اُس ضابطۂ فوجداری کے تحت بھی جو اُس زمانے میں نافذ العمل تھا اور منسوخ نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کے قتل کا مرتکب ہوا جو اس کے ناپاک عزائم کی راہ

میں حائل تھا اور اُس نے اپنے قاتلانہ عزم کو پُورا کرنے کے لئے عدالت کا سہارا لیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عدالتیں محض حکومت کا آلہ کار تھیں۔ اور سرکار کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اسی طرح کے اور معاملات بھی ہیں۔ ان میں بعض مسائل زیادہ واضح نہیں ہیں اور بعض بالکل واضح ہیں۔ مثلاً یہ بات بڑی پریشان کن ہے کہ بعض لوگوں نے وطیرہ بنا رکھا تھا کہ جو بات بھی انھیں مشکوک اور مشتبہ محسوس ہوئی فوراً اس کی رپورٹ کر دیتے۔ بعض اس وجہ سے ایسا کرتے کہ انھیں برسرِ اقتدار طبقے کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور خود ان پر جو الزامات آ سکتے تھے اُن پر پردہ پڑ جائے، بعض محض کارگزاری دکھانے کی خاطر رپورٹیں کیا کرتے تھے۔ میرے خیال میں ایسے معاملات سے نمٹنا بڑی الجھن کا کام ہے۔ اور میں ان کے بارے میں کوئی سفارش نہیں کرتا بلکہ ان اُلجھے ہوئے معاملات کو چھوڑ کر ہمیں اُن معاملوں پر ضرور توجہ دینی چاہیے جو واضح ہیں، اور وہ بھی جیسا میں اوپر کی مثال میں بتا چکا اتنے سنگین ہیں کہ ہم انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

چوتھا ممبر

"میں اس معاملے میں اپنے ساتھی سے متفق ہوں کہ ہمیں انتہا پسندی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ لیکن ہمیں جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے ان پر کچھ زیادہ ہی توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ یہ تجویز کہ ہم معزول حکومت کے اقدامات میں کچھ چھوڑ دیں اور کچھ پر کارروائی کریں، نہایت قابلِ اعتراض بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کیا گیا تو یہ خدائی فوجداروں کے نظریے کے عین مطابق ہوگا۔ اگر ہمارا یہ نظریہ ہو کہ ہمیں یہ قانون پسند ہے اس لئے اسے نافذ سمجھا جائے، ہمیں یہ فیصلہ مرغوب ہے اس لئے اسے قائم رکھا جائے، ہمیں یہ قانون پسند نہیں اس لئے اسے قانون کہنا ہی غلط ہے۔ یہ سرکاری اقدام ہماری مرضی کا نہیں اس لئے کالعدم قرار دیا جائے ——— تو پھر اس کا مطلب یہی ہوگا کہ خدائی فوجداروں کے قوانین

اور اقدامات کے بارے میں ہمارا وہی رویہ ہے جو انھوں نے اپنے سے پہلے والی حکومت کے قوانین اور اقدامات کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ اس صورت میں شدید بحران پیدا ہو جائے گا اور ہر جج اور وکیل خود ہی قانون ساز بن جائیگا۔ میرے ساتھی نے جو تجویز پیش کی ہے اس میں عمل کرنے سے سابقہ برائیاں ختم تو کیا ہوں گی اور بھی مستحکم ہو جائیں گی۔ اس مسئلے سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے جو ہمارے نظریۂ قانون اور نظریۂ حکومت سے مطابقت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ باقاعدہ قانون نافذ کر کے اس کے تحت اس مسئلے سے نمٹا جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس سلسلے میں ایک خصوصی قانون مرتب اور منظور کیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ بدنہاد مخبروں کے سارے مسئلے کو نظر میں رکھیں، تمام ضروری حقائق جمع کریں، اور اس کے بارے میں ایک جامع قانون بنا دیں۔ اس طرح ہمیں ان پرانے قوانین کی غلط تاویل نہیں کرنی ہو گی جو ان مقاصد کے لئے جو ہمارے سامنے ہیں، نہیں بنائے گئے تھے۔ اور اسی طرح ہم مجرموں کو ان کی حرکات اور ان کے جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا دے سکیں گے اور یہ نہیں ہو گا کہ ہر مخبر کو محض اس بنا پر قاتل قرار دے دیا جائے کہ اُس نے جس کے خلاف رپورٹ کی تھی اُسے بالآخر پھانسی مل گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ایسا جامع قانون مرتب کرنے میں اور اس کا مسودہ تیار کرنے میں بعض مشکلات پیش آئیں گی۔ اور باتوں کے علاوہ ہمیں یہ متعین کرنا ہو گا کہ بدطینت یا بدنہاد "مخبر" کی اصطلاح کا مفہوم و مطلب کیا لیا جائے اور یہ آسان کام نہیں، لیکن ان دشواریوں کے خوف سے ہمیں اس راستے سے نہیں ہٹنا چاہیے، کیونکہ اسی طرح ہم لاقانونیت اور ذاتی حکمرانی کے دائرے سے نکل سکتے ہیں۔"

پانچواں ممبر "میرا خیال ہے کہ اس آخری تجویز میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں بڑا طنز پایا جاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ خدائی فوجداروں کے دور کی برائیاں اور لعنتیں ختم ہونی چاہئیں۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی رکھی گئی ہے کہ اس کے لئے فوجداری کا ایک ایسا قانون بنا دیا جائے جو زمانۂ سابق سے نافذ العمل تصور کیا جائے، اور پرانے افعال پر نئے قانون کے تحت انھیں جرم قرار دے کر سزائیں دی جائیں، حالانکہ خدائی فوجداروں کا یہی طریق کار سب سے زیادہ شرمناک اور نفرت انگیز تھا۔ میرے دوست کو خطرہ ہے کہ اگر دورِ رفتہ کے 'غلط' اقدامات کو ختم کرنے اور 'صحیح' اقدامات کو برقرار رکھنے کے لئے کسی تحریری قانون کے سہارے کے بغیر کوشش کی گئی تو الجھن اور بحران کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن میرے دوست کو یہ احساس نہیں ہے کہ ان کے تجویز کردہ قانون سے غیر یقینی کیفیت دور کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ محض باتوں سے بات نہیں بنتی، ہم سب چاہتے ہیں کہ ساری چیزیں تحریری شکل میں موجود ہوں۔ لیکن اس قسم کے قانون سے ہوگا کیا؟ میرے ایک ساتھی نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا ہے جو پانچ دن کے اندر شناختی کارڈ کھو جانے کی رپورٹ نہ کرنے پر موت کی سزا پا گیا۔ میرے ساتھی کا خیال ہے کہ عدالت سے جو سزا دی گئی ہے وہ جرم کی نوعیت کے لحاظ سے قانون کے دائرے سے نکل جانے کی حد تک زیادہ تھی۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں خدائی فوجداروں کے خلاف خفیہ تحریکیں نہایت شدت سے جاری تھیں اور لوگوں نے جعلی شناختی کارڈ بنا رکھے تھے، یہ صورتِ حال حکمرانوں کے لئے نہایت پریشان کن تھی اور خود ان کے نقطۂ نظر سے یہ بڑا سنگین مسئلہ تھا ـــــ (ہم اگر یہ نہ کہنا چاہتے ہوں کہ انھیں اس مسئلے کو، جو ہماری دلی تمنا تھی

حل کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی) تو ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اُن حالات میں یہ سزا کچھ زیادہ ہی سخت تھی۔ اگر میرے دوست کی تجویز کے مطابق قانون بنا یا جائے تو اس میں اس معاملے کو کیسے سلجھایا جائے گا۔ اس کے ساتھ اور بہت سے متعلقہ اور منسلکہ مسائل ہیں جو تصفیہ طلب رہیں گے۔ کیا میرے دوست اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ خدائی فوجداروں کی حکومت کو بھی بہر حال نظم و نسق چلانے اور کسی نہ کسی قانون کے تحت امن و امان برقرار رکھنے کی ضرورت در پیش تھی؟ میں اُن مشکلات کا اور زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں کروں گا جو مجوزہ قانون بنانے میں پیش آئیں گی۔ کیونکہ فہم و فراست سے کام لینے والا ہر شخص اُن کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ میرے نزدیک اِس مسئلے کا حل کیا ہے۔ یہ نظریہ کافی مستند مانا گیا ہے کہ قانون فوجداری کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان میں انتقام لینے کی جو جبلّت پائی جاتی ہے اس کی تسکین کا مناسب راستہ نکالا جائے۔ بعض مواقع اور مراحل ایسے بھی آتے ہیں جب اس انسانی جبلّت کو براہ راست اظہار کا موقع ملنا چاہیے، اور کسی قانون کو راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں خدائی فوجداروں کا دَور کچھ ایسا ہی دَور تھا۔ بدباطن مخبروں کا معاملہ بھی رفتہ رفتہ سلجھتا جا رہا ہے۔ آئے دن اخباروں میں ہم یہ خبر پڑھتے ہیں کہ خدائی فوجداروں کی حکومت کے ایک سابق "چمچے" کو لوگوں نے کسی سنسان جگہ پر پکڑ لیا، اُس کی پٹائی کر دی یا کام تمام کر دیا۔ عوام خود اپنے طریقوں سے نہایت خاموشی سے یہ معاملہ حل کرتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم انھیں تنہا چھوڑ دیں اور سرکاری وکیلوں کو ایسی ہی ہدایات جاری کر دیں کہ وہ ایسے معاملات کو عدالت میں نہ لے جائیں تو عنقریب یہ

مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا اور کوئی مسئلہ باقی نہ رہے گا۔ ظاہر ہے کچھ دنوں تک تھوڑی سی بدنظمی پھیلی رہے گی، اور یہ بھی سچ ہے کہ کچھ بے گناہوں کے سر بھی پھوٹیں گے۔ لیکن حکومت، ہماری حکومت اور ہمارا نظامِ قانون اس معاملے میں تو ملوث نہ ہوگا اور ہم اس اُلجھن سے نجات پا جائیں گے کہ خدائی فوجداروں کی حکومت کے تمام اعمال اور بداعمالیوں کے پیدا کردہ مناقشات کا تصفیہ کیونکر کریں؟"

اب آپ بتائیے کہ وزیرِ انصاف کی حیثیت سے آپ اپنے قانونی مشیروں کی ان سفارشات میں سے کس کی سفارش پر عمل کریں گے؟

سرگزشت تاریخ

از

امتیاز محمد خاں

تاریخ کے ارتقا کی یہ آپ بیتی اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ اس کتاب میں تاریخ کو شخصیت کا جامعہ پہنا کر فاضل مصنف نے تاریخ ہی کی زبانی اس کی تاریخ بیان کی ہے۔ در اصل فلسفۂ تاریخ اور تاریخ دونوں کو مختصر اور عام فہم زبان میں سمو دیا گیا ہے۔

پہلے باب میں فلسفۂ تاریخ کا خلاصہ ہے۔ دوسرے میں تاریخ خود اپنی ابتدا بیان کرتی ہے کہ وہ کس طرح قلب انسانی سے نمودار ہوئی اور پھر کس طرح مورخوں نے اُسے مسخ کر دیا۔ تیسرے باب میں فلسفۂ تاریخ کے وجود پر بحث کرتی ہے۔

تاریخ کی دیوی اسلامی عہد کا بھی جائزہ لیتی ہے ابن خلدون کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ اور تاریخ عالم کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ امتیاز محمد خاں صاحب کی یہ کوشش ہمارے تاریخی ادب میں یادگار رہے گی۔

سائز $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ صفحات چھ سو قیمت مجلد بیس روپے

اردو اکیڈمی سندھ کراچی